ماہنامہ

حکایت

لاہور

اگست 2014ء

ماہنامہ حکایت لاہور

سالانہ چندہ

رجسٹرڈ ائیر میل

پاکستان 800 روپے

1 7000 روپے

سعودی عرب، کویت، اُردن، ایران، سری لنکا، ابوظہبی، بحرین، دوبئی، مسقط، قطر، شارجہ، بھارت، سوڈان، یوگنڈا، کینیا، نائیجیریا اور دیگر افریقی ممالک، مشرقی اور مغربی جرمنی، ڈنمارک، انگلینڈ، ناروے، سویڈن، فرانس، ملائشیا، سوئٹزرلنڈ، سنگاپور، ہانگ کانگ، آسٹریا، برونائی

2 7000 روپے

آسٹریلیا، کینیڈا، فجی، نیوزی لینڈ، بہاماز، وینزویلا، یونان، امریکہ، نورو، برازیل، چلی، کولمبیا، کیوبا، ارجنٹائن، جمیکا، میکسیکو، گریناڈا

- غیر ممالک سے رقوم بھجوانے کے لئے "وقاص شاہد" کے نام کا ڈرافٹ بنوائیں۔
- پاکستان کے علاوہ دوسرے ممالک وی پی نہیں جاتی، رقم پہلے بھجوانی ضروری ہے۔
- کتابوں پر ڈاک خرچ خریدار حضرات کے ذمہ ہوگا۔
- خط و کتابت اور بدل اشتراک روانہ کرتے وقت خریداری حوالہ نمبر لکھنا ضروری ہے۔

نوٹ: تبدیلیٔ پتہ کی اطلاع مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے دیجئے۔

26- پٹیالہ گراؤنڈ، لنک میکلوڈ روڈ، لاہور- فون: 042-37356541

نورِ مبین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کچھ شک نہیں تمہارا پروردگار اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا پھر عرش پر جا ٹھہرا۔ وہی رات کو دن کا لباس پہناتا ہے کہ وہ اس کے پیچھے دوڑتا چلا آتا ہے اور اسی نے سورج اور چاند ستاروں کو پیدا کیا۔ سب اس کے حکم کے مطابق کام میں لگے ہوئے ہیں۔ دیکھو! سب مخلوق بھی اسی کی ہے اور حکم بھی (اسی کا ہے) یہ اللہ رب العالمین بڑی برکت والا ہے۔

(سورۃ الاعراف: آیت 54)

ماہنامہ
حکایت
لاہور

جلد: 43 | اگست 2014ء | شمارہ: 12

بانی
عنایت اللہ
شاہد بن عنایت اللہ

مدیر اعلیٰ: صالحہ شاہد
مدیر: عارف محمود
منتظم: سعد شاہد

قانونی مشیر
وقاص شاہد ایڈووکیٹ

شعبہ تعلقات عامہ
میاں محمد ابراہیم طاہر

سرکولیشن منیجر: فضل رزاق، عرفان جاوید
شعبہ اشتہارات: خرم اقبال، محمد اشفاق مومن

کمپوزنگ
مجید پرائم کمپیوٹرز - لاہور

مدیر: عارف محمود 0323-4329344
وقاص شاہد 0321-4616461
سرکولیشن نمبر: فضل رزاق 0343-4300564
عرفان جاوید 0322-4847677

مجلس مشاورت
ابدال بیلا
عظمت فاروق
میم الف
ڈاکٹر شبیر حسین
ڈاکٹر نصیر اے شیخ
ڈاکٹر نغمہ علی
ڈاکٹر رانا محمد اقبال

قیمت -/80 روپے

ہیڈ آفس
26- پٹیالہ گراؤنڈ لنک میکلوڈ روڈ لاہور 042-37356541

مضامین اور تحریریں ای میل کیجئے:
Monthly_hikayat@gmail.com
primecomputer.biz@gmail.com

اس شمارے میں

خصوصی فیچر

لہولہو امت مسلمہ — ساقی چیمہ — 15

جگ بیتی

داستان ایک عامل کی — قسط:5 — محمد افضل رحمانی — 25

جرم و سزا

ڈاکو اور ڈپٹی کمشنر — عاشق حسین — 43

ڈکیتی کے بعد — دستگیر شہزاد — 65

رنگا ڈاکو — محمد رضوان قیوم — 161

سلسلہ وار ناول

درِ زنداں — قسط:6 — رزاق شاہد کوہلر — 49

دھوپ کے پگھلنے تک — قسط:8 — امجد جاوید — 209

دلچسپ و عجیب

اِدھر اُدھر سے — رانا محمد شاہد — 61

علم و تحقیق

باعثِ ذلت — سکندر خان بلوچ — 70

دینی اور تاریخی مغالطے — مجاہد ادیب شیخ — 81

لمحۂ فکریہ

وردی کا تقدس — ڈاکٹر مبشر حسن ملک — 75

معاشرت اور قانون

مجھے طلاق چاہئے — ایس امتیاز احمد — 91

ناقابل فراموش

جنات کا دربار — ٹی آئی ساگر — 97

اس شمارے میں

شخصیات

خوش تر اوصاف شخصیت | محمد رفیع ہاشمی | 109

چار دیواری کی دنیا

کچے دھاگے | حفیظ بشر | 113

جب بیٹی ماں کی بہو بنی | محمد نذیر ملک | 123

تلخیص

انتقام قسط:6 | میاں محمد ابراہیم طاہر | 129

انتخاب

صدیوں کی سیل | شفاعت احمد | 149

ایک تلخ ایک کہانی

تریاق | رمی شاہد | 159

جنگلہ | وقار احمد ملک | 183

طب و صحت

دستِ شفاء | ڈاکٹر رانا محمد اقبال | 174

عجیب و غریب جرائم

دیتے ہیں دھوکا یہ | صبیب اشرف صبوحی | 177

کچھ یادیں کچھ باتیں

انوکھا طریقۂ ثواب | بشیر احمد بھٹی | 189

ایک حقیقت ایک افسانہ

روپ بہروپ | مظفر حسن ملک | 193

مسئلہ کشمیر

بھارتی وزیر اعظم کا دورہ...... | گلزار اختر کاشمیری | 203

کیا ہم جشن منانے کے حق دار ہیں؟

اگست شہیدوں کا مہینہ ہے۔ ان شہیدوں کا جنہوں نے اپنی جان، اپنی عصمت، اپنے مال اور معصوم بچوں کی قربانی دے کر پاکستان حاصل کیا تھا۔ دنیا کی تاریخ میں کسی قوم نے آزادی کے لئے اتنی بڑی قربانی نہیں دی۔ ہے کوئی مثال؟

کیا آپ کو وہ شہید یاد ہیں؟

وہ ہزاروں بیٹیاں یاد ہیں جنہیں ہندو سکھ اٹھا لے گئے؟

وہ معصوم بچے یاد ہیں جنہیں نیزوں میں پرو دیا گیا؟

وہ باپ اور بھائی یاد ہیں جن کی بیٹیوں اور بہنوں کی عصمت دری کی گئی؟

آپ خاموش کیوں ہیں؟ یہ خاموشی مجرمانہ ہے۔

نوجوان کہیں گے 66 برس پرانی باتیں کیسے یاد رہ سکتی ہیں؟ 66 برس پہلے جو کچھ ہوا، اب اس کا ماتم کرنا چھوڑو۔ دنیا بدل گئی ہے، اب تو بھارت ہمارے ساتھ امن کی آشا اور پیار کی بھاشا کی بات کر رہا ہے۔

بے شک دنیا بہت بدل گئی ہے۔ دنیا کا نقشہ بدل گیا، رہن سہن بدل گیا، ہر چیز بدل گئی مگر ایک چیز نہیں بدلی..... وہ ہے ہندو کی ذہنیت، مسلم دشمنی۔ ہندو کبھی مسلمان کا دوست نہیں بن سکتا۔ ہندو اور زہریلا سانپ ایک ہی خصلت رکھتے ہیں۔ سانپ کو جتنا مرضی دودھ پلاؤ، وہ موقع ملتے ہی ڈس لے گا۔ یہی حال ہندو کا ہے۔

اگر آپ بھول گئے ہیں تو میں یاد دلا دیتا ہوں کہ یہ وہی ہندو ہے جس نے 65ء میں پاکستان کو نیست و نابود کرنے کے لئے اپنی ہیبت ناک جنگی قوت سے حملہ کیا تھا۔ یہ وہی ہندو ہے جس نے 65ء کی ہزیمت کا بدلہ لینے کے لئے 71ء میں آدھا پاکستان کاٹ کر وہاں مسلمانوں کی قتل و غارت مسلمانوں کے ہاتھوں کرائی اور خود بھی پاکستانیوں کے خون سے کھل کر ہولی کھیلی۔ یہ وہی ہندو ہے جو کشمیر پر غاصبانہ قبضہ کئے بیٹھا ہے۔ یہ وہی ہندو ہے جس نے اعلان کیا کہ پاکستان کا پانی روک کر اسے صحرا بنا دیں گے تاکہ اس کا بچہ بچہ بھوکا پیاسا مر جائے۔ یہ وہی ہندو ہے جو بھارت میں موجود مسلمانوں کے خون سے آئے دن ہولی کھیلتا رہتا ہے۔ یہ وہی ہندو ہے جس نے حال ہی میں اپنی ہندو جنونی

حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ اذان پر پابندی لگائی جائے۔

ہندو اپنی کلچر فلموں اور ڈراموں کی وجہ سے نوجوان نسل کو بڑا خوبصورت نظر آتا ہے۔ یاد رکھیں! سانپ بھی بڑا خوبصورت اور رنگین ہوتا ہے۔ دونوں یکساں زہریلے ہوتے ہیں۔ یہ زہر بڑے ہی حسین اور عریاں جسموں کے ذریعے ہمارے نوجوانوں کے ذہنوں میں انڈیل کر ان کی کردار کشی کی جارہی ہے۔ ہمارے نوجوانوں پر ہندو کا طلسم طاری ہے اور اسی طلسم کے زیر اثر وہ پاکستان دشمنی پر مبنی فلمیں اور ڈرامے شوق سے قبول کررہے ہیں۔

اس میں سارا قصور نئی نسل کا ہی نہیں، بزرگوں کا بھی ہے، جنہوں نے اپنے بچوں کو بتایا ہی نہیں کہ پاکستان کے قیام کا مقصد کیا تھا اور پاکستان حاصل کرنے کے لئے کتنی بڑی قربانیاں دی گئی تھیں۔

جو پہلے کبھی باوقار "یوم آزادی" ہوا کرتا تھا، اس کو "جشنِ آزادی" کا نام دے کر فضول ہلڑ بازی اور ناچ گانے کے پروگراموں کی نذر کر دیا گیا ہے۔ کیا ہم جشن منانے کا حق رکھتے ہیں؟

کیا ہم نے قیام پاکستان کے مقاصد حاصل کر لئے ہیں؟

کیا ہم دنیا میں ایک باوقار قوم کی حیثیت سے زندہ ہیں؟

کیا ہم نے ماضی کی غلطیوں و کوتاہیوں کا ازالہ کر دیا ہے؟

کیا ملک میں خوشحالی کا دور دورہ ہے اور غربت ختم ہو گئی ہے؟

کیا ہم نے آدھا ملک گنوا کر کوئی سبق سیکھا؟

کیا ہم نے غیر ملکی قرضوں سے نجات حاصل کر لی؟

کیا عوام کو پینے کا صاف پانی ملنے لگا ہے؟

کیا لوڈ شیڈنگ پر قابو پا لیا گیا ہے؟

کیا پیٹرول، بجلی، گیس اور پانی ارزاں نرخوں پر ملنے لگے ہیں؟

کیا دہشت گردی اور بھتہ مافیا پر قابو پالیا گیا ہے؟

کیا مظلوموں کو انصاف ملنے لگا ہے؟

......اور کیا واقعی ہم آزاد ہیں؟

یقیناً جواب نفی میں ہوگا۔ تو پھر ہم کس بات کا جشن منائیں؟ دراصل ہم کھیل تماشوں کی عادی قوم ہیں۔ ہر حکمران نے قوم کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اسے کھیل تماشوں میں الجھائے رکھا اور خود اوپر بیٹھ کر تماشا دیکھتے رہے۔ اب حکومت نے اعلان کیا ہے کہ اسلام آباد میں پورے ایک ماہ تک جشنِ آزادی منایا جائے گا۔ اس بات سے قطع نظر کہ اس اعلان کے پس پردہ کیا مقاصد ہیں؟ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ 30 دن کی تقریبات میں ملک وقوم کا کتنا سرمایہ اور وقت برباد ہوگا۔ کسی نے سوچا؟ حکمرانوں کو اس کی کوئی پروا نہیں کیونکہ وہ یہ سرمایہ عوام کی ہڈیوں سے نچوڑ کر نکلوالے گی۔

یہ صرف جشن ہی ہوتا ہے، اس میں جذبہ بالکل نہیں ہوتا۔ جذبے سے خالی جشن، لوگ گھروں کی چھتوں پر، گاڑیوں پر، موٹر سائیکلوں پر، سائیکلوں پر، ریڑھیوں پر، گدھا گاڑیوں پر، دُکانوں پر جھنڈے لہرائیں گے۔ ہر طرف سبز ہلالی پرچموں کی بہار آ جائے گی۔ رات کو بڑی سڑکوں پر، پارکوں میں، مینار پاکستان کے سائے تلے لوگوں کا ہجوم ہوگا۔ مادر پدر آزاد نوجوان موٹر سائیکلوں کے سائلنسر نکال کر کانوں کے پردے پھاڑ دینے والی آواز کے ساتھ بھگائیں گے، ون ویلنگ کریں گے، قوم کی بیٹیوں کے دوپٹے کھینچیں گے اور بے ہودہ فقرے کسیں گے۔ انڈین گانوں پر بھنگڑے ڈالیں گے اور ان سارے کاموں میں ماڈرن لڑکیاں بھی پیچھے نہیں رہیں گی۔ خود ہی اندازہ کرلیں کہ اس قسم کے جشن کے پیچھے کس قسم کے جذبات کارفرما ہوں گے؟

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ گزشتہ برس 14 اگست کے "جشن" کے بعد جب میں اگلے دن دفتر جانے کے لئے نکلا تو سڑکوں پر جگہ جگہ کاغذ کی بنی ہوئی پاکستان کے پرچم والی جھنڈیاں اور جھنڈے بکھرے پڑے تھے جنہیں خاکروب جھاڑو سے اکٹھا کر رہا تھا۔ یہ گندگی کے ڈھیر میں پھینکی جاتی تھیں۔ یہ سب دیکھ کر دل خون کے آنسو رو دیا۔ غیرت مند قومیں اپنے پرچم کی حرمت کے لئے کٹ مرتی ہیں اور یہاں ہم اپنے پرچم کو پیروں تلے روندرہے ہیں۔

میں اسی سوچ میں گم تھا کہ کاغذ کا ایک جھنڈا ہوا کے ساتھ اڑتا ہوا میرے قدموں میں سے آ ٹکرایا۔ میں نے تڑپ کر اسے اٹھا کر گرد صاف کی اور بے اختیار سینے سے لگا لیا۔ عجیب جذباتی کیفیت ہوگئی۔ تحریک پاکستان کے شہداء یاد آ گئے، مہاجروں کے لٹے پٹے قافلے یاد آ گئے جو جگہ جگہ لہو بہاتے آئے تھے، لاشوں سے بھری خون ٹپکاتی ٹرینیں یاد آ گئیں، کرپانوں سے کٹے ہوئے نوزائیدہ بچے نظروں کے سامنے گھومنے لگے، عفت مآب بچیوں کی چیخیں کانوں میں گونجنے لگیں، ان کی عصمت کا خون ہر سو بکھر گیا، ہر طرف آگ و خون کا دریا، چیخ و پکار، جے بجرنگ بلی، ہر ہر مہادیو، جے کالی کی اور ست سری اکال جو بولے سو نہال کے نعرے گونجنے لگے۔ میرا سارا وجود زلزلوں کی زد میں آ کر کانپنے لگا۔ یوں لگا جیسے اس کاغذ کے جھنڈے سے خون ٹپک رہا ہے۔ جھنڈا فریاد کناں ہے کہ میں تو تمہاری عزت، غیرت اور وقار کی علامت ہوں۔ میری حرمت کو یوں پامال تو نہ کرو...... یاد کرو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علمبردار کو جن کا بازو کٹ گیا تو پرچم گرنے نہیں دیا، بائیں ہاتھ میں تھام لیا۔ دشمن نے پرچم گرانے کے لئے بایاں ہاتھ بھی کاٹ دیا تو بھی پرچم اپنے کٹے ہوئے بازوؤں میں سنبھال لیا گرنے نہ دیا حتیٰ کہ ایک اور مجاہد نے آ کر پرچم تھام لیا۔ یہ سچے اور کھرے جذبے کا کمال تھا کہ اسلام کا پرچم آدھی سے زیادہ دنیا پر چھا گیا۔

یاد رکھو! یہ سبز ہلالی پرچم محض کپڑے کا یا کاغذ کا ایک ٹکڑا نہیں یہ تمہاری عزت، غیرت اور ملکی و قومی وقار کی علامت ہے۔ اگر تم اس کی عزت نہیں کرو گے، اس کی حرمت کا خیال نہیں رکھو گے تو دنیا میں تم بھی بے عزت اور بے توقیر ہو جاؤ گے۔ پرچم بلند رکھو!

عارف محمود

محبوب عالم، صابر حسین راجپوت اور میم الف کی شہرۂ آفاق کتب

کار، شلوار اور دوپٹہ ۔/
ایک پاکستانی سب انسپکٹر پولیس کی جیران کن سراغرسانی کی روئیداد (احمد یار خان)

بال ایک چڑیل کے ۔/
جرم اور سراغرسانی کی حیران کن روئیداد (احمد یار خان)

موت کے رشتے اور مقتول کی بدروح ۔/
جرم اور سراغرسانی کی دلچسپ اور سچی کہانیاں (احمد یار خان)

جب مجھے اغوا کیا گیا ۔/
جرم اور سراغرسانی کی سچی کہانیاں (احمد یار خان)

ایک رات کی شادی ۔/
جرم اور سراغرسانی کی پانچ سچی کہانیاں (احمد یار خان)

لاش، لڑکی اور گف کے گنہگار ۔/
جرم اور سراغرسانی کی ایک لڑکی اور سچی کہانی (احمد یار خان)

دام میں صیاد آگیا ۔/
جرم اور سراغرسانی کی سچی کہانیاں (احمد یار خان)

واردات اُس رات کی۔
جرم اور سراغرسانی کی ایک لرزہ خیز واردات (احمد یار خان)

قاضی کی کوٹھڑی اور کنواری بیٹی۔
جرم اور سراغرسانی کی سچی کہانیاں (احمد یار خان)

جب بہن کی چوڑیاں ٹوٹیں۔
جنس کے تعصب انسان کے جذبات کو سرد کر دیتے ہیں تو انسان جانور بن جاتا ہے (احمد یار خان)

آشرم سے اُس بازار تک ۔/
تفتیش اور سراغرسانی کی پانچ حقیقی کہانیاں (احمد یار خان)

لائن پر لاش۔
جرم کی چار حقیقی، جذباتی اور سنسنی خیز کہانیاں (محبوب عالم)

رتن کمار کی روپا ۔/
جرم، سزا اور سراغرسانی کی حقیقی، جذباتی، پانچ سنسنی خیز کہانیاں (احمد یار خان)

جائیداد کا وارث ۔/
جرم، سزا اور سراغرسانی کی دلچسپ سچی کہانیاں (احمد یار خان)

بھیڑیا، بدروح اور بیوی ۔/
انسانوں اور کتوں کے شکار کی سچی اور سنسنی خیز کہانیاں (صابر حسین راجپوت)

لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ ۔/
شکاریات کے موضوع پر آٹھ ہنگامہ خیز سچی کہانیاں (صابر حسین راجپوت)

قبر کا بھید ۔/
شکار کے موضوع پر سات ایسی کہانیاں جو آپ کے جذبات میں زلزلے بپا کر دیں گی (صابر حسین راجپوت)

ایک لڑکی دو منگیتر ۔/
جذبات میں زلزلے بپا کر دینے والی محبت اور رقابت کی ہنگامہ خیز سچی کہانیاں (صابر حسین راجپوت)

سانپ، سادھو اور نوجے کی کہانی۔
معاشرت کی ہولناک، سچی کہانیاں (صابر حسین راجپوت)

مایوسی کیوں؟ ۔/
نفسیاتی، جسمانی اور روحانی توانائی ضائع نہیں ہوتی (ایم۔ اے)

مقناطیسی شخصیت (مکمل سیٹ) ۔/
نفسیاتی، جسمانی توانائی اور مقناطیسی قوت کا سرچشمہ (ایم۔ اے)

داستان ایک داماد کی ۔/
جرم، سزا کی پانچ سچی کہانیاں (احمد یار خان)

مقناطیسی شخصیت (مکمل سیٹ) ۔/
نفسیاتی، جسمانی توانائی اور مقناطیسی قوت کا سرچشمہ (ایم۔ اے)

لائن پر لاش ۔/
جرم کی چار حقیقی، جذباتی اور سنسنی خیز کہانیاں (محبوب عالم)

پیار کا پانی ۔/
جرم، سزا اور سراغرسانی کی چار سچی کہانیاں (محبوب عالم)

چادر اور چوڑیاں ۔/
جرم، سزا اور سراغرسانی کی چار سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ (محبوب عالم)

حوالات میں طلاق ۔/
جرم، سراغرسانی اور جذبات کو ہلا دینے والی دلچسپ سچی کہانیاں (محبوب عالم)

بن بیاہی ماں ۔/
جرم، سراغرسانی کی سچی کہانیاں (محبوب عالم)

1857ء کی داستانِ خونچکاں
جنگ آزادی کی دردناک قتل و غارت اور شکست کی چند کہانیاں (محبوب عالم)

پیار کا پل صراط ۔/
جرم اور سراغرسانی کی پانچ سچی اور سنسنی خیز کہانیاں (احمد یار خان)

جنات کے دربار میں۔
جرم اور سراغرسانی کی چار سچی کہانیاں (احمد یار خان)

دلیر یا بیوقوف ۔/
جرم، سزا اور سراغرسانی کی سچی کہانیاں (احمد یار خان)

دوسری بیوی ۔/
جرم، سزا اور سراغرسانی کی چار سچی کہانیاں (احمد یار خان)

خود فریبی سے گریز کریں!

ہمارے پڑھے لکھے لوگ دانشور اور وہ جو خود کو عقل کل کہتے ہیں، کیوں اس بات پر غور نہیں کرتے کہ کیوں پاکستان افغانستان، یمن، شام، لیبیا، عراق، مصر، تیونس، سوڈان، صومالیہ، نائیجیریا وغیرہ مسلم ممالک کے حالات سدھرنے کا نام ہی نہیں لیتے ہیں

ساقی چیمہ ----------Email:saqqicheema07@hotmail.com ----------------☆

جب سے دنیا معرض وجود میں آئی ہے اور حضرت انسان کا قدم یہاں پڑا ہے جنگیں ہو رہی ہیں۔ اس بات سے قطع نظر کہ ادیب اور صحافی، دانشور وغیرہ جنگ بارے کیا کہتے ہیں (یہ لوگ تکنیکی حقائق سے بے خبر محض مبالغہ آرائی افسانہ طرازی کرتے ہیں) جنگی ماہرین کہتے ہیں کہ جنگ ایک پرتشدد خونریزی کا عمل ہے جس کے جواب میں زیادہ تشدد اور خون ریزی ہوتی ہے۔ جنگ کا مقصد دشمن کو اپنی مرضی پر چلانا ہوتا ہے اور جنگ جیتنے کا اہم حربہ دشمن کی سپلائی لائن کاٹنا اور اس عمل (جنگ) کو مسلسل جاری رکھنا ہے۔ پہلے یہ نظریہ مقبول عام تھا کہ ریگولر فوج گوریلوں سے نہیں لڑ سکتی لیکن جدید دور کے اس آزمائے ہوئے نظریے کو پہلے اسرائیلی فوج نے غلط ثابت کیا اور اپنے خلاف لڑنے والے گوریلوں کو شکست دی پھر ابھی حال ہی میں سری لنکا کی فوج نے

سالوں پرانی جنگ میں دہشت گرد گوریلوں کو ختم کر کے یہ نظریہ کافی حد تک غلط ثابت کیا۔

قارئین! پاکستان میں دہشت گرد طالبان دس سال سے زیادہ عرصہ سے لڑ رہے ہیں، اس کے علاوہ سپاہ صحابہ اور لشکر جھنگوی اور بلوچ علیحدگی پسند بھی شامل ہیں۔ کوئی بھی جنگ مسلسل سپلائی اور امداد کے بغیر نہیں لڑی جا سکتی۔ جنگ میں انسانی ایندھن استعمال ہوتا ہے جس کو بھڑکانے کے لئے بارود اور تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان دہشت گردوں کی مدد کون کر رہا ہے اور کیوں کر رہا ہے؟ جو لوگ اس ملک کی سلامتی کے ذمہ دار ہیں اور ریڈیو ٹی وی پہ اپنے ترانے چلواتے ہیں، نصابی کتب میں ہیرو ہیں اور اپنے خفیہ اداروں کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں، کیا وہ اس جدید دنیا میں نہیں رہتے؟ کیا ان کو نہیں پتہ کہ ان کی ناک کے نیچے کیا ہو رہا ہے؟ میں فوج کے خلاف بات نہیں کر رہا، صرف ایک پوائنٹ کی طرف توجہ دلا رہا ہوں کیونکہ مسئلہ یہ ہے کہ جو لوگ مسائل کے ذمہ دار ہیں اُن کے بارے میں بات نہ کریں تو گلی میں چنے بیچنے والے کو ذمہ دار قرار دیں۔ موں خود پاک فوج کا حامی ہوں اور گزشتہ مضامین میں یہ بات واضح کر چکا ہوں۔

سب سے زیادہ بجٹ سب سے زیادہ اختیار اور پالیسی سازی کے عمل میں سب سے بڑا بوٹ کس کا ہے؟ تو پھر اگر گزشتہ دہائی سے زائد میں ایک لاکھ کے قریب سویلین (اس میں سکیورٹی والے ادارے شامل نہیں ہیں) ہلاک ہو چکے ہیں اور اربوں کی پراپرٹی تباہ ہو چکی ہے، اربوں کا سرمایہ ملک سے جا چکا ہے، اربوں روپے کی سرمایہ کاری رُک چکی ہے اور اس کا نقد نتیجہ بدامنی، عدم تحفظ کا احساس، ملک سے لگاؤ میں کمی، مہنگائی، عوام کی مفلوک الحالی، سرمائے کا ملک سے فرار، عوام کی لمبی لائنیں کہ بیرون ملک چلے جائیں، سیاحت کا کاروبار جس سے ملک کو کروڑوں ڈالر ملتے تھے، بند اور تباہ ہے۔ ملک میں فرقہ پرستی اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ جہالت اتنی بلند سطح پر تاریخ میں کبھی کسی ملک میں نہ تھی اور یہ سب گزشتہ 35 سال میں ہوا ہے اور اس کا آغاز ضیائی عہد میں ہوا تھا اور بعد میں اس کے جانشینوں نے یہی پالیسی جاری رکھی اور یہ سوچ کر خطے میں عدم استحکام پیدا کرنے والے عناصر پالتے رہے کہ یہ ہمارے پالتو ہیں، کام آئیں گے اور وہ فالتو ہو کر اپنے کام لگ گئے۔ اس کے باوجود ان لوگوں نے اس کام سے ہاتھ نہ ہٹایا اور جب پانی سر سے گزر گیا تو پھر بھی الٹی سیدھی حرکتیں اور منصوبے بنا رہے ہیں اور اس سارے عمل میں معصوم عوام کا خون پانی کی طرح بہہ رہا ہے، ان کی جائیدادیں ریت کے گھروندوں کی طرح تباہ ہو رہی ہیں۔ تاریخ کے بدترین آمر کے لگائے ہوئے پودے تناور درخت بن کر جھوم رہے ہیں۔ اسی آمر نے اس ملک کی جڑوں میں جو زہر بھرا جو بارودی قلیتے لگائے اُن میں موجودہ کئی سیاست دان بھی شامل ہیں۔

اب شیروانی اور واسکٹ والوں کی بات ہو جائے، میں نے دس دفعہ لکھا ہے کہ یہ لوگ یہ جتھا ملک کا نظام چلانے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ ان کا کردار کس قدر گھٹیا ہو سکتا ہے دنیا کی چھٹی بڑی ایٹمی فوج والے ملک کا حکمران کس قدر بزدل ہو سکتا ہے۔ آپ اندازہ لگائیں اس ملک کی فوج کے ہیڈ کوارٹر جی ایچ کیو پر حملہ ہوا تھا، دہشت گردوں نے وہاں قبضہ کر لیا تھا اور ان میں سے ایک اہم مجرم گرفتار ہوا تھا اس کو پھانسی کی سزا سنائی گئی تھی۔ گزشتہ ہفتے اس کو پھانسی ہونا تھی اور پھر پیغامات ملے کہ اس کو پھانسی دی گئی تو تمہاری خیر نہیں اور تمہارے جتھے کی بھی خیر نہیں اور اب اس دہشت گرد کی پھانسی ملتوی ہو چکی ہے۔

اب آپ کو دو تاریخی افراد کے دو تاریخی فقرے بتاتا ہوں جو ہمارے ریڈیو ٹی وی پریس میں ریکارڈ پڑے

ہیں۔ نمبر ایک مارشل لاء لگنے سے دو دن قبل وزیراعظم بھٹو نے کراچی میں ایک بیان میں جس کرسی پر بیٹھا تھا اس پر مکے مار کر کہا۔ "یہ کرسی بہت مضبوط ہے"۔ دو دن بعد فوج کی تحویل میں تھا۔ نمبر دو اپنا جہاز کریش ہونے سے دو دن پہلے ضیاء الحق نے نشری تقریر میں کہا۔ "میں جانے والا نہیں ہوں"۔ اور دو دن بعد راکھ بن کر ہوا میں اڑ گیا۔

ہر دور میں حکمرانوں نے جس ڈھٹائی سے اس ملک میں کرپشن کو فروغ دیا ہے اس کی مثال کم ہی ملتی ہے۔ قارئین! جس ملک میں ایک جعلی پیر ایک لڑکی سے زیادتی کرے یا پھر جہالت کی انتہا ہے کہ لڑکی اپنا مقصد حاصل کرنے کو اس کے چنگل میں پھنس جائے اور پھر ایک بڑا ٹی وی چینل اس لڑکی اور ملزم کو لے کر تھانے جاتا ہے، وہاں پرچہ درج کراتے ہیں، ملزم نے لڑکی کی ننگی تصاویر بنائی ہوئی ہیں موبائل فون میں وہ بھی مال مقدمہ اور بطور ثبوت پولیس کو دیتے ہیں اور ٹی وی والوں کے جانے کے گھنٹہ بھر بعد متعلقہ اے ایس آئی لڑکی کے بھائی کو فون کرتا ہے کہ یہ تصویریں مارکیٹ میں فروخت ہو جائیں گی ورنہ پچاس ہزار دو۔ وہ بے چارہ پھر ٹی وی والوں کو لے کر آیا اور جب انہوں نے پوچھا تو وہ تھانیدار چپ رہا بڑے تھانیدار نے کہا۔ کیا طوفان آ گیا ہے، آؤ بیٹھ کر بات کر لیتے ہیں۔ میں پھر کہتا ہوں کہ یہ معاشرہ اپنے کردار کے لحاظ سے ذلت کی آخری حد پر پہنچ گیا ہے۔

گزشتہ دنوں ایک پاکستانی اور ایک ایرانی پروفیسر نے جو امریکہ میں رہتے ہیں، تمام جدید وسائل اور طریقوں سے ایک سروے کیا کہ دنیا کے کن ملکوں، معاشروں کے لوگ اعلیٰ ترین انسانی کردار اور بہترین اخلاق اور دوسروں سے بہترین سلوک کرنے والے ہیں جیسا کہ قرآن میں اعلیٰ انسانی کردار کی خوبیاں ہیں تو سنو ناروے، فن لینڈ، آئس لینڈ، سویڈن، بلجیم، ڈنمارک اور لکسمبرگ پہلے دس نمبروں پر تھے حتیٰ کہ امریکہ دسویں نمبر کے بعد تھا، اس کے الٹ سروے میں یہ دیکھا گیا کہ کن ممالک میں معاشروں میں لوگ گھٹیا کردار بداخلاقی اور معاملات میں سب سے بُرے ہیں تو افغانستان، پاکستان، سعودی عرب اور ایران پہلے چار نمبروں پر تھے۔ یہ ہے ہماری اوقات۔ امت مسلمہ کا شور مچانے والو، کتوں اور گدھوں کا گوشت کتے بلی کی انتڑیوں سے نکلی چربی ڈال کر چوری کی گیس سے ہانڈی پکا کر سحر و افطار کرنے والو! اس دنیا میں ہمارا یہ کردار ہے، ہماری یہ حیثیت ہے کہ خود قرآن کے مطابق ہم بدترین ذلیل معاشرہ ہیں۔

اس سے پہلے اس موضوع پر لکھا تھا تو دینی جماعت کے پڑھے لکھے رکن نے کہا کہ کتوں کا گوشت بیچنا، ہال صفا پاؤڈر سے دودھ بنانا، ہلدی میں ملاوٹ کرنا، مرچوں میں اینٹوں کا پاؤڈر ڈالنا، دودھ میں گندا پانی ڈالنا تاکہ گاڑھا ہو جائے، میٹر ریڈر کا رشوت لینا اور بیوہ کا خودکشی کرنا الغرض اس نے تمام جرائم کے متعلق کہا کہ یہ انفرادی جرائم ہیں۔ ان صاحب کی خدمت میں عرض ہے کہ انفرادی جرائم وہ ہوتے ہیں جن میں ایک بندہ ایک ہی بندے کو لوٹتا ہے۔ فون لوٹتا ہے، کار چھینتا ہے، چوری کرتا ہے اور ایسے انفرادی مجرموں سے جیلیں بھری ہیں، جو معاملہ میں نے لکھا ہے وہ سب اجتماعی کردار کی بات ہے۔ بات حکمرانوں کی ہو رہی تھی اور بات یہ کرنی تھی کہ گزشتہ دس سال سے زائد عرصہ میں ایک لاکھ سے زائد پاکستانی دہشت گردوں کے حملوں میں ہلاک ہو چکے ہیں جن میں غالب تعداد عورتوں اور بچوں کی ہے۔ اربوں کی املاک تباہ ہوئی ہیں، ایک ایک حملے میں 150 سے زائد افراد ہلاک ہوتے رہے۔ 200 تک بھی ہوئے اور آج فلسطین میں صرف چھ سات سو افراد ہلاک ہوئے ہیں تو

اس امت مسلمہ کے پیٹ میں بڑا درد اٹھ رہا ہے۔ جلسوں جلوسوں سے عوامی زندگی عذاب کرنے والے اور موسمی کیڑوں کی طرح بلوں سے نکل آنے والی جماعتوں اور ملاؤں کو دکھ ہو رہا ہے۔ گزشتہ 14 سال سے ہم جنونی دہشت گردوں کا نشانہ ہیں امت مسلم اور فلسطینیوں نے کس دن ہمارے لئے ایک گھنٹہ کی بھی ہڑتال کی تھی؟ گزشتہ چودہ برسوں میں مرنے والے ایک لاکھ شہری اور تیس ہزار فوجی کیا اتنے ہی گئے گزرے تھے؟ یہ کیسا معاشرہ ہے، یہ کیسے لوگ ہیں اور یہ کیسے مذہبی رہنما ہیں؟

اس وقت آج چین میں جن لوگوں کو روزہ رکھنے سے منع کیا گیا ہے اس کی خاص وجہ انہوں نے برسوں کے تجربہ سے بتائی ہے کہ پھر یہ لوگ کام نہیں کرتے، کوئی استاد طالب علم، مزدور اور سرکاری ملازم ہو اس سے پوچھو کام کیوں نہیں کر رہے وہ کہتا ہے تھک گیا ہوں، میرا روزہ ہے یعنی روزانہ 8 گھنٹے کام کے اوقات میں وہ دو تین گھنٹے کام کرتے ہیں۔ اس لئے وہاں سرکار نے پابندی لگا دی مگر عام آدمی پر یہ پابندی نہ ہے اور خاص بات یہ ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر جلسے جلوس نکالنے اور توڑ پھوڑ کرنے والوں کی غیرت برف میں لگ گئی ہے۔ کیوں چینی سفارت خانہ کو آگ نہیں لگائی ہے۔ کیوں جلوس نکال کر امن و امان تباہ نہیں کیا ہے؟ ہم کیسی منافق قوم ہیں؟ اور سچ تو یہ ہے کہ چینی سچے ہیں۔ اس ملک میں ہم دیکھتے ہیں کہ روزوں میں کام کے اوقات آدھے رہ جاتے ہیں حتیٰ کہ جو دکان دار صبح نو بجے دکان کھولتا تھا وہ بھی بارہ بجے آتا ہے اور کہتا ہے صبح آنے کا فائدہ نہیں گاہک تو آتے نہیں میرا تو کام آدھا رہ گیا ہے، اس رحمت کے مہینے میں۔ ہاں اس رحمت کے مہینے میں جو ناجائز منافع خوری اور لوٹ مار تاجر طبقہ نے مچائی ہے اس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔

قارئین! اس ملک کا سب سے اہم مسئلہ اس وقت دہشت گردی اور کرپٹ سیاستدان ہیں یہ دونوں ہی ملک کے لئے بہت بڑا خطرہ ہیں اور اس ملک کے عوام کے تمام دکھوں کے ذمہ دار ہیں اور ان کو عوام پر مسلط کرنے والے وہ لوگ ہیں جو بادشاہ گر ہیں اور جو سرمایہ دار امریکہ کے غلام ہیں۔ قارئین! مشرق وسطیٰ میں اس وقت جو ہو رہا ہے اس کی صحیح تصویر دیکھیں تو آپ ہلاکو اور چنگیز خان کو بھول جائیں گے۔ ''داعش'' دہشت گرد خارجی ہر اس انسان بچے بوڑھے جوان عورت کو قتل کر رہے ہیں جو ان کے راستہ میں آتا ہے۔ گزشتہ دنوں موصل میں ملا بغدادی نے حکم دیا کہ سرکاری ملازمین غیر مسلم آبادی کو کھانا پانی کوئی شے فراہم نہ کریں اور ہر جگہ ان لوگوں نے غیر مسلموں کا قتل عام کیا ہے اور خود کو اس نبی کا پیروکار کہتے ہیں جنہوں نے جنگ میں سبز درخت کاٹنا بھی حرام قرار دیا تھا اور جنگ کا یہ اصول خاص طور پر نافذ بھی تھا کہ صرف ہتھیار اٹھانے والوں سے ہی جنگ کی جائے گی، وہ بھی جب تک وہ ہتھیار نہ ڈال دیں۔ یہ لوگ ہتھیار ڈالنے والوں کو بھی قتل کر رہے ہیں اور کل عالم میں اسلام کو بدنام کر رہے ہیں اور ان کا واحد مقصد امریکی ایجنڈے کی تکمیل ہے کہ مشرق وسطیٰ میں تیسرا نیو ورلڈ آرڈر نافذ کر کے اس کی تشکیل نو کی جائے۔ اس وجہ سے دنیا کی کوئی تنظیم اس طرف توجہ نہ دے رہی ہے کہ وہاں غیر مسلموں سے کیا ہو رہا ہے۔

بہرحال آزاد کردستان کا قیام عمل میں آچکا ہے اور اس میں شامی اور عراقی علاقے شامل ہیں، ترکی نے اپنے زیر قبضہ علاقے دینے پر آمادگی ظاہر کر دی ہے اور ایران نے انکار کر دیا ہے۔ اب بہت جلد عراقی اور شامی علاقوں کے بعد شدید جنگ ایرانی علاقے میں شروع ہو جائے گی اور اس جنگ میں ایرانی کردوں کی لاشوں کے ڈھیر لگا کر ان کو اس طرح نہ دبا سکیں گے جس طرح کہ انہوں نے بلوچوں (ایرانی صوبہ سیستان) کے ساتھ کیا اور ان کو ظلم

کی چکی میں پیس کر خاموش کر دیا تھا۔ اب ایرانیوں کے لئے ایک نئی مصیبت تیار کھڑی ہے چونکہ امریکہ خود یہ سب کروا رہا ہے اس لئے اس درد کی دوا کوئی نہ ہے۔ اسرائیل نے آزاد کردستان کو تسلیم کر لیا ہے، آبادی کی اکثریت سنی مسلمان ہے۔

قارئین! میں بار بار یہ بات کہتا ہوں کہ سرمایہ دارانہ نظام دنیا کا ذلیل ترین نظام ہے اور اس نظام، اس سوچ کے حامل افراد نے جنگ کو بھی کاروبار بنا دیا ہے۔ ان کے اسلحہ ساز کارخانے کمپنیوں کا اسلحہ بناتے ہیں جو یہ جنگ میں مصروف یا متوقع جنگ کے شکار گروہوں اور ممالک کو فروخت کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسا شیطانی چکر ہے کہ اس کو ایک دفعہ شروع کرنے کے بعد اب وہ گھر بیٹھے کہتے ہیں کہ ہم تو صرف اسلحہ بناتے ہیں، آگے خریدار کی مرضی وہ لے یا نہ لے۔ ایک اہم خبر یہ ہے کہ امریکی سی آئی اے کے لوگ داعش کے دہشت گردوں کو اُردن میں خفیہ کیمپوں میں خصوصی تربیت دیتے رہے ہیں اور ڈیڑھ ارب ڈالر کی بات تو ہو چکی ہے اور اس کے بعد مزید ڈالر بھی آئے ہیں جن کی کرامت سے دس لاکھ قبائلی بے گھر بے دردُکھوں کا شکار ہیں۔ ایک ماہ کے آپریشن کے بعد محض ایک سیکنڈ کلاس دہشت گرد پکڑا گیا ہے۔ ویسے آپریشن کا علاقہ مکمل سیل بند ہے اور فوج کے علاوہ دنیا کے کسی فرد کو یہ معلوم نہ تھا کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں دہشت گرد طالبان کا خاتمہ کر رہے ہیں۔

ہمارے پڑھے لکھے لوگ دانشور اور وہ جو خود کو عقل کُل کہتے ہیں، کیوں اس بات پر غور نہیں کرتے کہ کیوں پاکستان افغانستان، یمن، شام، لیبیا، عراق، مصر، تیونس، سوڈان، صومالیہ، نائیجیریا وغیرہ مسلم ممالک کے حالات سدھرنے کا نام ہی نہیں لیتے ہیں جبکہ اسی شکست خوردہ ذلیل سرمایہ دارانہ نظام میں رہتے ہوئے بھی دوسرے

مسلم ممالک ترکی اور ملائیشیا کی ترقی اور امن قابل رشک ہے۔ اسی ذلیل شکست خوردہ سرمایہ دارانہ نظام کے اندر رہ کر ناروے، سویڈن، ڈنمارک، فن لینڈ، آئس لینڈ اور سوئٹزر لینڈ ترقی میں سب سے آگے ہیں۔

محترم قارئین! یہ مضمون شروع کیا تھا کہ مشرق وسطیٰ کا ناسور پھر رسنے لگا اور پھر جلد ہی ایک دفعہ فلسطینی اور اسرائیلی دست وگریباں ہو گئے۔ اس مسئلے ہارے دنیا بھر میں عام مسلمان عموی معلومات رکھتے ہیں 1947ء میں سعودی عرب کے شاہ عزیز فیصل نے اپنی مہر سے برطانوی حکومت کو دستخط کر کے تحریر دی کہ اس کے زیر قبضہ فلسطینی علاقہ اسرائیل کو دینے پر اُسے کوئی اعتراض نہ ہے (دستاویز منظر عام پر ہے)۔ اس کے بعد سب کو پتہ ہے کہ وہاں ایک جنگ شروع ہو گئی اور پھر 50 سال سے زائد عرصہ کے بعد اس میں معاہدہ اوسلو کی شکل میں ایک نیا موڑ آیا جب اسرائیل فلسطینی ریاست کے قیام اور اس کی امداد پر تیار ہو گیا۔ پی ایل او کے صدر یاسر عرفات نے اندازہ کر لیا تھا کہ اس نے جس جنگ میں عمر گنوادی ہے وہ لاحاصل ہے اور اپنی قوم کے لئے مرنے سے قبل کچھ حاصل کر لوں۔

قارئین! اس موقعہ پر فلسطینیوں میں ایک انتہا پسند گروہ پیدا ہو گیا جو کہ امن معاہدے کے خلاف تھا اور اسرائیل نے یاسر عرفات پر زور دینا شروع کر دیا کہ اس گروہ کے خلاف کارروائی کرو جو وہ بوجوہ نہ کر سکا تا کہ آپس میں لڑائی نہ ہو۔ امن کا عمل سست پڑ گیا اور یاسر عرفات اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ فلسطینی اتھارٹی کا انتظام اس کی جماعت نے سنبھال لیا اور پھر جلد ہی انتہا پسند گروہ حماس کے نام سے سامنے آ گیا اور مجوزہ فلسطینی ریاست میں اس گروہ نے یاسر عرفات کی کی جماعت "الفتح" سے مسلح تصادم شروع کر دیے اور اس اقتدار پر قبضہ کرنے کا مطالبہ کیا جو محض ایک بلدیاتی شہر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس تصادم میں معصوم بچے اور راہ گیر زیادہ مرے اور فریقین کا نقصان کم ہوا۔ اس کے بعد انتخابات میں اس شدت پسند گروہ کو بھی اکثریت حاصل ہو گئی۔ قبل ازیں تو یہ خفیہ مقامات سے اسرائیل پر راکٹ فائر کرتے تھے، اقتدار میں غالب حصہ ملنے کے بعد ان لوگوں نے مزاحمت اور جنگ کے اُس راستے کو بھی ترجیح دی جس سے بچ کر جس کو چھوڑ کر یاسر عرفات اس قوم کے لئے اس دنیا میں ایک زمین کا پُرامن ٹکڑا حاصل کر رہا تھا۔ قارئین! فلسطینی واقعی ایک بدقسمت قوم ہے مگر اس میں ان کے کردار کا بھی ہاتھ ہے۔ 1970ء میں ہزاروں فلسطینی شام اور اردن میں امن وسکون سے رہ رہے تھے پھر ان لوگو نے وہاں سے اسرائیل کے خلاف پُرتشدد کارروائیاں شروع کر دیں۔ ایسی کارروائیوں سے تنگ آ کر اسرائیل نے شام اور اردن سے ڈیل کی کہ ان کو نکالو، ان لوگوں نے نکلنے کی بجائے اپنے میزبانوں سے بھی لڑائی شروع کر دی۔ پاکستانی فوج کا بریگیڈیئر ضیاء الحق (جو بعد میں اس ملک کا صدر بھی رہا) وہاں اُردن میں فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ فلسطینیوں کے خلاف آپریشن شروع کیا گیا کہ ان کو لبنان میں دھکیل دیا جائے چنانچہ 20 ہزار سے زائد فلسطینیوں کا قتل عام کیا گیا۔ دیگر افواج نے مشکل سے 5 ہزار مارے ہوں گے اور ان کو لبنان میں دھکیل دیا تب لبنان جنت نظیر تھا مگر ان لوگوں نے وہاں جاتے ہی پھر اپنا کام شروع کر دیا اور اسرائیل سے جنگ میں لبنان کھنڈر بن گیا پھر وہاں سے بھی نکال دیے گئے اور کئی ملکوں میں بکھیر دیے گئے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ جب سے شدت پسند گروہ حماس کا عمل دخل اور اثر ورسوخ فلسطین میں بڑھا ہے۔ فلسطین کا مسئلہ گنجلک ہو گیا ہے۔ جب بھی امن کے راستے پر ایک قدم اٹھتا ہے بغیر کسی وجہ کے بغیر کسی اشتعال کے حماس کے لوگ اسرائیل پر راکٹ

برسانا شروع کردیتے ہیں۔

اب آپ ذرا غور سے سمجھیں کہ یہ راکٹ کیا ہیں۔ یہ ایک خود ساختہ ہتھیار ہے جو کہ مروجہ جنگی میزائل کی دیسی نقل ہے اور بہت چھوٹا ہے اس کی مار بھی کم ہے اور اس سے نقصان بھی واجبی ہوتا ہے۔ حماس کے لوگ یہ راکٹ خود بناتے ہیں اور کچھ پرانے زائد المیعاد راکٹ ایران ان کو دیتا ہے۔ آپ یہ سمجھ لیں کہ پاکستان میں شادی بیاہ پر جو گولے چلاتے تھے جو اوپر جا کر پھٹتے ہیں یہ اُن کی ذرا بہتر قسم ہے اور ہوتا کیا ہے اس کے جواب میں اسرائیل اپنی بھرپور قوت اور غضب کے ساتھ حملہ آور ہو جاتا ہے جو ترقی گزشتہ پانچ سال سال میں علاقے میں ہو چکی ہوتی ہے اور غزہ و مغربی کنارے کے لوگوں کے دل میں امن کی امید پھر سے روشن ہو چکی ہوتی ہے اسرائیل کے تباہ کن حملوں سے وہ سب ختم ہو جاتا ہے۔ ایسا گزشتہ دس بارہ سال میں تیسری دفعہ ہوا ہے اور ہر دفعہ یہ کھیل ایک ہی انداز سے دہرایا جاتا ہے۔ اسرائیلی کہتے ہیں ایک اسرائیلی کے بدلے 50 فلسطینی مارنے ہیں اور وہ مارتے ہیں۔ ایسے لگتا ہے جیسے کہ حماس کے جنگی جنونی اپنے بچوں کو اسرائیلی بموں سے مرنے کے لئے پیدا کرتے ہیں۔ قارئین! بچوں کی مسخ شدہ لاشیں ایک نظر بھی دیکھی نہیں جاسکتی ہیں اور اس دفعہ اسرائیلیوں کا یہ دعویٰ بھی سچ ثابت ہو گیا ہے کہ حماس سکولوں اور ہسپتالوں کی عمارتوں سے راکٹ فائر کرتے ہیں۔ اقوام متحدہ کی ایجنسی برائے غزہ نے اس کی تصدیق کی ہے اور میں نے حماس کا ایک ہدایت نامہ دیکھا کہ میڈیا پر یہ مت دکھاؤ کہ اسرائیلی طیارے بمباری کر رہے ہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ بچوں کی لاشیں دکھاؤ اور اب دنیا نے یہ بھی دیکھ لیا ہے کہ چار گھنٹے کی جنگ بندی جو انسانی بنیادوں پر ہوئی تھی، اس کے صرف دو گھنٹے بعد حماس نے راکٹ چلانے شروع کر دیئے۔

قارئین! یہ جنگ ایسے ہے جیسے کہ ایک بندے کے پاس چھرے والی ائرگن ہو جس سے پرندے مارتے ہیں اور دوسرے کے پاس مشین گن اور بم ہوں اور چھرے کی گن والا بار بار فائر کرنے سے باز نہ آئے جبکہ ایک بچے کو بھی پتہ ہے کہ وہ کچھ نہیں کر سکتا ہے۔ اس دفعہ مسئلہ گزشتہ ماہ شروع ہوا جب تین اسرائیلی لڑکوں کو یروشلم کے علاقے سے اغوا کر کے قتل کر دیا گیا اور تحقیق و تفتیش سے ملزم ثابت ہونے والے فلسطینی فرار ہو گئے اور دو دن بعد ایک مسلم لڑکے کو اغوا کر کے زندہ جلا دیا گیا۔ اس پر اسرائیلی حکومت نے خود اپنے مفاد کے لئے قاتل اگلے دن گرفتار کر کے مقدمہ درج کر لیا مگر اس کے چند دن بعد اچانک ہی جیسا کہ پہلے ہوتا رہا ہے حماس نے راکٹ باری شروع کر دی اور اسرائیل نے ایک دو دن کے توقف سے تباہی کا کھیل شروع کر دیا۔ اس ساری صورت حال سے یوں لگتا ہے کہ جیسے حماس کی اعلیٰ قیادت میں اسرائیل کے ایجنٹ ہیں اور جونہی امن کی بات کسی موڑ پر پہنچتی ہے تو وہ بغیر وجہ اور اشتعال کے راکٹ باری شروع کر دیتے ہیں اور اس طرح سے اسرائیل کو گزشتہ سات آٹھ برس میں جو ترقی ہوئی ہوتی ہے، جو امن کی امید جاگی ہوتی ہے اسے تباہ کرنے کا بہانہ ہاتھ آ جاتا ہے۔ قارئین! یہ میرا دعویٰ ہے کہ اس عمل (حماس سے راکٹ باری کرانا اور شدت پسندی کو ہوا دینا) میں اسرائیل خود کسی نہ کسی طرح سے ملوث ہے اور ایک دن یہ بات واضح ہو کر سامنے آ جائے گی اور رہی بات امت مسلمہ کی تو وہ نجانے کس چڑیا کا نام ہے۔ دنیا بھر کے ہر ملک کے اہم شہروں میں جو روز باضمیر لوگ ریلیاں نکالتے ہیں جلوس نکالتے ہیں کہ غزہ پر ظلم بند کرو مگر امت مسلم کے سب سے بڑے ٹھیکیدار سعودیہ کی طرف سے ایک سطر کا بیان بھی نہیں آتا ہے اور نہ ہی شعلوں کو ہوا دینے والے زائد المیعاد راکٹ

دینے والے ایران کا منہ کھلتا ہے۔ کیا یہ بے بسی کی سب سے بڑی بات نہیں کہ غزہ کی امداد کے لئے صرف ایک مسلم ملک ترکی کے علاوہ بقیہ ساری امداد غیر مسلم ممالک سے آتی ہے اور غزہ کے مظلوموں کے زخموں پر وہی مرہم رکھتے ہیں۔ یہ ایک مفروضہ ہے کہ وہ اسرائیل کی امداد کرتے ہیں۔

"حکایت" کے قارئین کو میاں طاہر صاحب کے تراجم سے واضح معلوم ہو گیا ہو گا اور راقم نے 1988ء میں یہ تحقیق مکمل کر لی تھی کہ اسرائیل نے کسی سے بھی بھیک نہیں لی ہے، اپنی عقل اور محنت سے وہ اس مقام پر پہنچے ہیں۔ ان کی قیادت میں وہ لوگ ہیں جو اپنے عوام سے جنون کی حد تک پیار کرتے ہیں اور اپنے ملک کی بقاء کے لئے پیشہ وارانہ انداز سے کام کرتے اور انتھک محنت کرتے ہیں۔ آدھی رات کے گیدڑوں کی طرح سے سیاسی حکومتوں کے خلاف سازش نہیں کرتے ہیں نہ ہی سیاسی جماعتوں اور ملاؤں میں رقوم تقسیم کرتے ہیں پھر بے شرمی سے سرعام اس کو تسلیم کرتے ہیں۔

قارئین! بات غزہ کی ہو رہی تھی تو اسرائیل میں پندرہ لاکھ فلسطینی عرب رہتے ہیں ان کے پاس وہاں کے آئی ڈی کارڈ اور پاسپورٹ ہیں۔ یہ اسرائیلی شہری ہیں اور سو فیصد مکمل حقوق رکھتے ہیں جو کسی بھی اسرائیلی شہری کو حاصل ہیں حتیٰ کہ غزہ کے حق میں ریلی بھی نکالتے ہیں۔ آپ کو بتا دوں کہ خود اسرائیل میں بائیں بازو کی جماعتوں اور لبرل گروہوں نے غزہ پر حملہ کے خلاف جلوس نکالے ہیں۔ فلسطین کا مسئلہ مشرق وسطیٰ کا سلگتا ہوا مسئلہ ہے جو بار بار بھڑکتا ہے اور اس کا واحد حل حقائق کو تسلیم کر لینے میں ہے۔ جتنی جلدی فریقین خصوصاً حماس زمینی حقائق اور صورت حال کو تسلیم کرے گی، مسئلہ کا حل نزدیک آ جائے گا۔ میرا مقصد کسی کی دل آزاری کرنا نہیں ہے۔

معزز قارئین! جب غزہ کے لاکھوں افراد امن امن پکارتے ہیں، جب اسرائیل کے اندر پندرہ لاکھ فلسطینی اور ہزاروں قادیانی باعزت پُرسکون زندگی گزارتے ہیں (وہ کسی کے غلام نہیں ایک ریاست کے شہری ہیں) جب کراچی سے 2500 پاکستانیوں نے اسرائیلی شہریت اختیار کر لی ان میں سے صرف دو ہزار یہودی تھے بقیہ مسلم تھے اور جب دنیا بار بار فریقین کو امن کے راستے کی طرف لے کر چلتی ہے، مذاکرات ہوتے ہیں، ضمانتیں لی اور دی جاتی ہیں تو پھر حماس کا مؤقف کیا ہے بلاجواز جنگ شروع کرنے کا وہ بھی خالی ہاتھ۔ اب غزہ کے ہزاروں نہیں لاکھوں افراد نے عندیہ دیا ہے کہ یہ ہمارا دیس ہمیں بہت پیارا ہے مگر اب اگر ذرا سا بھی موقع ملے اس کو چھوڑ دیں گے۔ میں فلسطینیوں کو مظلوم اور بدقسمت قوم تسلیم کرتا ہوں لیکن خدارا! آپ سے التماس ہے کہ حماس اور فلسطین کو الگ الگ کر کے دیکھیں۔ حماس کو ووٹ دینے والے اب پچھتا رہے ہیں۔ غزہ میں حماس نے بدمعاشی سے اپنی حکومت قائم کر رکھی ہے اور جیسا کہ میں نے لکھا ہے کہ یہ بار بار جو جنگ شروع کر دیتے ہیں تو اس کے درپردہ اسرائیل کا ہاتھ ہونا بھی ممکن ہے مگر یہ سوال اپنی جگہ پر ہے کہ اسرائیل کو اس سے کیا فائدہ؟ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اسرائیل کسی خاص طویل المیعاد منصوبے پر عمل کر رہے ہوں جس کے خاتمہ پر وہ ایسی فلسطینی ریاست تشکیل دیں جو ان کی مددگار ہو۔ ظاہر ہے جتنے بھی حملے کر لیں وہ فلسطینیوں کو ختم تو کر نہیں سکتے اس کا ان کو بھی پتہ ہے اور اب آخری بات جیسا کہ میں اکثر ملاؤں کے بارے لکھتا ہوں تو اس دفعہ بھی ملا اور ملائیت زدہ لوگوں کے منہ سے ایک ہی فقرہ بار بار سن رہا ہوں یا اللہ غزہ کی مدد کر۔ اس فقرے کا سیاق و سباق یہ ہے کہ ملا جمعہ یا عیدین پر ایک لمبی دعا کراتا ہے اور کہتا ہے یا اللہ کشمیر کو

کوئی مرض لاعلاج نہیں (القرآن)
سوائے موت کے
ماہنامہ "حکایت" کے شعبہ "دست شفاء" کے مستند و ماہر ڈاکٹر رانا محمد اقبال (گولڈ میڈلسٹ)
کی جدید تحقیقات اور ماہرانہ خدمات سے مستفید ہوں اور پرانے، ضدی اور لاعلاج امراض، خصوصاً
درج ذیل امراض کے تیز ترین اور بے ضرر علاج کے لئے رجوع فرمائیں:
پولیو
الرجی
ذہنی معذور بچے
یادداشت کی خرابیاں
ہاتھوں کی جلد کی خرابیاں
ہائی بلڈ پریشر
ناک و گلے کے غدود کا بڑھ جانا
اعضاء کی بے حسی یا کنٹرول نہ ہونا
پھیپھڑوں کے امراض
احساسِ کمتری، جھجک
مردانہ، زنانہ امراض
اعضاء کا پیدائشی (یا بعد میں) ٹیڑھا پن
رابطے کے لئے
ڈاکٹر رانا محمد اقبال
(گولڈ میڈلسٹ)
0321-7612717
0312-6625086
عارف محمود
0323-4329344
بالمشافہ ملاقات کے لئے پہلے وقت لیں۔
دست شفاء حکایت 26 پٹیالہ گراؤنڈ لنک میکلوڈ روڈ لاہور

آزادی دے، فلسطین کو آزادی دے آمین اور پھر کہتا ہے کہ چندے کے پیسے مسجد اور مدرسے کی صندوقچی میں ڈالنا مت بھولیئے۔ تو جناب جب تک امت مسلمہ دعائیں کرتی رہے گی اور لوگ محض ریلیاں نکالتے رہیں گے تو کچھ نہ ہوگا اگر ہم ایک طاقتور باوقار قوم ہوں تو ہماری بات بھی کوئی سنے گا اس پر دھیان دے گا۔

صرف فلسطینیوں کے علاوہ ساری عرب دنیا کھلے عام یا اندرخانے اسرائیل سے دوستی کر چکی ہے حتیٰ کہ سعودی عرب تک اس سے کاروبار کر رہے ہیں تو پھر ہمارے پاکستانیوں کو کیا مسئلہ ہے، کیا دشمنی ہے اسرائیل سے؟ ہم اسرائیل سے دوستی کر کے فلسطینیوں کے لئے زیادہ سے زیادہ مفادات حاصل کر سکتے ہیں اور بھارت کا پریشر بھی کم کر سکتے ہیں۔

حماس نے غزہ کو یرغمال بنا رکھا ہے اور غزہ میں تمام خون ریزی کی ذمہ داری حماس پر ہے۔ یہ لوگ جان بوجھ کر امن کی بات نہیں کرتے اور نہ ہی امن کے راستہ پر چلنے کو ترجیح دیتے ہیں بلکہ خونریزی کا راستہ اپناتے ہیں ان کی حیثیت وہاں وہی ہے جو پاکستانی قبائلی علاقوں میں طالبان کی ہے جنہوں نے عوام کو یرغمال بنا رکھا ہے اور خونریزی کر رہے ہیں۔ پاکستان میں ایک ایک دھماکے میں 250 لوگ مرتے رہے کبھی حماس نے ایک فقرہ بھی افسوس کا کہا؟ دنیا بھر میں درجنوں جگہوں پر مسلمانوں پر ظلم کی انتہا ہوئی حماس نے کوئی لفظ بولا؟ آج ساؤتھ افریقہ اور ملائیشیا سے پیرس لندن تک جو جلوس اور ریلیاں غزہ کے حق میں نکل رہی ہیں۔ یہ غزہ کے حق میں نہیں ہے اسرائیل کے خلاف ہیں۔ غزہ سے پیار کی ریلی نہیں یہ اسرائیل سے نفرت کی ریلی ہے۔ اسرائیل میں محض 50 فیصد انتہا پسند ہیں بقیہ لبرل اور بائیں بازو کے لوگ ہیں جو غزہ کو آزادی دینے کے حق میں ہیں۔ پاکستان اسرائیل سے زیادہ مذہبی شدت پسند ملک ہے تو پھر حماس کے بدمعاشوں نے کس وجہ سے کس فائدے یا جنون کی خاطر قتل و غارت کا یہ بازار گرم کر رکھا ہے۔ مرنے والوں میں حماس کے 50 لوگ بھی شاید ہوں بقیہ سب سویلین اور بچے ہیں۔ اس سے پہلے غزہ کے اندر الفتح سے لڑائی میں حماس کے بدمعاشوں نے درجنوں بچے اور عام لوگ مار دیئے تھے۔ ان حقائق پر نظر رکھیں اور یہ ضرور یاد رکھیں کہ اسرائیل کو امن کی زیادہ ضرورت ہے اور وہ اس معاملہ سے بہت تنگ ہیں۔

اب تک خود اسرائیل نے دو دفعہ جنگ بندی کی پیشکش کی ہے اور حماس نے اس کے علاوہ دنیا بھر سے ہر طرف سے آنے والی جنگ بندی کی پیشکش ٹھکرا دی ہے اور اس جنگ میں ہو کیا رہا ہے اسرائیلی فوج کے حملوں سے سویلین افراد کی جائیدادیں تباہ ہو رہی ہیں۔ عورتیں اور بچے مر رہے ہیں اس لئے کہ نام نہاد مجاہدین تو محفوظ جگہ بھاگ جاتے ہیں۔

قارئین سے اپیل ہے کہ فلسطینیوں سے محبت اور اسرائیل سے نفرت دو الگ عمل ہیں، ان کو سمجھیں اور اسرائیل کے خلاف زیادہ تر غیر مسلم ہیں جن کے اپنے خاص مفادات ہیں اور آج ہر جگہ ریلی نکالنے والے ہمدردوں کو پاکستان میں ایک لاکھ معصوم لوگ جن میں عورتوں بچوں کی اکثریت ہے اور 50 ہزار سے زائد سکیورٹی اداروں کے افراد کی لاشیں نظر نہیں آتی ہیں۔

نوٹ:۔ میرے ساتھ اختلاف کرنے والے حضرات سے گزارش ہے کہ کال کر کے اپنی بات کیا کریں، گمنام ایس ایم ایس نہ کریں۔ اچھے طریقے سے کال کر کے اپنا تعارف کرا کے بات کریں۔ آئندہ کسی ایس ایم ایس کا جواب نہیں دوں گا۔

❁❁❁

داستان ایک عامل کی

"دیکھ رکھے تُو مجھے دھوکا نہیں دے سکتا"۔ شادو نے کہا۔ "تجھے زندہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی ہے۔ کیا تُو تصور کرسکتا ہے کہ کوئی آدمی جس کو مُردہ سمجھ لیا گیا ہو اچانک اس سے ملاقات ہو جائے تو انسان کتنی حیرت انگیز کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ بول رکھے میں ٹھیک کہہ رہی ہوں؟"

"ہاں، شادو! تُو ٹھیک کہہ رہی ہے۔ میں رکھا ہی ہوں لیکن اس راز کو راز ہی رکھنا ورنہ بہت گڑبڑ ہو جائے گی۔ میرے دشمن مجھے قتل بھی کرسکتے ہیں یا پھر میں گرفتار ہوسکتا ہوں"۔

"ہاں، رکھے! مجھے احساس ہے، میں اتنی کم عقل نہیں ہوں تیری اجازت ہو تو منّے کو بتا دوں، منّے پر مجھے مکمل اعتماد ہے۔ ویسے بھی مشکل وقت میں وہ تیرا مددگار ہوگا"۔

"جیسے تیری مرضی لیکن میرا کوئی مستقل ٹھکانہ نہیں ہے، میں کسی بھی وقت یہاں سے دور بہت دور جا سکتا ہوں۔ اچھا، چھوڑ ان باتوں کو، کچھ اپنے بارے میں بتا"۔

"مجھ پر اللہ کا بہت فضل ہے"۔ شادو نے کہا۔ "منّا پہلوان میرے سر کا سائیں ہے، تیری بے وفائی اور پھر گمشدگی کے بعد میں نے منّے سے شادی کرلی تھی اللہ نے مجھے آٹھ بیٹے عطا کیے ہیں۔ اگر تُو ان کو دیکھے تو حیران رہ جائے گا اتنے خوبصورت اور طاقتور نوجوان تُو نے بہت کم دیکھے ہوں گے۔ منّے اور میں نے مل کر انہیں اس انداز سے پالا ہے جس طرح شیر اور شیرنی اپنے بچوں کو پالتے ہیں"۔

"شادو صحیح بتانا کبھی میرا خیال بھی آیا؟"

"ہاں کیوں نہیں، تیرا خیال آتا تھا لیکن اس انداز سے نہیں کیونکہ شادی کے بعد منّا ہی میری محبتوں کا محور بن گیا تھا۔ ویسے بھی غیر مرد کا خیال رکھنے سے اپنے سر کے سائیں کی حق تلفی ہوتی ہے پھر تُو تو میرے دل سے اسی وقت نکل گیا تھا جب تُو نے ہری سنگھ کی بیٹی کے ساتھ منہ کالا کیا تھا۔ بتا تجھے کیا حاصل ہوا؟ اگر تُو شیطان کے بہکاوے میں نہ آتا تو ہوسکتا ہے تُو شادو کے سر کا سائیں ہوتا۔ تُو دنیا میں جتنی چاہے عیاشی کر لے لیکن جو لطف بیوی بچوں کے درمیان رہ کر آتا ہے اس کا تو اندازہ ہی نہیں کرسکتا۔ منّا جب اپنے بچوں کے درمیان بیٹھ کر انہیں دیکھتا ہے تو اس کا کلیجہ ٹھر جاتا ہے۔ ایک دن مجھے کہنے لگا شادو تیرا حق مجھ سے کبھی ادا نہیں ہوگا تُو نے شیروں جیسے آٹھ بچے جن کر میری زندگی میں عجیب قسم کا رنگ بھر دیا ہے ان کی موجودگی میں میرا کوئی شریک میری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہیں کرتا"۔

"اچھا شادو! منّے کے ساتھ تیری شادی کیسے ہوئی، کیا اُس نے کسی پہلوان کو ہرایا تھا؟"

"نہیں! ایک وجہ تو تیری بے وفائی تھی۔ تُو ایک غیر مذہب کی لڑکی پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ تُو صرف پاپی ہی نہیں بلکہ بے غیرت بھی ہے۔ تُو نے ماجے ویر کی عزت وقار کو بٹہ لگا دیا اور بہتان کو اس کے سر کے سائیں کے سامنے ذلیل کیا، ماجے کو تھانے اور کچہری چڑھایا۔ اس کو ہتھکڑی لگوائی، نمک حرام تُو نے ماجے کو کیا صلہ دیا؟ اس کی محبتوں اور محنت پر پانی پھیر دیا۔ تُو اگر اس کیس سے بری بھی ہو جاتا تب بھی میں تم پر تھوکنا بھی پسند نہ کرتی۔ جس مرد کو غیر عورتوں کا چسکا پڑ جائے وہ انسان نہیں رہتا، سؤر بن جاتا ہے۔ مجھے مرے ہوئے ماجے کی شرافت کی قسم، میری زندگی میں صرف منّا پہلوان ہی داخل ہوا تھا اور یہی قسم میں منّے کے بارے میں بھی اٹھا سکتی ہوں۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں تم سے شادی کی خواہش مند تھی لیکن سؤروں کو کھجوریں نہیں ملا کرتیں۔ جس طرح غیرت مند مرد گندی عورت کو پسند نہیں کرتا اسی طرح غیرت مند عورت بھی گندے مرد کو پسند نہیں کرتی۔ منّا خوبصورت، طاقتور، اور

میرے جوڑ کا آدمی تھا اور پھر میں اس کی پسندیدہ لڑکی تھی، اس نے مجھے ہرا کر مجھے جیتا تھا اور شادو کو ہرانا کوئی آسان بات نہیں تھی۔ تُو غلط راستے کا انتخاب کر کے شادو کے بے پناہ پیار سے محروم ہو گیا اور اب در بدر کی ٹھوکریں کھانا تیرا مقدر بن چکا ہے۔ تجھے کوئی ابا کہنے والا نہیں، تُو کسی کی محبت کا محور نہیں، تیرا کوئی گھر نہیں، تُو جب مرے گا تجھے کوئی رونے والا نہیں ہو گا۔ منّا ایک دفعہ ہائے کرے میں اور میرے بیٹے اس کی دل جوئی کے لئے اپنی جان قربان کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے"۔

"بس کر شادو!" میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کیا۔ "مجھے والد، پھوپھا اور پھپھو کی جدائی نے نیم پاگل کر دیا ہے، اوپر سے تیرا ایک ایک لفظ برچھے کی مانند میرے جگر کو کاٹ رہا ہے"۔

"ٹھیک ہے رکھتے! میں اب چلتی ہوں، بہتر ہے تُو جلد از جلد اس علاقے سے نکل جا۔ ہری سنگھ کے بیٹے تیری تاک میں ہیں اگر تُو پہچانا گیا تو بہت بُرا ہو گا۔ ویسے اِدھر یہ بات مشہور ہو گئی ہے کہ رکھتے کو ہری سنگھ نے قتل کرا دیا ہے"۔

شادو جب جانے کے لئے مڑی تو میں نے اس کی جاندار چال کو دیکھا، اس پر ابھی بڑھاپا اثر انداز نہیں ہوا تھا پھر منّا پہلوان اُس سے آ ملا۔ شادو کو منّے کے ساتھ دیکھ کر میرا دل جیسے بیٹھ گیا ہو، پرانی دردیں جاگ اٹھیں تھیں لیکن شادو نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ نذیر! تُو نے کبھی غور کیا جب دل کے جانی بے رخی اختیار کر جائیں تو انسان کی کیا حالت ہوتی ہے؟"

"ہاں، رکھتے! انسان ٹوٹ پھوٹ کر بکھر جاتا ہے۔ اس کی کیفیت اس شخص کی مانند ہو جاتی ہے جو پانی میں ڈوب رہا ہو اور اسے تنکے کا سہارا بھی میسر نہ آئے"۔

"نذیر! تُو نے بالکل ٹھیک کہا ہے، میری بھی یہی حالت ہو گئی تھی۔ اب کیا ہو سکتا تھا، میں اپنے استاد کے ساتھ نامعلوم منزل کی طرف چل پڑا۔ شام تک ہم جتنا سفر کر سکتے تھے کرتے رہے اندھیرا گہرا ہو گیا ہمیں کسی بستی کی تلاش تھی کہ وہاں صدا کر کے، پیٹ کا جہنم بھرتے۔ دور سے ہمیں مدھم سی روشنی کے آثار نظر آئے، ہم اس کی طرف چل پڑے۔ جب ہم روشنی کے قریب آئے تو خطرناک کتوں نے ہمارا استقبال کیا لیکن یہ ہمارے لئے کوئی مسئلہ نہیں تھے۔ کتے کے بھونکنے سے گداگر کا رزق تو کم نہیں ہوتا۔ پھر ایک زنانہ آواز ہمارے کانوں میں آئی۔ وہ کتوں کو اپنے مخصوص انداز سے واپس بلا رہی تھی۔ کتے شاید اس کی زبان کو سمجھتے تھے، فوراً ہی واپس چلے گئے۔ اتنے میں ہم اس مکان کے قریب پہنچ چکے تھے کہ اسی عورت نے بلند آواز سے پوچھا۔

"اللہ لوکو! تم کون ہو؟"

"ہم مسافر ہیں اور بھوکے ہیں"۔

"کوئی بات نہیں، سونے کو جگہ بھی مل جائے گی اور کھانا بھی، اندر آ جاؤ"۔

جب ہم اندر داخل ہوئے تو ایک کالی کلوٹی عورت نے ہمارا استقبال کیا۔ ہم نے چراغ کی مدھم روشنی میں دیکھا کہ وہ ایک خانقاہ تھی اور قبر کے سرہانے دیا جل رہا تھا جبکہ ساتھ والے حجرے میں چار پائیاں پڑی ہوئی تھیں اور تازہ حقہ جس کی چلم میں ابھی ابھی آگ بھری گئی تھی۔ ہم چار پائیوں پر بیٹھ گئے اور میں نے حقے کے کش لگانے شروع کئے۔ بیرونی دروازے پر دستک ہوئی، عورت نے بلند آواز سے کہا۔

"ٹھہر جا، میں آ رہی ہوں"۔ اور پھر ایک ملنگ دھڑنگ ہاتھ میں ڈنڈا دوسرے ہاتھ میں بالٹی اور مونڈھے پر رنگین والا کشکول لئے اندر داخل ہوا۔ عورت نے اُسے ہماری آمد کی خبر دی۔ وہ سیدھا کمرے میں آیا، اس نے ڈنڈا دیوار کے ساتھ کھڑا کیا اور بالٹی

زمین پر رکھی جو دودھ سے لبالب بھری ہوئی تھی۔ پھر مونڈھے سے کشکول اتارا اور باری باری ہم سے مصافحہ کیا۔ ہمیں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ یہ تو اپنے ہی "جھگے" کا آدمی تھا۔ قریبی بستی سے کھانا اور دودھ مانگ کر لایا تھا۔ ہم نے سیر ہو کر کھانا کھایا اور حسب ضرورت دودھ پیا۔ اس نے اپنا مختصر تعارف کرایا، وہ اس خانقاہ میں بحیثیت منتظم محافظ اور متولی رہتا تھا۔ اس خانقاہ میں دفن بزرگ کے متعلق بھی اس قسم کے جھوٹے اور مبالغہ آمیز قصے مشہور تھے جو تقریباً ہر خانقاہ میں دفن بزرگ کے لئے مشہور ہوتے ہیں اور جن کی اصل میں کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ ہم بہت تھکے ہوئے تھے لہٰذا جلد ہی نیند کی آغوش میں چلے گئے اور پھر ہماری آنکھ اس وقت کھلی جب دو آدمی ملنگ پر گنڈاسوں سے پے در پے وار کر رہے تھے اور ملنگ کی دلدوز چیخیں کمرے میں گونج رہی تھیں۔ اس سے پیشتر کہ ہم حالات کو سمجھتے یا ملنگ کی مدد کو پہنچتے قاتل اپنا کام کر کے تیزی سے بھاگ گئے، ملنگ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ ہم باہر نکلے تو دونوں کتے صحن میں مردہ پڑے ہوئے تھے اور عورت کی چارپائی کے نیچے کافی مقدار میں خون جمع تھا لیکن وہ ابھی تیز تیز چھوٹے چھوٹے سانس لے رہی تھی۔

رکھئے! یہ دوہرے قتل کا کیس ہے، پیشتر اس کے کہ صبح کی روشنی پھیلے اور یہ خبر قریبی گاؤں میں پہنچے ہمیں یہاں سے بھاگ جانا چاہئے"۔ میرے ہندو استاد نے کہا۔

"ہاں استاد! یہاں سے بھاگنے میں ہی عافیت ہے"۔ اور پھر ہم وہاں سے نکلے اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے نامعلوم راستے پر چل پڑے۔ پو پھٹنے تک ہم کافی دور نکل گئے تھے لیکن اس افسوسناک واقعے نے ہم پر گہرا اثر ڈالا تھا ہمیں اس واقعے کی تحقیق کی کوئی ضرورت نہیں تھی لیکن جب میرا استاد مر گیا اور میں اس علاقے میں واپس آیا تو مجھے پتہ چلا کہ ملنگ مقتولہ عورت کو کہیں سے بھگا کر لایا تھا۔ عورت کا تعلق کسی خانہ بدوش خاندان سے تھا، انہی لوگوں نے تلاش بسیار کے بعد دونوں کو قتل کر دیا تھا۔ اس واقعے کے بعد میرے استاد کے دماغ نے پلٹا کھایا اور اس کا میلان مذہب کی طرف ہو گیا۔ ایک دن مجھے کہنے لگا۔ رکھئے اس جنم میں میں نے جتنے بُرے کام کئے ہیں اگلے جنم میں میری روح سکون نہیں پا سکے گی۔ میں بڑی آتما (یعنی خدا) کے ساتھ ملنا چاہتا ہوں اور بار بار کے جنم سے خلاصی حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

آواگون یا تناسخ

یاد رہے کہ نجات کا تصور تقریباً ہر مذہب میں پایا جاتا ہے لیکن اس کا پس منظر ہر مذہب میں مختلف ہے۔ چونکہ یہ ایک مستقل موضوع ہے لہٰذا اس پر بحث کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ صرف ہندو مذہب کے بارے میں چند لائنوں میں تھوڑی سی وضاحت کر دیتا ہوں تا کہ آپ کے علم میں اضافہ بھی ہو اور کہانی بھی ڈسٹرب نہ ہو اور یہ بھی اس لئے کہ چونکہ کہانی کا تعلق اس سے بنتا ہے کیونکہ کہانی کا ایک کردار ایک ہندو جوگی ہے یاد رہے کہ ہندوؤں کے ہاں آخرت اور جنت و جہنم کا کوئی تصور نہیں ہے بلکہ ان کے ہاں اس کے برعکس آواگون یا تناسخ کا نظریہ پایا جاتا ہے۔ اس نظریہ کے مطابق انسان کے مرنے کے بعد اس کی روح کو دوبارہ کوئی اور جسم دے کر اس دنیا میں لوٹا دیا جاتا ہے اور ہزاروں مرتبہ ایسا ہوتا ہے۔ اگر کوئی انسان ایک جنم میں بُرے کام کرے تو اگلے جنم میں اسے سزا دی جاتی ہے اور اس سزا کے نتیجے میں اسے کتے، گدھے یا کسی اور جانور وغیرہ کی شکل میں جنم ملتا ہے حتیٰ کہ جب تک ایک انسان انتہائی درجہ کی ریاضتیں، عبادتیں اور مشقتیں برداشت نہیں کر لیتا تب تک وہ اس آواگونی چکر سے نجات حاصل نہیں کر سکتا۔

اپنے آپ کو انتہائی مشقت میں ڈال کر اور سخت ترین ریاضتیں کر کے اس آواگونی چکر سے نکل کر نروان (نجات) کو حاصل کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ آبادیوں سے دور جنگلوں اور غاروں میں رہنا، گرمی، سردی، بارش وغیرہ میں ننگے بدن رہنا۔ انہوں نے اپنی ریاضتوں کا مقدس عمل سمجھا۔ اپنے آپ کو دیوانہ وار تکلیفیں پہنچا کر، انگاروں پر لیٹ کر، درختوں کی شاخوں پر گھنٹوں لٹک کر اور اپنے ہاتھوں کو بے حرکت بنا کر یا سر سے اونچا لے جا کر اتنے طویل عرصے تک رکھنا کہ وہ بے حس ہو جائیں اور سوکھ کر کانٹا بن جائیں۔ تیز دھار نوکیلے خنجر سے ایک گال سے دوسرے گال تک اور ناک کے دونوں حصوں تک اور دونوں ہونٹوں کے آر پار خنجر اتار دینا اور اس طرح گھنٹوں کھڑے رہنا، تازہ کانٹوں اور نوکیلی کیلوں کے بستر پر لیٹے رہنا یا رات بھر ایک پاؤں پر کھڑے رہنا۔

(مقدمہ آرتھ شاستر صفحہ 99 بحوالہ کتاب التوحید، جنات کا پوسٹ مارٹم صفحہ 239)

اس سے ملتا جلتا تصور بدھ مت اور جین مت کے پیروکاروں کا بھی ہے۔

نجات کے متعلق یہود کا عقیدہ یہ ہے کہ چالیس دن جہنم میں رہنے کے بعد آخرکار جنت میں چلے جائیں گے۔

عیسائیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام صلیب پر چڑھ کر اپنے ماننے والوں کے لئے کفارہ ادا کر گئے۔

مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ مرنے کے بعد اعمال کے مطابق جزا و سزا دی جائے گی اور قیامت تک روحوں کو اگر نیک ہیں تو علیین میں اور اگر بدعمل ہیں تو سجین میں رکھا جائے گا اور جب قیامت قائم ہوگی تو اعمال کے موافق جنت یا جہنم کا حقدار قرار دیا جائے گا لیکن صحیح العقیدہ مسلمانوں کو ان کے گناہوں کے ازالے کے لئے سرور کونین کی شفاعت نصیب ہوگی۔ علماء کرام، حفاظ عظام، شہداء امت بھی گنہگاروں کے لئے سفارش کریں گے لیکن شفاعت کی اجازت رب العزت خود دیں گے۔ جو خوش قسمت جنت میں پہنچ جائیں گے پھر ابدالآباد جنت میں ہی رہیں گے لیکن کچھ لوگ اپنے گناہوں کی سزا بھگت کر جہنم سے آزاد ہو جائیں گے۔ کفار و مشرکین جہنم میں رہیں گے اور ہمیشہ کے لئے جہنم میں ان کا ٹھکانہ ہو گا۔ ہندوؤں کے ہاں چونکہ یہ عقائد نہیں ہیں ان کی نجات کا انحصار اس بات پر ہے کہ انسان اپنے آپ کو انتہائی مشقتوں میں ڈال کر آتما یعنی خدا سے مل جائے۔ بس اس کی نجات ہوگئی یعنی وہ فنافی اللہ ہوگیا۔ اب اسے ایک جنم سے دوسرے جنم میں آ کر سزا بھگتنے سے نجات مل گئی۔ جب تک وہ اپنے آپ کو اس قسم کی مشقتوں میں نہیں ڈالے گا۔ بار بار جنم لیتا رہے گا اگر کسی جنم میں اس نے نیک کام کئے تو اگلے جنم میں اس کی روح کسی آرام اور عیش و عشرت کرنے والے جسم میں ڈال دی جائے گی اور اس نے برے کام کئے تو اس کی روح اگلے جنم میں کتے، گدھے، خنزیر وغیرہ میں ڈال دی جائے گی اور یہ سلسلہ ہمیشہ چلتا رہے گا۔ اس سے میرا مطلب ہندو مذہب پر تنقید نہیں کیونکہ ہر شخص اپنے عقائد و خیالات میں بالکل آزاد ہے اور ہدایت دینا نہ دینا اللہ کے اختیار میں ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے لکھا کہ یہ ایک مستقبل موضوع ہے یہاں میں مختلف مذاہب کا تقابل نہیں کر رہا نہ میں یہاں دلائل عرض کر رہا ہوں کہ کون سا مذہب حق پر ہے البتہ یہ میرا ایمان ہے کہ نجات کے متعلق اسلام کا نظریہ برحق اور حقیقت پر مبنی ہے جسے عقل سلیم مانتی ہے۔

نروان کی تلاش

پھوپھا اور پھپھو کی وفات اور ملنگ اور اس کی داشتہ

کے قتل کے واقعات ہندو جوگی پر گہرے اثرات چھوڑ گئے اور اُس کا میلان مذہب کی طرف ہو گیا۔

"رکھتے! میں اگلے جنم میں سزا برداشت نہیں کر سکتا"۔ اس نے بڑے وثوق سے مجھے کہا۔ "اس جنم میں جو اندوہناک گناہ میں نے کیے ہیں وہ تمہارے سامنے ہیں۔ اب نروان (نجات) کی تلاش میں اس سریر کو مشقتوں اور ریاضات کی بھٹی میں جھونک کر بڑی آتما سے ملنے کا خواہش مند ہوں اور میرا مشورہ تمہارے لئے بھی یہی ہے کہ چھوڑ اس پاپوں بھری ناپاک زندگی کو اور آ میرے ساتھ اس فانی سریر (جسم) کو دکھ اور مصیبت میں ڈال کر جنم جنم کی مصیبتوں اور پریشانیوں سے چھٹکارا حاصل کریں اور اگر تُو اپنے مذہب پر قائم رہنا چاہتا ہے تو پھر میرا تیرا ساتھ اب نبھ نہیں سکتا۔ تُو اپنا راستہ لے اور میں سیدھا گنگا اشنان کر کے اس ہٹے کٹے سریر کو ایسا مزہ چکھاؤں کہ آتما خوش ہو کے میری روح میں سما جائے"۔

"استاد! میرا کون سا مذہب ہے، مجھے تو کوئی پتہ نہیں لیکن میں تیرے ساتھ رہنا چاہتا ہوں"۔ میں نے لجاجت سے کہا۔

"دیکھو رکھتے! میں جب اپنے آپ کے ساتھ نہیں رہوں گا تو تمہیں ساتھ کیسے رکھ سکتا ہوں اور اگر تُو دنیا میں رہ کر اور پاپ کمانا چاہتا ہے تو تیری مرضی۔ میں نے تمہیں گناہ آلود زندگی گزارنے کے لئے کئی گر سکھا دیئے ہیں ان کو استعمال کر کے تُو ہر قسم کی عیاشی کر سکتا ہے"۔

"لیکن استاد! میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا، میرا جینا مرنا تمہارے ساتھ ہو گا"۔ میں نے بضد ہوتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے"۔ استاد نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

پھر ہم نے گنگا اشنان کیا، اس دوران استاد نے نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ میں آج بھی حیران ہوتا ہوں کہ اتنے دن انسان بغیر کھائے پیئے کیسے زندہ رہ سکتا ہے۔ پھر ہم ایک پہاڑ کے دامن میں پہنچے وہاں کچھ اور ہندو نروان کی تلاش میں اپنے جسموں کو مختلف طریقوں سے اذیت دینے میں مصروف تھے۔ بعض کے جسم سوکھ کر کانٹا ہو گئے تھے اور ان کی شکل و صورت بھی انسانی نہیں رہی تھی۔ ایک سادھو کو میں نے دیکھا کہ اپنے ناک میں نکیل ڈال کر نکیل کے سرے کو درخت کی ایک اونچی شاخ سے باندھ رکھا تھا کہ زمین پر صرف اس کے پاؤں کی انگلیاں لگی ہوئی تھیں۔ میرے استاد نے جو طریقہ اختیار کیا وہ ہیبت ناک اور دلدوز بھی تھا اور دلخراش بھی۔ وہ ایک درخت کے تنے کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور دوسرے سادھو نے ایک بڑا لمبا اور موٹا رسا اس کے گرد پوری طاقت سے کس دیا۔ پاؤں سے لے کر گردن تک اس نے اس کے جسم کو ڈھانپ لیا۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اگر کوئی اور استاد کے ساتھ اس طرح کرتا تو میں اپنی جان دے دیتا اور استاد کو اس مصیبت سے بچاتا لیکن یہ راہ میرے استاد کی خود پسند کردہ تھی اور ایک مذہبی معاملہ تھا جس میں مَیں کوئی دخل نہیں دے سکتا تھا۔ اتنے میں ایک سادھو نے مجھے گہری نظروں سے دیکھا اور پھر غضبناک انداز میں مجھ پر برس پڑا۔

"او ملیچھ (ناپاک) تُو ہماری پوتر (پاک) زمین کو اپنے گندے وجود سے ناپاک کر رہا ہے، ابھی اسی وقت یہاں سے چلا جا۔ ہمارے باپو نے تمام ملیچھوں کو ہندوستان کی پوتر دھرتی سے نکال باہر کیا ہے، تُو بھی یہاں سے نکل جا۔ مجھے گاؤ ماتا کی قسم ہم تمہیں بھارت ماتا کے دو ٹکڑے کرنے کی سزا ضرور دیں گے"۔

استاد نے زبان بند کر لی تھی، وہ نہ بول رہا تھا نہ دیکھ رہا تھا۔ میں نے آخری بار استاد کو دیکھا اور تیزی سے باہر کی جانب لپکا۔ ابھی میں نے دو تین میل سفر طے کیا ہو گا کہ ایک ویرانے میں جو منظر دیکھا وہ دل دہلا دینے والا

تھا۔ سو کے قریب مسلمان مقتول پڑے تھے جن میں بچے اور عورتیں بھی شامل تھیں اور تقریباً اتنے ہی زخمی تھے جن کی چیخ و پکار سے دل دہل رہا تھا۔ میں حیران تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے کہ اتنے میں ایک زخمی کو ہوش آ گیا جو زیادہ زخمی تو نہیں تھا لیکن صورت حال کی سنگینی کی وجہ سے حواس پر قابو نہ رکھ سکا تھا۔ پہلے تو وہ گھبرا گیا لیکن جب اس نے دیکھا کہ میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے اور درویشانہ لباس سے اس نے اندازہ لگا لیا کہ میں مسلمان ہوں تو اشارے سے مجھے اپنے قریب بلایا اور کہنے لگا۔ ”تم کون ہو اور یہاں کیا رہے ہو؟“

”میں مسافر ہوں“۔ میں نے کہا۔ ”اور اپنی منزل کی طرف جا رہا تھا کہ یہ دلدوز منظر دیکھ کر پریشان ہو گیا ہوں۔ مجھے بتاؤ یہ کیا معاملہ ہے؟“

”تمہیں نہیں معلوم کہ پاکستان معرضِ وجود میں آ گیا ہے، ہمارا یہ قافلہ پاکستان ہجرت کر کے جا رہا تھا کہ ہندو اور سکھ غنڈوں نے ہم پر حملہ کر دیا اس کے نتیجے میں جو صورت حال ہے وہ تمہارے سامنے ہے“۔ پھر وہ اٹھا اور باری باری مقتولین کے چہرے دیکھنے لگا اور پھر ہذیانی انداز میں چیخنے لگا۔ ”سب قتل ہو گئے بیوی، بچے، بچیاں، بھائی، والد، والدہ کوئی بھی تو نہیں بچا“۔

میں نے اسے تسلی دلاسا دیا اور مشورہ دیا کہ ہمیں یہاں سے جلد از جلد نکل جانا چاہیے۔ دوسرے زخمی چیخ و پکار کر رہے تھے لیکن ہم ان کی کسی قسم کی مدد کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ ہم نے لاشوں اور زخمیوں کے سامان سے کھانے پینے کا سامان اکٹھا کیا اور ہندو غنڈوں سے بچنے والی کچھ رقم اور زیور اپنی جیبوں میں ڈالا اور اندازے سے ایک طرف چل پڑے۔ ابھی ہم تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ دیکھا دو آدمی گھوڑوں پر سوار ہماری طرف بڑھے چلے آ رہے تھے۔ جب وہ ہمارے قریب آئے تو ہم انہیں دیکھ کر گھبرا گئے۔ وہ دونوں سکھ تھے اور پولیس یا فوج کی وردی میں تھے، میں نے اپنی تلوار جو میں نے ایک مقتول مسلمان کے سامان سے احتیاطاً لے لی تھی، جلد سے چھپانے کی کوشش کی لیکن ان دونوں نے دیکھ لی پھر انہوں نے ہماری طرف قہر آلود نظروں سے دیکھا اور گھوڑوں سے نیچے اتر آئے اور ایک چیخ کر بولا۔

”اوئے تم دونوں مسلے (مسلمان) ہو؟“ اور پھر انہوں نے کرپانیں نکال لیں اور ہم پر حملہ آور ہو گئے لیکن میری پہلوانی کام آ گئی، میں نے پوری قوت سے ایک سکھ کو ڈنڈ لگایا وہ قلابازیاں کھاتا ہوا دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ دوسرا کرپان سے مجھ پر حملہ آور ہوا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کرپان کا وار کرتا میں نے پوری قوت سے تلوار اس کی گردن پر دے ماری اس کا سر اس کے دھڑ سے علیحدہ ہو کر تربوز کی طرح دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ دوسرے نے ابھی پوری طرح اپنے آپ کو سنبھالا بھی نہیں تھا کہ میں اس کے سر پر پہنچ گیا اور اُسے دو تین ٹھنڈے لگائے اور تلوار ہوا میں لہرائی اور پھر ایک بھرپور وار اس کے مونڈھے پر کیا اس کا بازو کٹ کر زمین پر گر پڑا۔ پھر میں نے دوسرا وار اس کے دوسرے کاندھے پر کیا اس کا دوسرا بازو بھی جسم سے الگ ہو کر زمین پر گر پڑا۔ میں اسے تڑپا تڑپا کر مارنا چاہتا تھا لیکن ہمارے پاس وقت کم تھا۔ تیسرا وار میں نے اس کی گردن پر کیا، اس کا سر جسم سے علیحدہ ہو تو نہ ہوا لیکن وار کارگر تھا اس کی شاہ رگ کٹ گئی تھی اس کے بچنے کے کوئی چانس نہیں تھے۔ پھر ہم نے ان کی تلاشی لی اور کافی رقم ان کی جیبوں سے ہمارے ہاتھ آئی۔ پھر ہم گھوڑوں پر سوار ہوئے اور نامعلوم منزل کی طرف چل پڑے۔

سورج غروب ہونے کو تھا جب میرا ساتھی اچانک گھوڑے سے گر پڑا، میں گھوڑا روک کر اس کے پاس آیا اس کی پسلیوں سے خون بہہ رہا تھا۔ میرے خیال میں اس کے زخم کھل گئے تھے۔ پھر اسے خون کی قے آئی ایک دو

ہچکیاں لیں اور اللہ کو پیارا ہو گیا۔ ظاہر ہے میں اس کے کفن دفن کا انتظام نہیں کر سکتا تھا، میں نے اس کی لاش کو بے گور و کفن چھوڑا اور اپنے والا گھوڑا جو ذرا کمزور تھا اس کی جگہ دوسرا گھوڑا لیا اور ان دیکھی راہوں پر چل پڑا۔ میرا گھوڑا تھک چکا تھا۔ آدھی رات کے بعد میں گھوڑے سے نیچے اترا، رسے سے گھوڑے کے پاؤں باندھے اور اُسے چرنے کے لئے چھوڑ دیا اور خود زمین پر لیٹ گیا۔ جلد ہی نیند کی آغوش میں چلا گیا اور پھر میں اس وقت جاگا جب بہت سے لوگ مرد، عورتیں، بچے میرے قریب پہنچ چکے تھے۔ میں ہڑبڑا کر اٹھا۔ صورت حال معلوم کی تو پتہ چلا کہ مسلمان مہاجرین کا قافلہ ہے جو پاکستان کی طرف ہجرت کر کے جا رہا ہے، میں بھی اس قافلے میں شامل ہو گیا۔ ہم بخیریت پاکستان پہنچ گئے۔ میرا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا لہٰذا میں نے ایک خانقاہ پر ڈیرہ لگا لیا لیکن وہ خانقاہ اتنی مشہور نہیں تھی۔ آخر میں اس موجودہ خانقاہ پر پہنچا اور پھر اپنی شعبدہ بازیوں اور مکاریوں سے موتیوں والی سرکار بن گیا اور اب جو صورت حال ہے وہ تمہارے سامنے ہے۔

"نذیرا! مذہب کے نام پر لوگ جتنی جلدی بے وقوف بنتے ہیں اتنی جلدی اور کسی چیز سے نہیں بنتے۔ میں نے اپنی زندگی میں ہندو مذہب میں جو دھوکہ اور فراڈ دیکھا ہے اور کسی مذہب میں نہیں دیکھا اور ہماری یہ فقیری والی لائن ہندوانہ طریقے سے ملتی جلتی ہے۔ فرق بس اتنا سا ہے انہیں پتھر کے بت کھڑے کرنے پڑتے ہیں اور ہمیں قبر اور مزار کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجھے مولانا آزاد کی ایک بات یاد آ گئی جب انہوں نے نہرو کے سامنے ہندو مذہب پر تنقید کرتے ہوئے کہا تھا کہ تمہاری عقل میں اتنی بات بھی نہیں آتی کہ اپنے ہاتھوں سے تراشے ہوئے بتوں کو پوجتے ہو اور انہیں اپنا حاجت روا اور مشکل کشا مانتے ہو۔ تو نہرو نے جواب دیا تھا۔ مولانا ہم میں اور تم میں زیادہ فرق نہیں ہے۔" ہم کھنڈروں کو پوجتے ہیں آپ گڑھوں کو"۔

رکھے نے ایک گولی افیم کی نکالی، میں نے دودھ کا ایک بڑا پیالہ اسے بھر کر دیا اس نے گولی نگلی جلد ہی اس پر غنودگی طاری ہونے لگی۔

سالانہ میلا

رکھے کی داستان سن کر مجھے بہت لطف آیا، میں نے کہا۔ رکھے چالیس سال تُو نے کہاں گزارے اور ہندو جوگی تمہیں کیسے ملا۔ پھر یہ سانپ کا آنا جانا اور نظروں سے لوگوں کا شکار کرنا اور فقیری کے دوسرے گُر تُو نے کہاں سے اور کیسے سیکھے؟

"دیکھ نذیرا میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا"۔ رکھے نے کہا۔ "بلکہ تمہیں یہ سارے فن سکھا بھی دوں گا لیکن میلے کے بعد، اب صرف دو دن بعد میلہ لگے گا اور ان دو دنوں میں ہم فارغ نہیں ہوں گے"۔

"ٹھیک ہے رکھے!" میں نے اس کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

میلے کی تاریخ 16 ساون کو طے تھی لیکن رکھے کا پروگرام تھا کہ اس تاریخ کو بدل کر جیٹھ کے آخر کی کوئی تاریخ مقرر کی جائے کیونکہ ساون میں عموماً بارش ہو جاتی تھی اور بعض دفعہ میلے کی رونقیں ماند پڑ جاتی تھیں لیکن مجبوری یہ تھی کہ عام لوگ اس تاریخ سے ہی متعارف تھے اور لوگوں کے ذہن میں 16 ساون بیٹھ چکی تھی۔ اس دوران رکھا اپنی شعبدہ بازیوں اور مکاریوں کی وجہ سے کافی معروف ہو چکا تھا۔ اس کی پیری مریدی کا سلسلہ بھی کافی عروج پر تھا اور اس کی آمدنی بے حد و بے شمار ہو گئی تھی۔ لہٰذا اب اُسے جعلی کرنسی بنانے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اس کے متعلق ایک یہ بات بھی مشہور ہو چکی تھی کہ گوگا پیر کی روح اس میں سرایت کر گئی ہے۔ گوگا پیر کے

بارے میں عام لوگوں میں یہ مشہور تھا کہ سانپ اس کے حکم کے تابع رہتے ہیں۔ پھر لوگوں میں یہ بات بھی مشہور تھی کہ ہر جمعرات کو ایک بہت بڑا سانپ رکھنے کی خانقاہ سے ایک دوسری مشہور خانقاہ پر جاتا ہے جو وہاں سے کئی میل دور تھی اور کافی لوگوں نے ایک بہت بڑے اژدھے کو اس طرف جاتے دیکھا بھی تھا۔ بہرحال اس قسم کے کئی واقعات رکھنے کے بارے میں مشہور ہو چکے تھے اور وہ اس علاقے کا بے تاج بادشاہ بن چکا تھا اس کی خانقاہ سے ہزاروں لوگ فیض یاب ہو چکے تھے اور اُن کی دلی مرادیں پوری ہوئی تھیں۔ کئی لڑکیاں اور عورتیں ذاتی طور پر بھی اس سے فیض یاب ہو چکی تھیں جو میلے والے دن بن سنور کر آتی تھیں۔ رانجہ اندر تو بچارو رکھنے کے پاسنگ بھی نہیں ہوگا۔ ہندو جوگی کے بتائے ہوئے سنیاسی نسخے اُسے کسی میدان میں کبھی ہارنے نہیں دیتے تھے۔ اس کی شیطانی اور حیوانی طاقت سے میں بخوبی آگاہ تھا لیکن وہ خود عذاب الٰہی میں گرفتار ہو کر ایک خوفناک اور شرمناک بیماری میں گرفتار ہو گیا تھا جس کا تذکرہ میں پیچھے کر چکا ہوں۔

''اچھا نذیر! ان باتوں کو چھوڑ''۔ میں نے کہا۔ ''اور میلے کے بارے میں بتا''۔

''ہاں قاری صاحب! میں ادھر ہی آ رہا ہوں۔

جس دن صبح میلہ شروع ہونا تھا اس رات کو ساری رات ڈھول بجانے والوں نے مسلسل ڈھول بجائے۔ ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا کہ عورتیں نذر و نیاز لے کر خانقاہ میں پہنچنا شروع ہو گئیں۔ روٹ، مرغ اور بکرے سینکڑوں آ کی تعداد میں آنے شروع ہو گئے جو خانقاہ سے ذرا ہٹ کر ایک بہت بڑے احاطے میں جس کے گرد چاردیواری تھی، خدمت گزاروں نے وصول کر کے کھلے چھوڑ دیئے۔ یہ خدمت گزار رکھنے کے مرید تھے جو ثواب سمجھ کر یہ کام سرانجام دے رہے تھے۔ عورتیں رکھنے کے

سامنے نذر پیش کرتیں پھر اُسے سلام کرتیں کئی اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتیں کئی اس کی مٹھی چاپی شروع کر دیتیں۔ رکھا ایک شانِ بے نیازی سے ایک گندی گالی بکتا اور کہتا حرام کارو دوسروں کی باری بھی آنے دو۔ عورتیں بے اختیار کہتیں بسم اللہ کریئے!

مکافاتِ عمل

رکھے نے مجھے کہا۔ نذیرا تو اٹھ جا اور خدام سے کہہ کر گندم کے رکھنے کا انتظام کر کیونکہ اب لوگ گدھوں پر گندم لاد کر بھی نیاز لا رہے تھے۔ میں نے چند نوجوانوں کو گودام نما ایک کمرہ دکھایا اور انہیں حکم دیا کہ گندم اس کمرے میں رکھی جائے۔

"ٹھیک ہے بادا جی!" انہوں نے جھک کر بڑے ادب سے کہا۔

پھر میں واپس رکھے کی طرف چل پڑا کیونکہ میلے کا اصل لطف تو رکھے کے پاس تھا ابھی میں چند قدم ہی گیا تھا کہ میری نظر ایک پیکرِ حسن پر پڑی۔ چھ فٹ قد، موٹی آنکھیں، پتلی اونچی ناک قلم کی طرح ترچھی ہوئی تلوار سے تیز، چاندی رنگ، کمر کے نیچے تک لہراتی ہوئی چوٹی جیسے کالی ناگن، یاقوتی ہونٹ جو اس کے چاندی رنگ چہرے پر مبالغہ کی حد تک سجے ہوئے تھے۔ اس کا انگ انگ نسوانی حسن کا شاہکار تھا۔ میرے قریب آئی اور مجھے جھک کر سلام کیا۔

"موتیوں والی سرکار! میں آپ کی زیارت کے لئے آئی ہوں"۔ شاید وہ پہلی مرتبہ آئی تھی۔ میں نے مناسب نہ سمجھا کہ اُسے اصل موتیوں والی سرکار کا پتہ بتاؤں کیونکہ رکھا اس قسم کے نازک پھولوں کو مسل دیا کرتا تھا۔ اس کے جسم میں زار روس کے راسپوٹین کی روح سرایت کر چکی تھی پتہ نہیں عورتوں کے لئے اس میں کون سی کشش تھی کہ وہ شمع پر پروانوں کی طرح اس کے گرد منڈلایا کرتی تھیں۔ رابعہ جس کے عشق نے مجھے دین و دنیا سے بیگانہ کر دیا تھا اس لڑکی کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھی گو رابعہ اب بھی میرے دل میں بسی ہوئی تھی لیکن اگر کوئی مجھے اختیار دیتا اور میرے بس میں ہوتا تو میں رابعہ کے مقابلے میں اس لڑکی کو ترجیح دیتا اس کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ یکدم یہ لڑکی میرے حواس پر کیوں چھا گئی تھی۔ میرے خیال میں مرد کی شیطانی فطرت ہے کہ وہ جس عورت سے فائدہ اٹھا لیتا ہے پھر وہ اس کی نظر سے گر جاتی ہے اور پھر وہ دوسری اور تیسری کی جستجو میں جت جاتا ہے اس لئے کسی گھاگ دانشور نے یہ مقولہ تخلیق کی ہے کہ "جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے"۔ مرد شکاری ہے اور عورت شکار اور شکاری کو حق حاصل ہے کہ اپنے شکار کو قابو کرنے میں جیسا چاہے حربہ اختیار کرے لہٰذا یہ ذمہ داری شکار پر آتی ہے کہ وہ اپنا دفاع کرے۔ یقین کریں قاری صاحب! مرد جتنی بزدل جنس دنیا کے تختے پر موجود نہیں بشرطیکہ عورت اپنا دفاع کرنا جانتی ہو کیونکہ غلط روی کی ابتدا عموماً عورت کی طرف سے ہوتی ہے اگر عورت کسی مرد کو دھتکار دے تو یہ دُم دبا کر بھاگ جائے گا۔ ہاں بعض دفعہ مرد عورت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر زبردستی پر بھی اتر آتا ہے لیکن یہ شاذ و نادر ہوتا ہے۔ عموماً عورت کی طرف سے حوصلہ افزائی اس گیدڑ کو شیر بنا دیتی ہے۔

بہرحال میں اس قتالہ عالم کو ایک حجرے میں لے گیا اور اس سے خانقاہ پر آنے کی وجہ پوچھی تو وہ کہنے لگی۔ موتیوں والی سرکار شادی کو دو سال ہو گئے ہیں لیکن ابھی تک گود ہری نہیں ہوئی، سنا ہے آپ کی دعاؤں میں بہت تاثیر ہے اس لئے نیاز لے کر آپ کے قدموں میں حاضر ہوئی ہوں۔

"ٹھیک ہے بالک!" میں نے اس کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "لیکن اس کے لئے ہمیں خوش

کرنا ہوگا"۔

"سرکار! آپ جس طرح خوش ہوں گے میں کروں گی"۔ اُس نے کہا۔ "آج بھی میں نیاز لے کر حاضر ہوئی ہوں اگلی جمعرات مزید نیاز لے کر آؤں گی"۔

"دیکھو بالک ہم نیاز سے خوش نہیں ہوتے"۔

"سرکار! آپ جس طرح خوش ہوتے ہیں میں اس طرح کرلوں گی"۔

"اوہ پھر سمجھو تمہاری دلی مراد پوری ہوگئی ادھر ہمارے قریب آؤ"۔ وہ میرے قریب ہوگئی میں سمجھا کہ مچھلی جال میں پھنس چکی ہے لیکن جب میں نے اس سے چھیڑ چھاڑ کرنے کی کوشش کی تو اس کے سفید رخساروں پہ یکدم گلابی رنگ چڑھ گیا اور پھر وہ گہرا گلابی ہوگیا پھر ایسا محسوس ہوا کہ ابھی رخساروں سے خون بہہ نکلے گا۔ پھر وہ بولی تو اس کی آواز میں ہلکے ارتعاش کے ساتھ خود اعتمادی غصے اور تذبذب کی کیفیت تھی کہنے لگی۔

"سرکار! آپ کو یہ حرکات زیبا نہیں ہیں میں یہاں سائل بن کر آئی ہوں عزت برباد کروانے نہیں اور دیکھو جب میں نے عزت گنوالی تو بچے کا کیا فائدہ؟ یہ جسم میرے سر کے سائیں کی امانت ہے، میں بچے پر بھی لعنت بھیجتی ہوں اور تم پر بھی"۔ ادھر اس کی جسمانی ساخت اور حسن کی گٹھری اوپر سے انکار ان چیزوں نے میرے تن بدن میں آگ لگادی۔ قاری صاحب میں حلفیہ کہتا ہوں کہ اس جیسی جوان، طاقتور، طویل القامت، خوبصورت لڑکی نے میں نے زندگی میں پہلے دیکھی تھی نہ آج تک کہیں نظر آئی ہے میں کسی قیمت پر موقع گنوانا نہیں چاہتا تھا۔

"بالک ادھر دیکھو!" میں نے کہا تو اس نے غیر اختیاری طور پر میری طرف دیکھا اور پھر میری نظروں کے حصار میں جکڑی گئی۔ پھر وہ میرے اشاروں پر ناچنے کے لئے مجبور بے بس تھی۔ پھر میں دروازہ بند کر کے رکھے کے پاس پہنچا وہ عورتوں کے جھرمٹ میں بیٹھا نذریں وصول کر رہا تھا، میں اس کے قریب گیا اور اس کے کان میں کہا۔ رکھے تیرے لئے ایک ہیرا کمرے میں بند کر آیا ہوں خدا کی قسم تُو دیکھے گا تو پاگل ہو جائے گا اتنی حسین لڑکی تُو نے آج تک نہیں دیکھی ہوگی اٹھ جلدی کر وقت کم ہے یہ موقعہ پھر ہاتھ نہیں آئے گا۔ رکھے کی رال ٹپکنے لگی وہ میرے ساتھ چل پڑا میں نے کمرے کا دروازہ کھولا تو رکھے کی آنکھیں تاڑے لگ گئیں۔

"اوئے نذیرا تم نے ٹھیک کہا ہے کیا یہ اسی دنیا کی عورت ہے؟"

"ہاں رکھے! میری دریافت پر تمہیں کوئی شک ہے؟"

"نذیر دروازہ بند کر دو کوئی دیکھ لے گا، لوگوں کا رش بہت زیادہ ہوتا جا رہا ہے"۔ رکھا کمرے میں داخل ہوگیا میں نے اوپر سے کنڈی لگا دی۔ ذرا ہی دیر بعد رکھے نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا اور بلند آواز سے کہنے لگا نذیر جلدی سے دروازہ کھول میں نے جونہی دروازہ کھولا۔ رکھے نے ایک کراٹے دار ڈنڈ میری گردن پر لگایا میں قلابازیاں کھاتا ہوا دور جا گرا یہ پہلا موقع تھا کہ رکھے نے مجھے مارا تھا۔ میرے حواس پراگندہ ہوگئے۔ ابھی میں پوری طرح سنبھلا بھی نہیں تھا کہ رکھا میرے قریب آیا مجھے گریبان سے پکڑ کر اوپر اٹھایا اور ایک زوردار چپت میرے منہ پر رسید کی مجھے دن کو تارے نظر آنے لگے پھر وہ بجلی کی طرح کڑک کر کہنے لگا۔

"بے حیا تمہیں پتہ ہے وہ لڑکی کون ہے؟"

"نہیں رکھے! مجھے معلوم نہیں"۔

"او ظالم وہ جنت ہے میری پھپھو کی بیٹی"۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا لیکن میں نے ہمت کر کے کہا۔ رکھے بھلا مجھے کیا معلوم تھا"۔

ہاں یہ تو ٹھیک ہے"۔ رکھے نے بڑے قلق کے

ساتھ کہا۔

"دیکھو رکھے! اب جو ہونا تھا وہ ہو گیا گزرا وقت بھی کبھی ہاتھ آیا ہے؟"

"لیکن نذیر! ایسا نہیں ہونا چاہئے تھا وہ تاسف بھرے لہجے میں بولا۔

"رکھے تُو جو سزا دینا چاہتا ہے مجھے دے لے"۔

"میں تمہیں کون سی سزا دوں تُو نے وہ جرم کیا ہے جس کی سزا بھی تجویز نہیں کی جا سکتی"۔ پھر یکدم میرے دماغ نے پلٹا کھایا میری ریڑھ کی ہڈی میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور میرے گال پر جیسے کسی نے آگ کا انگارہ رکھ دیا ہو میں نے غصے اور جوش کی حالت میں کہا۔

"دیکھ رکھے! جن عورتوں اور لڑکیوں کے ساتھ تُو بے دھڑک گناہ کیا کرتا تھا وہ بھی تو کسی کی بیٹیاں، بہنیں ہی ہوتی ہیں اُس وقت تیری غیرت کہاں چلی جاتی ہے۔ جب تُو شیطانی کھیل کھیلتا ہے اور بے حیائی کرتا ہے۔ اُس وقت تیری غیرت جوش میں کیوں نہیں آتی؟ یاد رکھ رکھے جو کسی کی ماں بہن کی عزت سے کھیلتا ہے اس کی اپنی عزت بھی محفوظ نہیں رہتی۔ بتا تُو نے کتنی نازک کلیوں کو مسلا ہے اور اب بھی اس بڑھاپے میں بھی تجھے شرم نہیں آتی۔ میں تیرے کرتوت لوگوں کے سامنے بیان کر دوں تو تیری اولیائی کا لبادہ تار تار ہو جائے گا۔ اب تُو جنت کی لٹی ہوئی عزت کا ماتم کر میں تجھ پر تین لفظ بھیج کر ابھی یہاں سے جا رہا ہوں"۔

رکھے کو جب کام بگڑتا نظر آیا تو اس کی غیرت جھاگ کی طرح بیٹھ گئی وہ منت سماجت پر اتر آیا اور مجھے منانے کی کوشش کرنے لگا گو اسے وقتی طور پر ابال آیا تھا لیکن خبیث اور بے غیرت انسان جلد ہی کئی جواز ذہن میں پیدا کر لیتا ہے۔ زانی انسان ایک ایسا بے غیرت حیوان ہے جو خود اپنے ہاتھ سے اپنے گھر کی طرف زنا کا راستہ بناتا ہے۔ میں تھوڑے سے تذبذب کے بعد جلد ہی مان گیا کیونکہ اس ناپاک ماحول سے میں خود بھی نکلنا نہیں چاہتا تھا لیکن ذرا سا موڈ بنانے پر رکھے کے عتاب سے بھی بچ گیا اور آئندہ کے لئے رکھا بھی مزید محتاط ہو جائے گا۔

جنت حجرے کے دروازے پر کھڑی ہونقوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی اس کا دماغ ابھی کام نہیں کر رہا تھا۔ اس خیال کے ساتھ ہی میرے دل کے صد ہزار ٹکڑے ہو گئے کہ جنت ابھی چلی جائے گی مجھے اس انسان پر جلن اور اور حسد ہونے لگا جو اس کے جسم و جان کا مالک تھا۔ وہ صرف خوب صورت ہی نہیں خوب سیرت بھی تھی یہ کوئی مردانگی نہیں تھی کہ اسے بے بس کر کے اس کی عزت برباد کر دی جائے وہ اب بھی پاک تھی کیونکہ اس کا دل پاک تھا۔ پھر وہ ٹکٹکی ٹکٹکی ہماری طرف بڑھنے لگی اور ہمارے قریب آ کر رکھے کو ور سے دیکھنے لگی پھر اس کے ہونٹ ہلے اور کہنے لگی۔

"موتیوں والی سرکار میں نے اس سے پہلے کہیں آپ کو دیکھا ہے مجھے ایسا یاد پڑتا ہے جیسے آپ میرے والد ماجے پہلوان کے جنازے پر ہمارے گھر آئے تھے اور میرے والد اور والدہ کی میتوں کا دیدار کیا تھا"۔

"نہیں بالک! تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے ہم کبھی کسی کے جنازے میں شریک نہیں ہوئے"۔

"ہاں ہو سکتا ہے مجھے غلط فہمی ہوئی ہو"۔

"بالک تمہارا نام کیا ہے؟"

"موتیوں والی سرکار! میرا نام جنت ہے"۔

"تم یہاں کیوں آئی ہو؟"

"سرکار! آپ کی دعا لینے آئی ہوں میری شادی کو دو سال ہو گئے ہیں لیکن ابھی گود ہری نہیں ہوئی"۔

"تمہاری شادی کہاں ہوئی ہے؟"

اس نے ایک گاؤں کا نام لیا۔ وہ گاؤں ہماری خانقاہ سے زیادہ دور نہیں تھا۔

"ٹھیک ہے بالک! ہم تمہارے لئے دعا کریں گے لیکن ہماری کچھ شرائط ہیں اگر تم وعدہ کر لو کہ ہماری شرائط پر عمل کرو گی تو تمہاری گود ہری ہو جائے گی"۔

"سرکار! میں ہر شرط ماننے کے لئے تیار ہوں بشرطیکہ میرے سر کے سائیں کی حق تلفی نہ ہو"۔

"نہیں کچھ نہیں ہوگا"۔

"پھر بتائیں سرکار!"

پہلی شرط تو یہ ہے کہ تم آئندہ پوری زندگی کسی خانقاہ یا کسی مجاور کے پاس نہیں جاؤ گی اگر تم نے ایسا کیا تو پھر ہماری دعا بے اثر ہو جائے گی اور دوسری شرط یہ ہے کہ جب تمہاری گود ہری ہو جائے تو پھر بھی نذر نیاز لے کر اس خانقاہ پر نہیں آنا بلکہ گاؤں کی مسجد میں جو توفیق ہو حصہ ڈال دینا یا کسی بیوہ یا یتیم کو حسب توفیق رقم ادا کر دینا اور اگر تم ساری زندگی کسی خانقاہ پر گئی تو تمہاری اولاد مر جائے گی اور ہمیشہ بے اولاد رہو گی۔ بتاؤ میری یہ شرطیں منظور ہیں؟"

"جی موتیوں والی سرکار! میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں اور آپ کو زبان دیتی ہوں۔ آپ نہیں جانتے میں جس باپ کی بیٹی ہوں وہ بھی زبان کا پکا تھا اگر آپ میری والدہ کو دیکھ لیتے تو اس کے چہرے پر حیا کی چادر اور نیکی کا نور آپ کو ضرور نظر آتا"۔ اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو گرنے لگے۔ رکھے کی آنکھوں میں بھی ساون اتر آیا اور رکھے نے مجھے کہا۔ نذیر ادھر حجرے سے دواؤں والا تھیلا لے کر آؤ۔ جب میں واپس آیا تو رکھے نے جنت کو کچھ دوائیں دے کر اچھی طرح سے سمجھا دیا کہ کون کون سی دوا اس کے خاوند نے کھانی ہے اور کون کون سی اس نے خود کھانی ہے۔

"اچھا اب تم جاؤ اور میری باتوں پر عمل ضرور کرنا"۔

"موتیوں والی سرکار! یہ میرا آپ سے وعدہ ہے"۔ پھر اس نے نیاز پیش کی اور دوائی کی قیمت پوچھی۔ رکھے نے کہا۔ دیکھو بالک ہم تم سے نیاز نہیں لیں گے اور دوائی کے پیسے بھی نہیں لیں گے اور یہ ہمیں آرڈر ہوا ہے ہم پیرو مرشد کے حکم کے خلاف نہیں کر سکتے۔

"لیکن سرکار! میں کوئی غریب نہیں ہوں ہم پر اللہ کا بہت فضل ہے"۔

"ٹھیک ہے لیکن ہمیں مرشد کا جو اشارہ ہوا ہے ہم اس کے خلاف نہیں کر سکتے"۔

اب جنت لاجواب ہو گئی رکھے نے تھیلے سے دونوں ہاتھوں میں بھر کر روپے نکالے اور جنت سے کہنے لگا۔ بالک! جھولی پھیلاؤ یہ بھی میرے مرشد کا حکم ہے جنت نے جھولی پھیلائی اور رکھے نے روپے اس کی جھولی میں انڈیل دیئے پھر اس کے سر پر شفقت سے پیار دیا اور اسے جانے کی اجازت دے دی۔ وہ سلام کر کے چلی گئی۔ جوں ہی وہ خانقاہ سے باہر نکلی رکھا زمین پر بیٹھ گیا اور اپنا ایک بازو اپنی آنکھوں پہ رکھا پھر وہ اس قدر تڑپ کر رویا کہ میرا دل بھر آیا۔ پھر وہ کھڑا ہو گیا اور ایک کان میں شہادت کی انگلی دے کر ترنم سے یہ شعر پڑھنے لگا۔

پاسے پاسے گئی جوانی پاس نہ سدیا یاراں
ساتھی کون محمد بخشا! درد ونڈے غم خواراں
مان نہ کریئے روپ گھنے دا وارث کون حسن دا
سدا نہ رہن شاخاں ہریاں سدا نہ پھول چمن دا

خواہشات

☆ لامحدود خواہشات محدود زندگی کو عذاب بنا دیتی ہیں جبکہ انسان کی زندگی میں "صبر" اور "شکر" دونوں کا بڑا درجہ ہے کیونکہ صبر مصیبت کو ٹالتا ہے اور شکر نعمت کو بڑھاتا ہے۔

(نسیم، سکینہ صدف)

سدا نہ بھور ہمیشہ بھرن سدا نہ وقت اسن دا
مالی حکم کیوں نہ دیوے اج سیر کرن دا
سنگ دے ساتھی لدمی جاندے سال بھی سدا ساتھ لبدا
ہتھ نہ آوے فیر محمد جان ایہہ وقت وہاناں
گر شکاری کرے تیاری ہار چرندیاں ہرناں
جو چڑھیا اس ڈھینا اوڑک جو جمیا اس مرناں
پھوپھا، پھوپھی، والد سوہنا دے گئے داغ جدائی
جنت توں چھڈ دیتا اُتے وچہ جنت کرکے دھائی
پھوپھا جنت تیری میرے کول اج پروہنی آئی
شامت میرے عملاں والی دیتی اونہوں آئی

رکھے کی سریلی، بلند اور دل سوز آواز پر اس کے گرد ایک جم غفیر جمع ہو گیا۔ رکھا شاید اپنے حواس میں نہیں تھا میں نے آگے بڑھ کر رکھے کو بازو سے پکڑا اور بڑے ادب سے کہا موتیوں والی سرکار لوگ آپ کا دیدار کرنے کے لئے آئے ہیں آئیں اپنے آستانہ عالیہ میں تشریف رکھیں۔

لوگوں کی بہو، بیٹیوں کی عزت سے کھیلنے والا مکار، معصوم بچوں کا قاتل دھوکے باز، جب اپنے گھر کو آگ لگی تو حواس کھو بیٹھا لیکن موقع اور صورت حال کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے جلد ہی حواس پر قابو پا گیا۔ عقیدت مند جھک جھک کر سلام کر رہے تھے اور وہ ایک شان بے نیازی سے واپس اپنے حجرے کی طرف چل پڑا۔ میلہ اب اپنے پورے جوبن پر آ گیا تھا ہزاروں کی تعداد میں عقیدت مند اور تماش بین پہنچ چکے تھے۔ مختلف دکانیں سج چکی تھیں۔ کھیل تماشے والے اپنے اپنے کرتب دکھانے میں مصروف تھے۔ خانقاہ کو چومنے چاٹنے والے اپنے کام لگے ہوئے تھے، روٹ، مرغے، بکرے، سینکڑوں من گندم اور نقدی کے انبار لگ گئے تھے۔ فالودے کی دکانوں پر بچوں کا رش تھا۔ مٹھائی کے شوقین جلیبی سے شوق پورا کر رہے تھے۔ عصر سے ذرا پہلے کبڈی کا پروگرام بھی تھا۔ وقت مقررہ پر مختلف علاقوں کی ٹیمیں میدان میں اتریں شائقین کبڈی سے دل بھر کر لطف اندوز ہوئے لیکن ابھی میلے کا سب سے اہم اور دلچسپ پروگرام رات کو ترتیب دیا گیا تھا اور وہ موسیقی کا پروگرام تھا ملک کے مشہور گانے والے اور گانے والیاں آئی ہوئی تھیں لوگ بڑی شدت سے وقت کا انتظار کر رہے تھے۔

اقبال بانو عرف بالو کنجری

گانے والیوں میں بالو کنجری سب سے معروف اور مشہور تھی۔ خوبصورت نین نقش کے علاوہ اتنی سریلی کہ سامعین کا دل موہ لیتی تھی۔ اس زمانے میں گانے والی کو کنجری اور سازندوں کو کنجر کہا جاتا تھا۔ ان میں نقال اور بھانڈ بھی تھے جو اپنی باری پر مختلف جگتیں کر کے لوگوں کو ہنساتے تھے۔ بالو کنجری کی جو صفت عوام میں مشہور تھی وہ یہ تھی کہ وہ شرم و حیا سے بالکل پاک تھی۔ مردوں کے مجمعے میں بے دھڑک اپنے فن کا مظاہرہ کرتی جس شخص سے روپیہ وصول کرتی اس کی گال پر چٹکی ضرور بھرتی۔ مجمعے میں سے جب کوئی روپیہ دکھاتا تو کئی کئی مردوں کے اوپر سے چھلانگ لگا کر متعلقہ آدمی تک پہنچ جاتی۔ بالو نے کئی گیت گائے اور کئی لوگوں کی جیبیں خالی کیں۔ پھر اس نے مخصوص انداز میں ڈانس کیا اس کے سر پر پانی کی چاٹی بھر کر رکھ دی گئی اب صرف وہ اپنی کمر ہلا رہی تھی جبکہ دوسرے اعضاء بالکل ساکن تھے۔ حتیٰ کہ پانی سے لبالب بھری چاٹی سے ایک قطرہ پانی باہر نہ نکلا۔ رکھا اور میں گاؤ تکیوں کے سہارے زمین پر ہمارے لئے بچھائے گئے مخصوص قالین پر بڑی شان سے بیٹھے محظوظ ہو رہے تھے۔

بالو شاید تھک گئی تھی اس نے ایک نوجوان لڑکے کی طرف اشارہ کیا جس کے بال شانوں تک لٹکے ہوئے تھے وہ چھٹانے کر کھڑا ہو گیا اور پھر اس نے اپنے مخصوص

انداز میں چمٹا بجا کر گانا شروع کیا۔

ملاں جی تیرے ویکھنے نوں جوگی اتر پہاڑوں آیا

بھیگی رات میں اس کی سریلی آواز سے مجمع مسحور ہو گیا۔ ظالم نے ایسا لہجہ پایا تھا کہ لوگوں کی آنکھیں تارے لگ گئیں وہ جب خاص انداز سے بالوں کو جھٹکا اور آواز کے زیر و بم کے ساتھ چمٹے کی آواز کو ہم آہنگ کرتا تو لوگوں کے ہاتھ غیر ارادی طور پر جیبوں میں چلے جاتے اور پھر لوگوں نے اس پر روپوں کی بارش شروع کر دی۔۔ رکھا دونوں ہاتھوں سے اس پر روپے نثار کر رہا تھا۔ اس کی سریلی آواز اور انداز بیان نے لوگوں پر جادو کر دیا۔ بالو کنجری کے اندر شیطان حلول کر گیا وہ آگے بڑھی اور اسے سینے سے لگا کر دھمال شروع کر دی اب پورے مجمعے پر شیطان مسلط ہو گیا تو جوانوں نے آوازے کسنے شروع کر دیئے تینوں شیطانی ہتھیار ایک جگہ جمع ہو گئے تھے۔ آواز و ساز اور حسن، دوسرے کنجر سمجھ گئے کہ پورے مجمع پر شیطانی اور شہوانی ماحول مسلط ہو گیا ہے یہ نقصان دہ بھی ہو سکتا تھا لہذا انہوں نے بھانڈوں کو اشارہ کیا۔ بھانڈ اپنی مخصوص اور مضحکہ خیز آوازوں سے مجمعے کو اپنی طرف متوجہ کرنے لگے۔

بھانڈوں نے اپنی جگتوں سے بے شمار روپے لوٹے۔ پھر بالو کنجری شوخ میک اپ اور بھڑکیلے لباس میں نمودار ہوئی۔ گیس کی روشنی میں میک اپ اور بھڑکیلے لباس میں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے بالو کنجری ابھی ابھی کوہ قاف سے آئی ہے۔ گیسوں میں دوبارہ تیل ڈالا گیا اور ہوا بھری گئی جس سے ان کی روشنی اتنی بڑھ گئی کہ دن کا گمان ہونے لگا۔ اب بالو رکھے کے سامنے کھڑی ہو گئی اس نے پاؤں میں گھنگھرو باندھے ہوئے تھے اس نے کمر مٹکائی اور پہلے ایک پاؤں کو مخصوص انداز میں زمین پر مارا گھنگھروؤں کی آواز گونجی پھر باقاعدہ ڈانس کرنے لگی وہ اپنے پاؤں اس ترتیب سے زمین پر مارتی کہ ایسا محسوس ہوتا جیسے گھنگھرو اس کے حکم اور منشا کے مطابق بج رہے ہیں۔ ذرا دیر بعد چمٹا بجانے والا لڑکا اس کے قریب آیا اس نے چمٹے کی آواز گھنگھروؤں کے ہم آہنگ کر دی تو ایک سماں بندھ گیا اب بالو کنجری نے سُر باندھی اور رکھے کی جگنی گانے لگی۔

میری موتیاں والی سرکار
لاندی ڈبے بیڑے پار
اس کدی نہ منی ہار
اوئے پیر میریا جگنی
میری جگنی دے دھاگے بگے
جگنی اوہدے مونہوں سجے
جنہوں سٹ عشق دی لگے
اوئے پیر میریا جگنی
سائیں بوہڑاں والیا جگنی
دم گٹکوں گٹکوں جی سائیاں
تالے گھر گھر بونیاں توں لائیاں

رکھے کے عقیدت مندوں نے بالو کنجری پر روپوں کی بارش کر دی۔ رکھا اس کے قریب آیا اس نے دونوں ہاتھوں میں روپے بھرے ہوئے تھے پھر اس نے بالو کے سر پر سارے روپے نچھاور کر دیئے۔ بالو بجلی کی تیزی سے پیچھے ہٹی اور پھر ایک خاص انداز میں مٹکتی ہوئی رکھے کے بالکل قریب آ گئی اس نے ایک گھٹنا زمین پر ٹیکا اور سر کو اتنی تیزی سے گھمانے لگی کہ اس کا پراندہ رکھے کے چہرے پر پڑنے لگا۔ پھر وہ ایک جھٹکے سے کھڑی ہوئی اور سُر میں کہنے لگی ساتھ ہی وہ ایک ہاتھ سے رکھے کی طرف اشارہ بھی کر رہی تھی۔

ایہہ موتیاں والی سرکار
کیڈا سوہنا ایدا دربار
ہانجھوں بچھڑدا جنہوں اک وار
بیڑا ہو جاندا اوہدا پار

اوئے سائیں میریا جگنی
میں منگتی اہدے در دی آں
نالے خادم اہدے گھر دی آں
متھا اہدے قدماں تے دھر دی آں
اوئے رب میریا جگنی

رکھا دونوں ہاتھوں سے دولت لٹانے لگا۔ نذر میں آئی ہوئی ساری دولت ایک کنجری پر لٹا دی پھر اپنی انگلیوں سے سونے کی انگوٹھیاں اتار کر بالو کو اپنے قریب بلایا اور اپنے ہاتھ سے انگوٹھیاں اس کو پہنا دیں۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی ابھی ہیر رانجھے کا سوانگ باقی تھا پوری ٹیم بالکل تیار تھی۔ چوچک، ملکی، کیدو، ہیر، رانجھا، سہتی تمام مشہور کردار اکھاڑے میں پہنچ چکے تھے۔ ہیر کا کردار بالو کنجری نے خود ادا کرنا تھا۔ جب کہ سہتی کا کردار کرنے کے لئے ایک خوبصورت نوجوان لڑکی اکھاڑے میں نمودار ہوئی کہ اچانک دو نوجوان لڑکے پیچھے سے بھاگتے ہوئے اکھاڑے کی طرف آئے۔ ایک نوجوان نے سہتی کو کمر سے پکڑا اور کندھوں پر ڈال کر تیزی سے بھاگ نکلا دوسرا لڑکا اس کے ساتھ تھا یہ سب اتنی جلدی میں ہو گیا کہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا سب لوگ ششدر و حیران کھڑے دیکھ رہے تھے۔ سہتی کی چیخیں کچھ دیر تک سنائی دیتی رہیں پھر وہ بھی بند ہو گئیں۔ کچھ نوجوان اندازے سے اس طرف کو بھاگ نکلے جس طرف وہ دونوں لڑکے سہتی کو اٹھا کر بھاگے تھے لیکن سہتی کا کوئی سراغ نہ مل سکا پتہ نہیں اسے زمین نگل گئی تھی یا آسمان کھا گیا تھا۔ بالو کنجری بلند آواز سے رو رہی تھی ہائے میری بیٹی پھر اس پر غشی کے دورے پڑنے لگے۔ اب کافی لوگ چاروں طرف پھیل گئے۔ رات کا اندھیرا گہرا تھا اس لئے سہتی کی تلاش بہت مشکل ہو گئی تھی۔

کافی دیر تلاش کرنے کے بعد کچھ لوگ خالی ہاتھ واپس آ گئے لیکن ابھی کچھ نوجوانوں نے تلاش جاری رکھی تھی کہ اچانک انہیں ایک کماد کے کھیت سے آہوں اور سسکیوں کی آواز آئی وہ کھیت میں داخل ہو گئے اور آواز کے رخ پر آگے بڑھتے چلے گئے آخر وہ سہتی کے قریب پہنچ گئے۔ ان کے پاس ٹارچ وغیرہ کا انتظام نہیں تھا ایک نوجوان نے ماچس کی تیلی جلائی اور سہتی کے لباس اور میک اپ سے سمجھ گئے سہتی ہی ہے لیکن ظالم درندے اپنا کام کر گئے تھے۔ سہتی نیم بے ہوشی کی حالت میں تھی ایک نوجوان نے اسے کندھے پہ ڈالا اور واپس خانقاہ کی طرف چل پڑے سہتی کی آہیں ختم ہو چکی تھیں شاید وہ خوف کی وجہ سے دوبارہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ خانقاہ کے قریب پہنچ کر ایک نوجوان نے زور سے آواز لگائی موتیوں والی سرکار، سہتی مل گئی ہے بالو کنجری دوڑتی ہوئی آواز کی طرف لپکی ایک آدمی گیس لیمپ لئے ہوئے اس کے پیچھے گیا جب بالو نے سہتی کی حالت دیکھی تو کربناک آواز میں بین کرنے لگی۔ ہائے لوکو میں لٹی گئی۔

"بالو رونا بند کر اور خدا کا شکر ادا کر کہ سہتی زندہ مل گئی"۔ کسی نے کہا۔

بالو نے دونوں ہاتھوں کو اپنی رانوں پر مارا اور کہنے لگی۔ "اس سے مر جاتی تو بہتر تھی۔ ہائے لوگو..... تم نہیں جانتے میرا کتنا نقصان ہوا ہے میری زندگی کی ساری کمائی ضائع ہو گئی ہے"۔

"ہم تیرا نقصان پورا کر دیں گے"۔ موتیوں والی سرکار نے کہا۔

"نہیں موتیوں والی سرکار! میرا نقصان آپ پورا نہیں کر سکتے"۔

"اچھا رونا دھونا چھوڑ اور بچی کو ہوش میں لانے کی کوشش کر"۔ کچھ دیر بعد سہتی کو ہوش آ گیا۔ ظاہر ہے اب پروگرام نہیں ہو سکتا تھا لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ چند خادم اور بالو کے ساتھ آنے والے سازندے، بھانڈ اور دو لڑکیاں باقی رہ گئیں۔ رکھے نے بالو کنجری

سے کہا۔ بالو بتا تیرا کتنا نقصان ہوا ہے تا کہ میں وہ پورا کر دوں۔

''موتیوں والی سرکار! آپ میرا نقصان پورا نہیں کر سکتے بس میں نصیبوں جلی اپنی سزا کو پہنچ گئی مجھے ہستی کی عزت لٹنے کا کوئی افسوس نہیں پہلے ہماری کون سی عزت محفوظ ہے لیکن مجھے افسوس یہ ہے کہ ہستی کی عزت غلط لوگوں نے لوٹی ہے۔ ابھی تو میں نے اس کی نتھ کھلائی کی رسم ادا کرنی تھی کئی راجے اور نواب اس کی بولی لگا چکے تھے۔ ایک نواب پچاس ہزار بولی دے چکا تھا لیکن میں نے ابھی ہاں نہیں کی تھی''۔

''بالو! نتھ کھلائی کیا ہوتی ہے؟''

''موتیوں والی سرکار! ان معاملات کو آپ نہیں سمجھتے یہ ہمارے خاندانی رسم و رواج ہوتے ہیں''۔

''لیکن ہمیں بتانے میں کیا حرج ہے؟'' رکھنے نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

''سرکار! نتھ کھلائی یہ ہوتی ہے کہ ہم اپنی بیٹیوں کو جن کے باپوں کا کوئی پتہ نہیں ہوتا لیکن ہمیں پتہ ہوتا ہے کہ اس کا باپ فلاں آدمی ہے، جب وہ چھوٹی عمر میں ہوتی ہیں تو ہم اُن کے ناک میں سونے کی ایک تھلی ڈال دیتے ہیں جو اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ یہ لڑکی اب جوان ہونے والی ہے پھر ہم اس کی حفاظت کرتے ہیں کہ کوئی مرد اس کے قریب نہ جائے اور یہ بات راجاؤں اور نوابوں تک پہنچ جاتی ہے کہ فلاں بائی نے ایک لڑکی کو نتھ پہنائی ہوئی ہے۔ پھر بڑے بڑے راجے اور نواب بولی لگاتے ہیں۔ بس جو زیادہ بولی دے وہ نتھ کھلانے کا حقدار بن جاتا ہے اور اس کام میں ہم مکمل ایمانداری سے کام لیتے ہیں کہ بالکل سچا اور صاف مال اسے مہیا کریں۔ بس وہ نواب پہلی دفعہ اس کی زندگی میں داخل ہوتا ہے اور اس طرح اس کی نتھ کھلائی کی رسم ادا ہوتی ہے۔ جب اس کی نتھ اتار دی جاتی ہے تو بس پھر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اب یہ کلی نہیں پھول بن چکی ہے''۔

''اچھا یہ بات ہے''۔ رکھنے نے کہا۔

''سرکار! میری بڑی بیٹی کی نتھ کھلائی پچاس ہزار روپے میں ہوئی تھی''۔ بالو کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ''سرکار! ہمیں بے غیرت کہنے والے خود ہم سے بھی بڑے بے غیرت ہیں۔ میں جب جوانی کی سرحد میں داخل ہوئی تو میری بائی نے میری نتھ کھلائی ایک ریاست کے نواب سے کرائی تھی۔ میں ابھی چھوٹی عمر میں تھی نواب پچاس سال سے کسی طرح کم نہیں ہوگا پورے بازار حسن میں مجھ سے زیادہ خوبصورت اور کوئی لڑکی نہیں تھی۔ پچاس ہزار روپیہ کوئی معمولی رقم ہوتی ہے؟ میں سب کچھ اپنی جان پر سہہ گئی لیکن میرے دل میں اس نواب کے لئے نفرت اور انتقامی جذبہ پیدا ہو گیا تھا اور پھر میں نے اس سے ایسا انتقام لیا جس کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ وہ نواب مجھ پر لٹو ہو چکا تھا آخر میں نے اسی نواب سے ایک بیٹی کو جنا۔ وہ بڑی بیٹی اسی نواب کی ہے اور پھر جب میں نے بڑی بیٹی کی نتھ کھلائی کی رسم ادا کی تو اسی نواب کا بیٹا میرا مہمان بنا اور اپنی سگی بہن کی نتھ کھلائی کی۔ اس رات میں بہت خوش تھی۔ میں نے بڑے نواب سے انوکھا انتقام لے لیا تھا اور اب ہستی کے ساتھ اگر یہ واقعہ پیش نہ آتا تو ایک بے وفا سے وہ انتقام لیتی کہ انسانیت کانپ جاتی۔ وہ واحد شخص تھا جو میرے دل کو پسند آیا تھا میں نے بائی سے اس کا ذکر کیا تو میری بائی نے ماتھے پر تیوڑی چڑھائی اور غضبناک انداز میں کہنے لگی۔

''بالو! عشق ہمارا شیوہ نہیں اگر گھوڑی گھاس سے پیار کرے گی تو کھائے گی کیا؟ کنجری کی اولاد کسی سے عشق کرے کبھی آج تک نہ سنا نہ دیکھا۔ خبردار! آئندہ جو ایسی بات منہ سے نکالی''۔

پھر میں نے اس نوجوان نواب زادے کو دل کے

بھید سے آگاہ کیا تو وہ کہنے لگا۔ بالو تم خوبصورت ہو نوجوان ہو لیکن ہو تو کنجری کی اولاد تم روپے مانگو جتنے مانگتی ہو میں دوں گا لیکن تمہیں باعزت طریقے سے اپنا لوں یہ خیال بھی دل سے نہ لانا۔ ستی اس نواب زادے کی بیٹی ہے اور اسی نواب زادے نے اپنی بیٹی کی قیمت پچاس ہزار روپے لگائی ہے مگر افسوس میری یہ سکیم کامیاب نہ ہو سکی"۔ بالو نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔

"دیکھ بالو!" رکھے نے مکارانہ انداز میں کہا۔ "میں تمہیں پچاس ہزار روپے ادا کر دیتا ہوں"۔

"نہیں سرکار! اب اس کی اتنی قیمت نہیں رہی نصف قیمت پر میرا اور تمہارا سودا پکا ہے"۔

"مجھے منظور ہے"۔ رکھے نے جلدی سے کہا اور پھر ستی ہمارے پاس رہی۔

جب دن چڑھا تو میں نے بالو کنجری اور بھانڈوں، کنجروں کو دیکھا تو مجھے متلی سی ہونے لگی۔ اُن کے جسموں سے اٹھنے والی گھٹیا میک اپ اور چرس ملے سگریٹ کے دھوئیں کی ملی جلی بُو سے میرا دماغ پھٹنے لگا۔ بالو کنجری کا بے نور اور جھریوں بھرا چہرہ جسے میک اپ کی تہوں نے چھپا رکھا تھا۔ دانتوں پر پان کے گندے سرخ و زرد داغ، مردانہ آواز، مصنوعی چوٹی وہ ہیجڑہ نما عورت نظر آ رہی تھی۔ گیس کی روشنی، گہرے میک اپ، بھڑکیلے لباس، لمبی مصنوعی چوٹی کے پس پردہ جوانوں کے دلوں پر راج کرنے والی بالو دن کی روشنی میں کسی چڑیل سے کم نہیں تھی۔ میرے دل سے بالو کی رات والی شخصیت گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب ہو گئی۔ کاش! دوسرے تماش بین بھی اسے دن کی روشنی میں دیکھ لیتے تو بالو کی اداؤں پر آہیں نہ بھرتے البتہ ستی اور اس کی بڑی بہن عمر کے اس حصے میں تھیں جس میں بدصورتی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بالو بھی کبھی خوبصورت ہو گی لیکن اب کھنڈرات میں تبدیل ہو چکی تھی لیکن اس کی ہاں کی ہوس اور ہوس ابھی جوان تھی جو وہ دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہی تھی۔

بالو نے رات کا بقیہ حصہ رکھے کے حجرے میں گزارا تھا اور پھر وہ ناگن اُسے ڈس گئی رکھا نار فارسی (آتشک) میں مبتلا ہو گیا تھا۔ وہ ناپاک اور گندی عورت پتہ نہیں کتنے مردوں کو اس بیماری میں مبتلا کر چکی تھی۔ یہ بازاری عورتیں عموماً اس مرض میں مبتلا ہوتی ہیں اور ان سے یہ بیماری مردوں میں پھیلتی ہے۔ آج کے زمانے میں ایڈز جیسی موذی بیماری پھیلانے میں بھی ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ آپ انہیں بے شک خان صاحب اور میڈم کا نام دے لیں بھلا شراب کی بوتل پر شربت کا لیبل لگانے سے اس کی اصلیت تو نہیں بدل جاتی۔ گورنمنٹ نے بازار حسن ختم کر کے اس گندگی کو شہروں، محلوں، پوش علاقوں، ہوٹلوں اور شرفاء کے درمیان بکھیر دیا ہے یہ گندگی ایک جگہ پر ہی رہنی چاہیے تھی یا پھر اس کو جڑ سے مٹا دیا جاتا جو موجودہ حالات میں ناممکن ہے لیکن رکھا ایک ماہر سنیاسی تھا اس نے ہندو جوگی سے طلسماتی نسخے سیکھے ہوئے تھے لہٰذا وہ جلد ہی بیماری پر قابو پا گیا۔ ادھر میں جنت کے عشق میں مبتلا ہو گیا تھا اس کے خیالات مجھے کسی پل چین نہیں لینے دے رہے تھے۔ وہ رکھے کی پھوپھی کی بیٹی تھی لہٰذا میں اس کے متعلق رکھے سے بات نہیں کر سکتا تھا۔ ایک دن جوشِ جنون میں بھیس بدلا درویشانہ لباس پہنا اور رکھے سے سیر کرنے کی اجازت مانگی۔ سیر کو فقیری زبان میں ٹہل کہتے ہیں اور اس کا مطلب ہوتا ہے کہ کسی گاؤں میں جا کر خانقاہ کے نام پر نیاز مانگی جائے، رکھے نے مجھے اجازت دے دی میں سیدھا جنت کے گاؤں پہنچا لیکن دیدارِ معشوق میسر نہ ہو سکا۔ میں بے دلی سے واپس آ گیا جب میں خانقاہ میں پہنچا تو رکھا اور ستی دونوں غائب تھے۔

(رکھا اور ستی کہاں گئے؟...... شمارہ ستمبر "سالگرہ نمبر" میں ملاحظہ فرمائیں)

ڈاکو اور ڈپٹی کمشنر

اس انگریز ڈپٹی کمشنر کا قصہ جس نے ڈاکوؤں کو اپنے گھر میں ڈاکہ ڈالنے کا چیلنج دے رکھا تھا۔

عاشق حسین

یہ کہانی مجھ سے تقریباً بیس سال بڑے ایک دوست نے سنائی تھی۔ میری عمر اس وقت ساٹھ کے لگ بھگ ہے۔ یہ واقعہ پاکستان بننے سے بہت پہلے کا ہے۔ اس نے اپنے باپ سے سنی تھی۔ اس وقت لوگوں کی صحتیں بہت اچھی ہوتی تھیں۔ چائے، سگریٹ اور بناسپتی گھی کا نام ونشان تک نہ تھا۔ اکثر لوگ پیدل ہی سفر کرتے تھے۔ وہ زمانہ جوانمردوں اور بہادروں کا تھا۔ لوگ ایسے ایسے بہادری کے کارنامے کرتے تھے کہ موجودہ دور میں ناممکن نہیں تو مشکل ضرور محسوس ہوتے ہیں۔

انگریزوں کا راج بڑے زوروں پر تھا۔ قتل یا ڈکیتی وغیرہ کی واردات ہو جاتی تو لوگ بھی تفتیش میں بڑی دلچسپی لیتے اور پولیس بھی دل و جان سے اصل مجرموں تک پہنچنے کی پوری پوری کوشش کرتی تھی۔ اُس زمانے میں گاؤں میں پولیس کا سپاہی آ جاتا تو ہر طرف خبر پھیل جاتی کہ تھانہ آیا ہوا ہے، خدا خیر کرے، کوئی خاص بات ہے کہ حکومت کا آدمی آیا ہے۔

ایک انگریز ڈپٹی کمشنر نیا نیا انگلینڈ سے ضلع راولپنڈی میں تعیناتی کے لئے آیا۔ جب بھی کوئی انگریز افسر ہندوستان میں آتا تو اسے ہندوستان کی مختلف قوموں کے بارے میں مکمل معلومات دی جاتی تھیں تاکہ وہ تاج برطانیہ کے لئے اچھی طرح حکومت اور کنٹرول کر سکے۔ اس انگریز ڈپٹی کمشنر کو بتایا گیا کہ یہاں ہندوستان میں بڑی بڑی عجیب قسم کی وارداتیں ہوتی ہیں جن میں ڈاکے اور چوریاں وغیرہ شامل ہیں۔ ان کا کھرا یا کھوج

لگانا بڑا ہی مشکل کام ہوتا ہے۔ بعض وارداتیں اس قدر دلیرانہ قسم کی ہوتی ہیں کہ انسان دنگ رہ جاتے ہیں۔

نئے ڈپٹی کمشنر نے ایس پی کو جو انگریز تھا، کہا کہ میرے بنگلے پر چوبیس گھنٹے پولیس کی مسلح گارد موجود رہتی ہے۔ میرے پاس دو خونخوار کتے چوکیداری کے لئے رات کو کھلے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی میرے علاقے میں پولیس گشت پر رہتی ہے۔ بتیاں بھی ساری رات جلتی رہتی ہیں۔ کیا ایسے حالات میں بھی چور میرے بنگلہ سے چوری کر کے جا سکتا ہے؟

ایس پی نے جواب دیا کہ ان تدابیر کے باوجود چوری کا امکان ہو سکتا ہے۔

"میرا ذہن نہیں مانتا"۔ انگریز ڈی سی نے کہا۔ "اتنے سخت انتظامات کے ہوتے ہوئے بنگلے کے قریب بھی کوئی آنے کی جرأت کر سکے، چہ جائیکہ بنگلے کے اندر آ کر کوئی چیز چوری کر کے نکل جائے"۔

انگریز کی حکومت اور پولیس کی دہشت بھی اتنی زیادہ تھی کہ رات کے وقت تو کیا دن کے وقت بھی کوئی اس طرف جانے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ ڈی سی کے اصرار پر ایس پی نے کہا کہ اگر آپ ہندوستانی قوم اور خاص کر مسلمان کو آزمانا چاہتے ہیں تو اخبار یا اشتہار کے ذریعہ آزما کر خود تجربہ کر لیں۔

آخر یہ طے ہوا کہ ایک اشتہار دیا جائے کہ ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر کے بنگلے کے اندر سے جو کوئی آدمی چوری کر کے نکل جائے گا اس کو پانچ صد روپیہ نقد انعام دیا جائے گا۔ اگر وہ پولیس اور کتوں کے ہاتھوں مارا گیا تو وہ خود ذمہ دار ہوگا۔ اگر موقع پر نہ مارا گیا یا گرفتار نہ ہوا تو اسے پیش ہونے پر پانچ سو روپیہ نقد انعام دیا جائے گا اور گرفتار بھی نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی سزا دی جائے گی۔

اشتہار نکلے تقریباً دو ماہ سے زائد عرصہ گزر چکا تھا۔ بات اڑتے اڑتے چکوال کے درمیانی علاقے میں پہنچ گئی۔ آدمی کا اصل نام تو مجھے یاد نہیں رہا۔ آپ فرضی نام امیر باز رکھ لیں۔ اس آدمی کا نام دس نمبر میں لکھا ہوا تھا۔ یہ چھوٹے چھوٹے جرائم میں مشہور تھا۔ گاؤں کے باہر چوپال پر اکثر لوگ فارغ وقت میں بیٹھ کر گپ شپ لگایا کرتے تھے۔ امیر باز بھی اس وقت وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ جب ڈی سی کے اشتہار کے بارے میں بات ہو رہی تھی۔ امیر باز خاموشی سے سنتا رہا۔ اس نے پوچھا کہ دو ماہ گزرنے کے بعد بھی چوری کی نیت سے ڈی سی کے بنگلے پر کسی کے جانے کی کوئی خبر بھی ملی ہے یا نہیں۔ ایک آدمی نے بتایا کہ اگلے ہی دن پنڈی سے ایک سرکاری آدمی جو کہ ہمارے گاؤں کا ہے، چھٹی پر آیا ہوا تھا۔ اس نے بتایا کہ ابھی تک کسی کو وہاں جانے کی جرأت نہیں ہو سکی۔ یہ تو موت کے منہ میں جانے کے برابر ہے۔

امیر باز نے مصمم ارادہ کر لیا کہ میں مر جاؤں گا یا انگریز ڈپٹی کمشنر کو ایسا سبق دوں گا کہ زندگی بھر یاد رکھے گا۔ چونکہ وہ دس نمبریہ تھا، اس لئے اس کو اپنا گاؤں چھوڑنے سے پہلے اپنے نمبردار، چوکیدار کو مطلع کرنا پڑتا تھا۔ وہ اس واردات کو کم سے کم وقت میں مکمل کرنا چاہتا تھا۔ لہٰذا اس نے اس سکیم پر عمل کرنے کے لئے سوچنا شروع کر دیا۔ کتوں کے لئے اس نے بیلوں کے دو سینگ تلاش کئے جن میں خالص گھی کی روٹی کی چوری بنا کر سینگوں میں اچھی طرح بھر دی تاکہ کتوں کی کوشش کے باوجود چوری آسانی سے نہ نکل سکے۔

اس زمانے میں سوائے ریل کے آنے جانے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ لہٰذا عام لوگ چالیس چالیس کوس پیدل چلتے تھے۔ ہمارے علاقہ کے لوگ جہلم اور گوجر خان تک پیدل ہی سفر کرتے تھے۔ امیر باز صبح سویرے نمبردار کو ملا تاکہ اسے معلوم ہو کہ امیر باز گاؤں میں موجود ہے۔ چکوال سے راولپنڈی کا رستہ بہ نسبت سڑک کے پیدل کا نزدیک ہے۔ امیر باز پچھلے پہر ڈی سی کے بنگلے کا جائزہ

لینے کے لئے راولپنڈی پہنچ گیا۔

اس نے سنتریوں کو ڈیوٹی پر گشت کرتے دیکھا۔ بنگلے کی باہر کی دیوار عام آدمی کی کمر تک اونچی تھی۔ جیسا کہ اُس وقت عام بنگلوں کی ہوتی تھیں۔ دیوار کے اندر سنگتروں کی باڑ لگی ہوئی تھی۔ اس کے صحن یا لان کے اندر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پھولدار پودے لگے ہوئے تھے۔ بنگلے کے چاروں طرف برآمدے تھے۔ برآمدوں کے تقریباً چار چار فٹ چوڑے ستون تھے۔ امیر باز کو اندر جا کر کوئی بھی چیز اٹھا لے جانی تھی اور یہ ثابت کرنا تھا کہ ہندوستان میں ایسی قوم بھی رہتی ہے جو اتنی دلیر ہے کہ جان کی پروا کئے بغیر ہر چیلنج قبول کرنے کے لئے تیار ہو جاتی ہے۔

آخر آدھی رات کے وقت وہ بنگلے کی باہر کی دیوار کے ساتھ جا کر بیٹھ گیا اور سنتریوں کا جائزہ لینے لگا۔ کتوں کو بھی دیکھا جو کوٹھی کے لان میں اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔ سب سے پہلے اُس نے دونوں سینگ جن میں خالص گھی کی روٹی کی خوشبو تھی، اندر کی طرف بڑے آرام کے ساتھ رکھ دیئے۔ خود دس بارہ گز دیوار کے آگے کی طرف سے سرک گیا۔ کتوں نے جو خوشبو سونگھی تو وہ سینگوں میں سے چوری نکالنے میں لگ گئے اور سینگوں کو گھسیٹتے گھسیٹتے کافی فاصلے پر لے گئے۔ اب اُس نے سنتریوں کو دیکھا جو کل چار تھے، وہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد برآمدے کے باہر ایک دوسرے کو کراس کرتے تھے۔ انہوں نے رائفلیں اٹھا رکھی تھیں مگر معلوم ایسا ہوتا تھا جیسے اب وہ سمجھ چکے ہیں کہ یہاں آنے کی کوئی جرأت نہیں کر سکتا۔ چیلنج کئے ہوئے عرصہ دو ماہ سے زائد گزر گیا تھا۔ اس لئے وہ کچھ سست بھی ہو گئے تھے۔

بہرحال امیر باز اللہ کا نام لے کر دیوار کے اندر جا کر پودوں کی اوٹ میں بیٹھ گیا۔ وہ اس موقع کی تلاش میں ہی تھا کہ جونہی سنتری تھوڑے غافل ہوں تو وہ برآمدے کے اندر چلا جائے۔ یہ موقع جلد ہی میسر آ گیا۔ سنتریوں کی پیٹھ ایک دوسرے کے مخالف تھی۔ امیر باز چھلاوے کی طرح اُچھل کر برآمدے کے ستون کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔

امیر باز درمیانے قد کا آدمی تھا۔ بدن میں بلا کی چستی کے علاوہ دوڑ میں اتنا تیز کہ دوڑتے ہوئے بالکل چھلاوہ نظر آتا تھا۔ اُسے یہ یقین تھا کہ واردات کے بعد بنگلہ کی حدود سے نکل گیا تو پھر سنتریوں کا باپ بھی اُسے نہیں پکڑ سکتا تھا۔ دوسرا موقع ملتے ہی وہ بنگلے کا جالی والا دروازہ کھول کر کمرے کے اندر چلا گیا۔ لکڑی کا دروازہ کھلا تھا۔ تمام جائزہ لینے کے بعد بنگلے کے وسطی کمرے کے قریب پہنچ کر اُس نے دیکھا کہ درمیان میں بہت بڑا پلنگ بچھا ہوا ہے اور مدھم لائٹ جل رہی ہے۔ پلنگ پر ایک طرف صاحب اور دوسری طرف میم صاحبہ سوئی ہوئی تھی۔ اس کمرے میں لکڑی کی بنی ہوئی بڑی بڑی دو تین الماریاں پڑی ہوئی تھیں اور چمڑے کے سوٹ کیس بھی تھے۔ اُس نے ایک سوٹ کیس کو کھولا تو اس میں چاندی کے روپے پڑے ہوئے تھے۔ اُس وقت لوٹ نہ ہونے کے برابر تھے۔ اُس نے خاموشی سے اپنی کمر کے ساتھ بندھی تہبند کے پلو میں چاندی کے روپے ایک ایک کر کے رکھنے شروع کر دیئے جب پلو بھر گیا تو اُس نے اچھی طرح گانٹھ باندھ لی۔ اب وہ نکلنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اس کی نظر میم صاحبہ کے ہار پر پڑ گئی جو اُس کے گلے میں پڑا ہوا تھا اور اُس کے موتی مدھم روشنی کے باوجود چمک رہے تھے۔ اُس نے سوچا کہ وہ ہار اتارنے میں کامیاب ہو جائے تب ہی چیلنج کا صحیح جواب ہو گا۔

میم اور صاحب گہری نیند سوئے ہوئے تھے، امیر باز نے مدھم روشنی میں دیکھا کہ ہار کی ہک میم کی گردن کی دائیں طرف لگی ہوئی تھی۔ اس نے دم سادھے ہار کے ہک کو کھولنے کی کوشش کی۔ ہک تو کنڈے سے

نکل گئی مگر میم نے سونے کی حالت میں اپنا ایک ہاتھ گردن پر الٹا پھیرا اور ساتھ ہی کروٹ بدل کر دوسرے پہلو ہو گئی۔ اب ہار نکل کر اسی کی گردن اور کندھے کے درمیان بستر پر پڑا ہوا تھا۔ امیر باز پلنگ کے نیچے ہو گیا۔ تقریباً پانچ منٹ گزرنے کے بعد اُس نے محسوس کیا کہ میم اب دوبارہ نیند میں ہو گئی ہے تب اس نے پلنگ کے نیچے سے نکل کر ہار کو آہستہ آہستہ کھینچنا شروع کر دیا حتیٰ کہ وہ ہار نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے وہ ہار اپنی تہبند کے دوسرے پہلو میں اچھی طرح کس کے باندھ لیا اور کمر کے ساتھ اپنی تہبند کو لپیٹ لیا۔ امیر باز اندر سے جالی والے دروازہ کے ایک سائیڈ پر کھڑا ہو کہ چند لمحے یہ دیکھتا رہا کہ سنتری کب ادھر اُدھر ہوتے ہیں۔

جلد ہی باہر نکلنے کا موقع مل گیا۔ وہ کمرے سے نکل کر برآمدے کے چوڑے ستون کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ اب اُسے لان اور باہر والی دیوار کو پھلانگنا تھا۔ کتے ابھی تک اپنی ناکام کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ وہ سینگوں سے پھوری نکال لیں۔ امیر باز نے اللہ کا نام لے کر موقع پاتے ہی دوڑ لگائی اور لان عبور کر کے دیوار پھاندی اور سڑک کراس کرتے ہوئے دوڑ پڑا۔

سنتری بیدار ہو گئے اور اندھا دھند گولیاں چلانے لگے۔ امیر باز پگڈنڈیوں کے رستوں سے بھاگ رہا تھا۔ وہ باقی رات اور سارا دن چلتا رہا اور دوسری رات دس گیارہ بجے اپنے گھر پہنچ گیا۔

اس واردات کے بعد جو حالات بعد میں اُس کو معلوم ہوئے وہ کچھ اس طرح ہیں کہ ڈپٹی کمشنر اور اُس کی میم جاگ پڑے۔ پہلے تو انہوں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ انہوں نے دیکھا کہ چاندی کے روپے سوٹ کیس سے غائب ہیں۔ انہوں نے معمولی سی چوری کو کوئی خاص اہمیت نہ دی مگر جونہی میم صاحب کو احساس ہوا کہ اُس کے گلے میں قیمتی ہار نہیں ہے تو اس نے اُودھم مچا دیا وہ عام قسم کا ہار نہیں بلکہ بڑا ہی قیمتی ہار تھا۔

ایس پی صاحب اور ضلع کے انگریز افسر اکٹھے ہو گئے۔ علاقے کا چپہ چپہ چھان مارا لیکن مجرم کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔ ڈی سی حیران تھا کہ اتنی بڑی احتیاطی تدابیر کے باوجود یہ دلیری کس شخص نے کی ہے۔ ڈی سی کہتا تھا کہ چور قیمتی ہار واپس کر دے اور وعدہ کے مطابق اس کو 5 سو روپیہ نقد انعام کے علاوہ سرٹیفکیٹ بھی دیا جائے گا۔ اشتہار دیئے گئے اور اخبار میں بھی خبر چھپوائی گئی۔ چھ ماہ گزرنے کے بعد بھی چور کا سراغ نہ مل سکا۔ اِدھر میم صاحبہ تنگ کر رہی تھی کہ ہر قیمت پر ہار واپس دلایا جائے۔ ہار کی فوٹو کاپی اور نقشے کی کاپی ہر تھانے میں بھجوائی گئی اور تاکید کی گئی کہ چوری کا سراغ لگانے والے کو بہت بڑی ترقی سے نوازا جائے گا۔

اِدھر امیر باز چوری کی ہوئی رقم سے اپنے گھر کے اخراجات چلاتا رہا۔ اس وقت چاندی کا ایک روپیہ آج کل کے دو سو روپوں کے برابر تھا۔ اُس کی صرف ایک بچی اور بیوی تھی اس لئے بغیر کام کے بڑے آرام سے دن گزر رہے تھے۔ اُس کا خیال تھا کہ خواہ مخواہ پیش ہو کر اپنے آپ کو جھنجھٹ میں کون ڈالے۔ ایسا نہ ہو کہ انگریز سرکار ہمیشہ کے لئے قید خانے میں ڈال دے۔ ہار اُس کی بیوی نے مٹی کی ایک ڈولی میں ڈال کر رکھا ہوا تھا جو لاپرواہی کی وجہ سے ٹوٹ گیا تھا۔ اُس کو معلوم ہی نہیں تھا کہ یہ بہت ہی قیمتی ہار ہے۔ ایک دن اُس نے ہار کے دو موتی نکالے اور قریب ہی قصبے میں سنار کے پاس لے گئی اور کہا کہ میری بچی کے لئے چھوٹی سی بالیاں بنا دو اور ان میں یہ دونوں موتی لگا دو۔

سنار نے جب موتیوں کو دیکھا تو اس نے امیر باز کی بیوی کو بتایا کہ یہ تو بہت قیمتی موتی ہیں۔ یہ تم نے کہاں سے لئے ہیں؟ اس نے جھوٹ بول کر کہا کہ میرا خاوند اپنے گاؤں کے قریب مٹی کھود رہا تھا، پرانے زمانے کی

کھائی ہے، وہاں سے یہ دونوں موتی ملے ہیں۔ میں نے سوچا کہ اپنی بچی کی بالیوں میں ڈلوالوں۔ اب میں یہ موتی تمہارے پاس لے آئی ہوں۔ سنار نے اس بیان کو صحیح سمجھ کر بالیاں بنادیں جو ماں نے اپنی بچی کے کانوں میں ڈال دیں۔

خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ بچی ایک دن مکان کے باہر بیٹھی رو رہی تھی۔ پولیس کا ایک حوالدار جو کسی تفتیش کے سلسلے میں نمبردار کے پاس آیا ہوا تھا، امیر باز کے گھر کے سامنے سے گزرا۔ بچی کے رونے کی وجہ سے نظر اس پر پڑی تو اس نے بچی کا حلیہ جو عام غریب کے بچوں کا ہوتا ہے، دیکھا۔ اس کی نظر اس کی بالیوں پر پڑی۔ موتی چمک رہے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ یہ عام موتی نہیں بلکہ کوئی خاص قسم کے موتی ہیں۔ اس نے نمبردار سے پوچھا کہ یہ بچی کس کی ہے۔ اس نے بتایا کہ یہ امیر باز کی بچی ہے جس کا نام دس نمبر میں ہے۔ حوالدار کو کچھ شک ہوا۔ اس نے بچی کو نزدیک جا کر دیکھا تو موتیوں کی شکل اس ہار کے موتیوں سے ملتی جلتی تھی جو کہ اُن کے پاس ڈی سی کی میم کے ہار کا نقشہ تھانہ میں بطور ریکارڈ پڑا ہوا تھا۔ اس نے امیر باز کو بلوایا اور کہا کہ یہ بالیاں تھانے لے جا رہے ہیں، کل تک تمہیں واپس کر دیں گے۔

مختصر یہ کہ موتی شناخت ہو گئے۔ امیر باز پہلے ہی مشکوک آدمی تھا لہٰذا اُسے فوراً تھانہ طلب کیا گیا۔ تھانیدار نے اُسے کہا کہ بہتر یہی کہ تم خود ہی اپنی زبان سے بتا دو کہ یہ موتی تم نے کہاں سے لئے ہیں ورنہ مار مار کر ہڈی پسلی ایک کر دوں گا۔ پہلے تو امیر باز نے آئیں بائیں کی مگر اس کو معلوم تھا کہ اُسے اس وقت تک نہیں چھوڑیں گے جب تک میں ان کو ان موتیوں کا ثبوت نہ مہیا کر دوں۔ چنانچہ اس نے واردات کا مکمل اعتراف کر لیا۔

تھانیدار بہت خوش تھا کہ اس نے بہت بڑا کیس پکڑا ہے جو اس کی ترقی کا باعث ہو گا۔ امیر باز کو راولپنڈی ایس پی کے سامنے پیش کیا گیا۔ فوراً ڈپٹی کمشنر کو اطلاع دی گئی کہ آپ کا ہار مل گیا ہے۔ یہ امیر باز کے گھر سے برآمد کر لیا گیا تھا۔ ڈی سی اور اُس کی میم نے فوراً اُن کو طلب کر لیا۔ جب انہوں نے امیر باز کا حلیہ اور ظاہری جسم وغیرہ دیکھا تو انہوں نے کہا کہ یہ ہار تو ہمارا ہی ہے مگر یہ چور ہمارا نہیں ہو سکتا۔ اس قسم کے آدمی کی اتنی جرأت ہو ہی نہیں سکتی کہ اتنی بڑی ہمت کر کے ہار گلے سے اتار کر لے جائے۔

ایس پی نے اس کو کہا کہ وہ اپنی زبانی تمام طریقہ واردات صاحب بہادر کو سنائے۔ امیر باز نے تمام کہانی سنائی اور جرح کا جواب مکمل طور پر دیا۔ یہاں تک بتایا کہ میم صاحبہ نے اس طرح اپنی گردن پر ہاتھ بھی پھیرا تھا جس وقت میں ہار اُتار رہا تھا۔ وہ حیران بھی ہوئے اور مکمل یقین بھی کر لیا کہ ہمارا ہار اسی شخص نے چرایا ہے۔

انگریز صاحب نے اُسے کہا کہ تم نے ہمیں سخت پریشان کیا ہے۔ اگر تم واردات کے فوراً بعد اطلاع دے دیتے تو ہمیں خوشی ہوتی مگر پھر بھی وعدہ کے مطابق تمہیں تنگ بھی نہیں کیا جائے گا۔ لہٰذا امیر باز کو باعزت طور پر بری کر دیا گیا اور تاکید کی گئی کہ آئندہ وہ باعزت زندگی گزارنے کی کوشش کرے۔

امیر باز نے آئندہ شریفانہ زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا۔ اسی سلسلے میں علاقے کے ایک بزرگ کے ہاتھ بیعت کرنی چاہی تو اس بزرگ نے اُسے کہا کہ بیعت تو میں تمہیں کر لیتا ہوں مگر تم وعدہ کرو کہ آئندہ چوری چکاری نہیں کرو گے۔ اس نے وعدہ کر لیا مگر چور چوری سے تو جا سکتا ہے ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔ کبھی کبھار موقع ملتا تو وہ چھوٹی موٹی واردات اور قفل شکنی کر لیتا۔ کسی نے اُن بزرگ شخصیت کو بتایا کہ امیر باز اب بھی چکر چلاتا رہتا ہے مگر موقع پر نہ پکڑے جانے کی وجہ سے بچ جاتا ہے۔ انہوں نے امیر باز کو بلایا اور کہا کہ آئندہ اگر کوئی ایسی

حرکت کی تو وہ خود ذمہ دار ہوگا۔

چند ہی دنوں بعد ایک ہندو کے گھر کا تالہ توڑا گیا جو قریب کے گاؤں میں رہتا تھا۔ گرمیوں کے دن تھے اور ہندو مع اہل خانہ چھت پر سو رہا تھا۔ ہندو کو شک ہوا کہ نیچے مکان میں کوئی آدمی ہے۔ اُس نے شور نہ مچایا بلکہ آہستہ آہستہ چھت سے اتر کر اُس کمرے کا باہر سے کنڈا لگا دیا جس کا کہ تالا ٹوٹا ہوا تھا۔ امیر باز اندر ہی تھا۔ ہندو نے شور مچانا شروع کر دیا۔ گاؤں کے چند آدمی لاٹھیاں لے کر ہندو کے گھر پہنچ گئے۔ پانچ چھ آدمی دروازہ کھول کر اندر گئے۔ لالٹین سے چارپائیوں کے نیچے دروازے سے آ کر دیکھنا شروع کر دیا۔ امیر باز پہلے ہی ہوشیار ہو چکا تھا۔ چنانچہ وہ گھڑونجی (جو رضائیوں وغیرہ رکھنے کے لئے اونچی جگہ بنائی ہوتی ہے) پر چڑھ کر چھت کے شہتیر کے کنڈے میں پاؤں کی انگلیاں پھنسا کر شہتیر کے ساتھ چھپکلی کی طرح چمٹ گیا۔ جونہی قصبے کے لوگ دروازے سے ذرا آگے چارپائیوں کے نیچے تلاش کرنے لگے تو وہ اوپر سے چھلانگ لگا کر باہر کی طرف دوڑ پڑا۔ صحن سے نکلنے کے بعد آدمی بھی اُس کے پیچھے دوڑ پڑے۔ باہر کھیتوں میں آگے آگے وہ دوڑ رہا تھا اور پیچھے پیچھے گاؤں کے آدمی دوڑ رہے تھے۔

ویسے تو اس کو پکڑنا مشکل تھا مگر اندھیرے کی وجہ سے ایک اونچی مینڈھ سے پاؤں ٹکرا گیا جس کی وجہ سے وہ گر گیا۔ اب وہ دوبارہ اٹھنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ پیچھے سے آدمی پہنچ گئے۔ پہلے تو اُس کی خوب ٹھکائی کی بعد میں اس کو تھانے لے گئے۔ کیس چلا، چھ ماہ سزا ہو گئی۔ اس کا کہنا تھا کہ میں نے بزرگوں کے ساتھ وعدہ خلافی کی ہے لہٰذا یہ سزا مجھے ملی ہے۔ سزا کاٹنے کے بعد اس نے شریفانہ زندگی بسر کرنی شروع کر دی۔ وہ بہت بوڑھا ہو کر فوت ہوا تھا۔

☆---------- 0345-1563185/E-mail.shahidkohler@gmail.com رزاق شاہد کوہلر

درِ زنداں

موم سے پتھر بن جانے والے ایک شریف النفس قبائلی نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت۔

میں جب دوبارہ ہوش میں آیا تو میں نے خود کو اسی صوفے پر پایا۔ ڈرائی فروٹ کی پلیٹ اور قہوے کا نصف کپ بدستور میرے عین سامنے سنٹرل ٹیبل پر رکھے ہوئے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر میں اُلجھن کا شکار ہوگیا۔ مجھے لگا جیسے میں بے ہوش ہوا ہی نہیں ہوں۔ مگر مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ قہوے کا نصف کپ پینے کے بعد میں بے ہوش ہوا تھا۔ بے ہوشی کا یہ وقفہ کتنا طویل تھا؟ اس بارے میں مجھے کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ میں نے ایسے ہی وال کلاک پر نظر ڈالی تو ٹھیک دس بجنے والے تھے۔ میری اُلجھن مزید بڑھ گئی کیونکہ یہ وہی وقت تھا جب بے ہوش ہونے سے قبل میں قہوہ پی رہا تھا۔ دونوں مسلح شخص بھی وہیں موجود تھے۔ جب کہ وہ غیر ملکی نظر آنے والا شخص اسی طرح صوفے پر عین میرے سامنے تشریف فرما تھا۔ مجھے اُلجھن میں اور پریشان دیکھ کر پہلے تو وہ مسکرایا، پھر بولا۔ ''کیا بات ہے شیر دل! آپ مجھے بہت پریشان نظر آرہے ہیں۔ کوئی اُلجھن ہے تو پلیز مجھے بتائیں؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں اُلجھن تو ہے مگر میں جانتا ہوں کہ آپ مجھے سچ نہیں بتائیں گے''۔

وہ بولا۔ ''بھئی! پہلے سوال تو کرو، جواب نہ ملے تو تب یہ شکوہ کرنا''۔

''کیا میں قہوہ پینے کے دوران بے ہوش ہوا تھا؟'' میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

اُس کے لبوں پر ایک پُراسراری ہنسی رینگ گئی۔

''نہیں''۔ اُس نے انکار میں سر ہلایا۔ ''آپ بالکل بے ہوش نہیں ہوئے تھے۔ یقین نہیں آتا تو اپنے سامنے رکھی قہوے کی پیالی چیک کرلو۔ مجھے یقین ہے کہ قہوہ ابھی تک گرم ہوگا''۔

میں نے پیالی کو چھوا تو وہ واقعی گرم تھی لیکن میرا شک پھر بھی دُور نہ ہوا، میں نے کہا۔ ''پیالی میں گرم قہوہ بھی تو ڈالا جاسکتا ہے؟''

''ہاں ایسا ہوسکتا ہے اگر آپ یہاں سے ہٹے ہوتے تو تب ورنہ آپ کی موجودگی میں یہ کیسے ممکن ہے؟''

''تو پھر مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ میں بے ہوش ہوا تھا؟''

وہ ہنس کر بولا۔ ''یہ اس قہوے کا کمال ہے کہ آپ کو ایسا لگتا ہے۔ ورنہ حقیقت میں ایسا کچھ بھی نہیں ہوا''۔

''مطلب قہوے میں کچھ ملا گیا تھا؟'' میں نے مشکوک انداز میں پوچھا۔

''نہیں''۔ اُس نے انکار میں سر ہلایا۔ ''یہ محض آپ کا وہم ہے قہوے میں کچھ بھی نہیں ملا گیا تھا۔ یہ اس قہوے کی تاثیر ہے کہ پہلی بار پینے والے کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ بے ہوش ہوگیا ہے مگر حقیقت میں ایسا کچھ بھی نہیں ہوتا بلکہ پینے والا پوری طرح ہوش میں رہتا ہے تاہم وقتی طور اُس کے دل و دماغ میں ہلچل ضرور رچ جاتی ہے۔ اگر آپ کو یقین نہیں آتا تو اب کی بار پی کر دیکھ لیں، اس بار آپ کو ایسا کچھ بھی محسوس نہیں ہوگا''۔

میں نے قہوے کی پیالی اُٹھا کر ایک بار پھر لبوں سے لگا لی اور گھونٹ گھونٹ کر سارا قہوہ پی گیا مگر اس

دعائے مغفرت

محترم رزاق شاہد کوہلر اور محترم ریاض عاقب کوہلر کے والد محترم 23 رمضان کو بہ حکم الٰہی وفات پا گئے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

اللہ مرحوم کو غریق رحمت کرے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ ادارہ اس عظیم صدمے پر ان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ قارئین سے اپیل ہے کہ وہ دعائے مغفرت فرما کر ثواب دارین حاصل کریں۔

(ادارہ)

بار مجھے کچھ بھی محسوس نہ ہوا حالانکہ قہوے کا ذائقہ اور خوشبو بھی وہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے یا پھر قہوہ بدل دیا گیا تھا؟ بہرکیف جو بھی تھا مجھے اُس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ لہٰذا میں نے موضوع بدل کر سوال کیا۔

''اوکے قہوے والی بات کو رہنے دو اور یہ بتاؤ کہ مجھے کس مقصد کی خاطر اغوا کیا گیا ہے، آپ کون ہیں اور مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟

وہ بولا۔ ''میرا نام داؤد خان ہے اور میں آپ کا ہمدرد ہوں''۔

''اس ہمدردی کا سبب جان سکتا ہوں؟ میں نے طنزیہ انداز میں سوال کیا۔

''آپ آم کھائیں پیڑ مت گنیں''۔ وہ لبوں پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولا۔ ''آپ کی تسلی کے لیے کیا یہ کافی نہیں ہے کہ میں آپ کا دوست ہوں، دشمن نہیں''۔

''یہ بھی خوب کہی...... دوست بھی بھلا کبھی یوں اغوا کرتے ہیں؟''

اُس نے چشمہ اُتارا دونوں شیشوں پر باری باری پھونک ماری اور پھر چشمہ دوبارہ چہرے پہ سجاتے ہوئے کہنے لگا۔ ''میں صمد یار خان کا دشمن ہوں، وہی صمد یار خان جس نے آپ کی توہین آمیز وڈیو فلمائی تھی''۔

میں نے کہا۔ ''آپ جب تک اپنے بارے میں مجھے سچ نہیں بتائیں گے میں آپ کی کسی بات پر یقین نہیں کروں گا۔ آپ صمد یار خان کے دوست بھی تو ہوسکتے ہیں؟''

''ٹھیک ہے''۔ اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''میرا نام تو آپ کو معلوم ہو ہی چکا ہے یعنی داؤد خان، آپ کی طرح میں بھی............''

''داؤد خان یا ڈیوڈ؟'' میں نے قطع کلامی کی۔

''ویسے مما مجھے ڈیوڈ ہی کہا کرتی تھی''۔ وہ مسکرایا۔ ''تاہم بابا جان چونکہ نسلاً پٹھان تھے اس لیے مما کی اس بات کا ہمیشہ بُرا منایا کرتے تھے۔ کبھی کبھار وہ مما کو ڈانٹ بھی دیا کرتے تھے، تب اُن دونوں کے بیچ بحث چھڑ جایا کرتی تھی۔ مما بابا جان سے کہتی کہ داؤد اور ڈیوڈ دونوں ایک ہی نام ہیں بس زبان اور لہجے کے فرق کی وجہ سے مختلف لگتے ہیں مگر بابا جان جو کہ معمولی سے پڑھے لکھے تھے، ہمیشہ مما کی ہر دلیل کو رد کر دیا کرتے تھے۔ مما کا تعلق انگلینڈ سے تھا جب کہ بابا جان ایک قبائلی پٹھان تھے۔ دونوں نے محبت کی شادی کی تھی مگر یہ محبت اُن دونوں کو راس نہ آسکی حالانکہ مما نے شادی سے قبل اسلام بھی قبول کر لیا تھا''۔ اتنا بتا کر وہ ایک دم خاموش ہوگیا۔

مجھے اُس کی کہانی دل چسپ لگی مگر اب وہ کھویا کھویا سا نظر آرہا تھا۔ اُس کے چہرے پر اذیت کے تاثرات تھے۔ یوں جیسے وہ بہت تکلیف میں ہو۔ شاید ماضی کی کرب انگیز یادوں نے اُسے گھیر لیا تھا۔ ایسی صورت حال میں اُس سے کچھ پوچھنا میں نے نامناسب خیال کیا۔ چند لمحوں کے لیے بالکل خاموشی چھا گئی۔ تب میں نے پہلی بار اپنے دل میں اُس کے لیے ہمدردی کے جذبات محسوس کیے۔ اُس نے ایک بار پھر چشمہ اُتار کر اپنی نم آلود پلکیں صاف کیں اور پھر مسلح گارڈز سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''تم دونوں باہر جا کر بیٹھ جاؤ، جب تک میں نہ بلاؤں کمرے میں مت آنا''۔

غلیظ دانتوں والے نے منہ کھولا۔ ''آپ رسک لے رہے ہیں جناب! یہ شخص بہت خطرناک اور عیار ہے۔ ہماری عدم موجودگی میں یہ آپ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرسکتا ہے۔ اس نے سلیم کو جس بے رحمی کے ساتھ قتل کیا ہے اُس کے بعد اس پر اعتبار کرنا......''

''دفع ہو جاؤ''۔ داؤد خان نے چلا کر قطع کلامی کی۔ ''میں نے جو حکم دیا ہے اُس پر عمل کرو''۔

اُسے غصے میں دیکھ کر دونوں گارڈ تیزی سے باہر نکل گئے۔ گارڈز کے جانے کے بعد اُس نے میری

طرف دیکھا اور پھر چہرے پر ایک زخمی سی مسکراہٹ طاری کرتے ہوئے بولا۔ "مجھے معلوم ہے کہ آپ میری داستان سننے کے لیے بہت بے تاب ہوں گے"۔

"ہاں بے تاب تو ہوں"۔ میں نے اثبات میں سرہلایا۔ "اگر آپ مناسب سمجھتے ہیں تو پھر میں آپ کی داستانِ حیات ضرور سننا چاہوں گا"۔

وہ بولا۔ "بہت دُکھ بھری داستان ہے۔ آپ خواہ مخواہ افسردہ ہو جائیں گے"۔

میں نے کہا۔ "میری افسردگی کو چھوڑو، آپ کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا"۔

"ہاں یہ بات تو ہے"۔ اُس نے تائیدی انداز میں سرہلایا۔ "دُکھ میں کسی دوسرے کو شریک کرنے سے دُکھ کا احساس آدھا رہ جاتا ہے"۔

"تو پھر سنائیے میں ہمہ تن گوش ہوں"۔

وہ بولا۔ "ٹھیک ہے مگر میری ایک شرط ہے؟"

"کیسی شرط؟" میں نے قدرے حیرت کا اظہار کیا۔

وہ بولا۔ "اب جب کہ ہم دونوں میں دوستی کا آغاز ہو چکا ہے تو کیا ہم اسی طرح ایک دوسرے کو آپ جناب کہہ کر مخاطب کرتے رہیں گے؟"

"ہاں واقعی ہمیں ان تکلفات میں نہیں پڑنا چاہیے اب ہم اجنبی نہیں رہے"۔ میں نے اُس کی تائید کرتے ہوئے جواب دیا۔

"گڈ یہ ہوئی ناں بات"۔ اُس نے خوشی کا اظہار کیا۔ "اب میں تمہیں اپنی داستانِ حیات ضرور سناؤں گا"۔

☆☆☆

"یہ آج سے تقریباً چالیس برس قبل کا ذکر ہے"۔ وہ صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔ "میں اُس وقت ابھی دنیا میں نہیں آیا تھا۔ ملک کے حالات اس قدر بُرے نہیں تھے جیسے آج کل ہیں۔ اُس دور میں انگلینڈ جانے کا بہت چاؤ تھا۔ خاص کر پٹھان لوگ تو اپنا گھر بار بیچ کر بھی ملک سے باہر جانے کے لیے تیار رہتے تھے۔ میرے بابا جان ایک ٹرک ڈرائیور تھے اور پشاور کراچی روٹ پر چلا کرتے تھے۔ وہ پشاور سے مال لے کر کراچی جاتے اور کراچی کا مال پشاور لایا کرتے تھے۔ کبھی کبھار تو وہ پشاور سے آگے افغانستان کے شہر جلال آباد تک بھی چلے جایا کرتے تھے۔ بابا جان کا نام احمد یار خان تھا جب کہ اُس سے ایک چھوٹا بھائی بھی تھا جس کا نام صمد یار خان تھا۔ احمد یار خان اپنے چھوٹے بھائی سے بے تحاشا پیار کرتے تھے اور اُسے پڑھا لکھا کر بڑا آدمی بنانا چاہتے تھے۔ دونوں کا باپ اُن کے بچپن میں ہی گزر گیا تھا۔ بس ایک بوڑھی ماں تھی اور وہ دو بھائی تھے۔ اُن کے دن نہایت ہی اچھے گزر رہے تھے۔ گھر میں اللہ کا دیا سبھی کچھ تھا۔ احمد یار خان کی تنخواہ اُن کی ضرورت سے زیادہ تھی۔ ویسے بھی وہ دور بہت سستا تھا۔ اس قدر ارزانی نہیں تھی جیسے آج کل ہے۔

اُن دنوں صمد یار خان میٹرک میں تھا جب احمد یار خان کے سر پر ملک سے باہر جانے کا بھوت سوار ہو گیا۔ سرما کے دن تھے، رات کے کھانے کے بعد جب وہ تینوں انگیٹھی کے گرد بیٹھے باتیں کر رہے تھے تو احمد یار خان بولا۔ "مور جان (امی جان) میں ملک سے باہر جانا چاہتا ہوں۔ یہاں میری محنت کا صلہ بہت کم ملتا ہے"۔

ماں نے کہا۔ "یاری خان! صلہ کم نہیں ملتا بلکہ تم ناشکرے ہو گئے ہو"۔ (ماں اُسے پیار سے یاری خان کہا کرتی تھی)

اُس نے کہا۔ "مور جان! تم جانتی ہو کہ میں صمد خان کو بڑا آدمی بنانا چاہتا ہوں۔ میرا یہ سپنا صرف اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے جب میں ملک سے باہر کہیں ملازمت کروں گا۔ یہاں رہ کر میں اپنے بھائی کے لیے

کچھ بھی نہیں کرسکوں گا۔ کیا تم نہیں چاہتی ہو کہ تمہارا صمد ایک دن بہت بڑا آدمی بن جائے؟"

وہ بولی۔ "صمد خان پڑھ تو رہا ہے اور تمہیں کیا چاہیے؟"

"دسویں پاس کرنے کے بعد جب وہ کالج میں جائے گا تو تب بہت خرچہ ہوگا۔ اُس وقت میری تنخواہ سے یہ خرچہ پورا نہیں ہوگا"۔ اُس نے دلیل پیش کی۔

"نہیں یاری خان!" ماں نے انکار میں سر ہلایا۔ "میں تمہیں پردیس جانے کی اجازت نہیں دے سکتی وہاں جو بھی جاتا ہے کبھی واپس نہیں آتا۔ میں تمہیں ہمیشہ کے لیے کھونا نہیں چاہتی"۔

وہ بولا۔ "مورجان! میں وعدہ کرتا ہوں کہ ہر سال چھٹی آیا کروں گا"۔

"وہاں جانے والوں کو وعدے یاد نہیں رہتے، تم بھی ہمیں بھول جاؤ گے"۔

"یاری خان اپنی ماں اور بھائی کو بھول جائے یہ ناممکن ہے۔ میں اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں جو پردیس کی رنگینیوں میں کھو کر خونی رشتوں کو بھول جاتے ہیں۔ کیا تمہیں اپنے یاری خان پر اعتماد نہیں ہے؟" اُس نے جوش کے عالم میں سوال کیا۔

"تم پر تو اعتماد ہے لیکن......" وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہوگئی۔

"لیکن کیا مورجان؟" اُس نے بے چینی کے عالم میں پوچھا۔

"وہاں کی عورتیں بہت چالاک ہوتی ہیں۔ ماؤں سے بیٹے اور بہنوں سے اُن کے بھائی چھین لیتی ہیں۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہ تمہیں بھی کوئی ایسی ہی عورت ہم سے چھین لے گی اور پھر میں اور صمد اکیلے رہ جائیں گے"۔ ماں نے دل میں چھپے خدشے کا اظہار کیا۔

"یہ تمہارا وہم ہے مورجان"۔ اُس نے قہقہہ لگایا۔

"میں یاری خان ہوں دنیا کی کوئی عورت مجھے تم لوگوں سے جدا نہیں کرسکتی، چاہے وہ انگریز ہی کیوں نہ ہو"۔

"جانے سے پہلے سب اپنی ماؤں سے ایسی ہی باتیں کرتے ہیں مگر وہاں جا کر انہیں یہ باتیں بھول جاتی ہیں"۔

"مورجان! اگر تم نے مجھے جانے کی اجازت نہ دی تو میں گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا"۔ اُس نے حتمی فیصلہ سنایا۔

"ہاں مورجان! لالہ ٹھیک کہتا ہے"۔ چھوٹے بھائی نے بھی اُس کی تائید کی۔ "انگلینڈ میں ایک ڈرائیور کو بہت اچھی تنخواہ ملتی ہے۔ ہمارے دن پھر جائیں گے، ہم کب تک گاؤں کے اس کچے اور ٹوٹے پھوٹے مکان میں رہیں گے؟"

دونوں بھائیوں کو متفق دیکھ کر ماں مجبور ہوگئی۔ ویسے بھی وہ ایک اَن پڑھ اور سادہ مزاج عورت تھی۔ بیٹے کو دلیل سے قائل نہیں کرسکتی تھی۔ شوہر زندہ ہوتا تو شاید اُس کا ساتھ ضرور دیتا، تب وہ یاری خان کو باہر جانے سے زبردستی بھی روک سکتی تھی۔ تاہم وہ کچھ سوچ کر بولی۔

"میں یاری خان کی بات مان لوں گی مگر میری ایک شرط ہے؟"

"کیسی شرط مورجان؟" یاری خان نے بے صبری کے عالم میں پوچھا۔

وہ بولی۔ "بیرونِ ملک جانے سے قبل تمہیں شادی کرنا پڑے گی"۔

"اس کی بھلا کیا ضرورت ہے؟" یاری خان شپٹا گیا۔ اُسے ماں سے کسی ایسے سوال کی توقع ہی نہیں تھی۔

ماں نے کہا۔ "تمہارے پیروں میں زنجیر ہوگی تو بھٹکنے سے باز رہو گے"۔

"مگر میرا تو ابھی رشتا بھی طے نہیں ہوا، کون مجھے

بنی دے گا؟" اُس نے جواز گھڑا۔

"تم ہاں تو کرو رشتا تلاش کرنا میرا کام ہے"۔ ماں نے پُرعزم لہجے میں جواب دیا۔

وہ سوچوں میں مستغرق ہوگیا۔ دل و دماغ میں جنگ چھڑ گئی ۔ دماغ نے کہا ماں کا کہنا مان کر شادی کرلو، دل بولا اگر وہاں کوئی میم صاحب پسند آگئی تو کیا ہوگا؟ دماغ نے طنزیہ قہقہہ لگا کر کہا ایک مڈل پاس ڈرائیور کو بھلا کوئی میم کیوں پسند کرے گی؟ دل بولا عورت عشق میں اندھی ہوجاتی ہے وہ تعلیم، مرتبہ، خاندان بلکہ مذہب تک نہیں دیکھتی بس اپنے دل کی سنتی ہے۔ دماغ نے کہا بجا مگر شادی کیے بنا یہ باہر نہیں جا پائے گا؟ دماغ کی اس ٹھوس دلیل نے دل کو لاجواب کر دیا، وہ دھڑک رہا تھا مگر اُس کے پاس ایسی کوئی دلیل نہیں تھی جسے جواز بنا کر وہ دماغ کی بولتی بند کر دیتا، سو بچارا دھڑکنے کے سوا کچھ بھی نہ کر پایا۔ دماغ نے فخریہ انداز میں طنز کیا اب بولو ناں! چپ کیوں ہو، جواب دو میرے سوال کا۔ دل بولا تمہیں جیت مبارک ہو مگر اتنا یاد رکھنا کہ یہ وقتی جیت ہے۔ بہت جلد میں تمہارے ہوش اُڑا دوں گا۔ دماغ نے کہا تم بے وقوف ہو اتنا بھی نہیں جانتے کہ جو میری مانتا ہے وہ ہمیشہ سرخرو ہوتا ہے دنیا والے اُسے جھک جھک کر سلام کرتے ہیں۔ دل نے جواب دیا اور جو میری مانتا ہے وہ مر کر بھی امر ہو جاتا ہے۔

دل و دماغ کی یہ مدلل جنگ جاری تھی کہ معاً اُس کی سماعتوں سے ماں کی آواز ٹکرائی۔ "یاری خان! چپ کیوں ہو جواب دو ناں؟"

"ٹھیک ہے مور جان"۔ اُس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "مجھے آپ کی شرط منظور ہے۔ آپ جہاں چاہیں میری شادی کر سکتی ہیں، میں کوئی اعتراض نہیں کروں گا"۔

ماں اُسے ڈھیروں دعائیں دیتی ہوئی سونے کے لیے چل دی۔ جب کہ وہ دونوں بھائی دیر گئے تک دہکتی انگیٹھی کے گرد بیٹھے مستقبل کے لیے لائحہ عمل ترتیب دیتے رہے

☆☆☆

دوسرے روز ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر یاری خان کی ماں اپنی بہن کے گھر جا پہنچی۔ دونوں بہنوں کے تعلقات آپس میں بہت ہی اچھے تھے۔ سو بہن اُسے دیکھتے ہی خوشی سے کھل اُٹھی۔ "آپا خانم! خیر تو ہے آج صبح سویرے میری یاد کیسے آگئی؟" چھوٹی بہن نے مسکرا کر سوال کیا۔

وہ بولی۔ "زرینہ! آج میں تیرے گھر میں سوالی بن کر آئی ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ تم اپنی آپا کو خالی ہاتھ نہیں لوٹاؤ گی"۔

زرینہ نے کہا۔ "آپا! آپ حکم کریں، آپ کے لیے تو میری جان بھی حاضر ہے"۔

خانم نے بغیر کسی لگی لپٹی کے کہا۔ "میں تم سے جان مانگنے کے لیے نہیں آئی ہوں بلکہ گل رُخ کا ہاتھ مانگنے کے لیے آئی ہوں۔ مجھے اپنے یاری خان کے لیے گل رُخ کا رشتا چاہیے؟"

زرینہ لمحہ بھر کے لیے تو متحیر رہ گئی۔ اُسے آپا خانم سے اس سوال کی شاید توقع ہی نہیں تھی۔ وہ تو سمجھ رہی تھی کہ شاید بڑی بہن کو روپے پیسے کی ضرورت ہوگی مگر وہ تو گل رُخ کا ہاتھ مانگ رہی تھی۔ چنانچہ زرینہ سوچوں میں مستغرق ہوگئی جب کہ خانم جواب طلب نظروں سے اُس کی طرف دیکھنے لگی۔ جب خاموشی کا ایک طویل وقفہ گزر گیا تو خانم بولی۔ "کن سوچوں میں گم ہو، میں بڑی اُمید لے کر تیرے پاس آئی ہوں۔ کیا تم بڑی بہن کو نامراد لوٹا دو گی؟"

"نہیں"۔ زرینہ نے انکار میں گردن ہلائی۔ "میں آپ کو ہاں کر سکتی ہوں اور نہ ہی ناں کر سکتی ہوں۔ اس

لیے کہ گل رُخ کا مالک اُس کا باپ ہے۔ آپ میرے بجائے گل رُخ کے باپ سے رشتا مانگیں"۔

وہ بولی۔ "مجھے بھائی جی سے بات کرنا ہوتی تو تمہارے سامنے دامن کیوں پھیلاتی؟ اُن سے تم خود بات کرو گی اور آج ہی کرو گی"۔

"آپا! یہ کیسی بات کرتی ہو...... اتنی جلدی بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟"

خانم نے کہا۔ "یاری خان ملک سے باہر جانا چاہتا ہے کمانے کے لیے، بس اسی وجہ سے میں اُس کی جلد سے جلد شادی کرنا چاہتی ہوں"۔

"اس کا مطلب ہے کہ آپ اُس کے پیروں میں زنجیر ڈالنا چاہتی ہیں؟"

"ہاں ایسی ہی کچھ بات ہے"۔ خانم نے اقرار میں سر ہلایا۔ "مجھے اندیشہ ہے کہ غیر ملک جا کر کہیں میرا بیٹا بھٹک نہ جائے"۔

زرینہ نے کہا۔ "آپا! اگر ایسی بات ہے تو گل رُخ کا باپ کبھی بھی نہیں مانے گا۔ وہ صاف انکار کر دے گا"۔

"تم اُسے یہ بات مت بتانا کہ یاری خان ملک سے باہر جا رہا ہے"۔ خانم نے مشورہ دیا۔

"میں اپنے خاوند سے جھوٹ نہیں بول سکتی"۔ اُس نے انکار میں سر ہلایا۔ "آپ تو جانتی ہی ہیں کہ وہ غصے کے بہت تیز ہیں۔ اُنھیں اگر کسی طرح یہ بات معلوم ہو گئی تو وہ مجھے زندہ جلا ڈالیں گے"۔

"اس بات کا صرف مجھے اور تجھے پتہ ہے۔ جب ہم دونوں زبان بند رکھیں گی تو اُسے کیسے پتہ چلے گا؟"

"آپا! آپ مجھے آگ میں کودنے کا مشورہ دے رہی ہیں۔ جھوٹ جھوٹ ہی ہوتا ہے جلد یا بدیر ظاہر ہو جاتا ہے"۔

"اگر ایسا کچھ ہوا تو سارا الزام میں اپنے سر لے لوں گی۔ تجھ پر کوئی آنچ نہیں آنے دوں گی۔ یہ میرا وعدہ

ہے تم سے۔"

"ٹھیک ہے آپا! میں کوشش کروں گی مگر آپ کو چند دن صبر کرنا پڑے گا۔ میں کوئی مناسب سا موقع دیکھ کر اُن سے بات کروں گی۔" آخر کار وہ رضامند ہو گئی۔

خانم خوشی خوشی گھر لوٹ آئی اور دونوں بیٹوں کو سامنے بٹھا کر ساری بات بتادی۔ یاری خان کو یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ گل رُخ اُس کی بیوی بننے والی ہے مگر صمد یار خان یہ خبر سُن کر کچھ بجھ سا گیا۔ پتہ نہیں اُس کے دل میں کیا تھا؟

"اوئے لالے کی جان! تم نے کیوں منہ لٹکا رکھا ہے، کیا تمہیں اس بات کی کوئی خوشی نہیں ہوئی ہے؟" یاری خان نے اُس کی اُتری ہوئی صورت دیکھ کر سوال کیا۔

وہ بوکھلا کر بولا۔ "نن..... نہیں لالہ! ایسی کوئی بھی بات نہیں ہے"۔

"اگر ایسی بات نہیں ہے تو پھر تمہاری شکل لنگور جیسی کیوں ہو گئی ہے؟" یاری خان نے شوخی سے پوچھا۔

"وہ دراصل لالہ! میرے امتحان ہونے والے ہیں ناں! تو بس اسی وجہ سے تھوڑا پریشان ہوں"۔ اُس نے بہانہ گھڑا۔

یاری خان نے کہا۔ "اگر کوئی ایسی ویسی بات ہے تو ابھی بتادو، تیرے لالہ کی جان بھی تیرے لیے حاضر ہے؟"

"کمال کرتے ہو لالہ!" اُس نے ایک کھوکھلا سا قہقہہ لگایا۔ "اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو میں آپ سے کیوں چھپاتا؟"

وہ بھائی کی پیٹھ تھپکتے ہوئے بولا۔ "صمد خان! میں صرف تمہارا بھائی ہی نہیں ہوں، بلکہ باپ بن کر تیری پرورش کر رہا ہوں۔ ایک بات یاد رکھنا مجھ سے زندگی میں کبھی جھوٹ مت بولنا ورنہ مجھے بہت تکلیف ہوگی"۔

"نہیں لالہ! میں بھلا آپ سے کیوں جھوٹ بولنے لگا؟" اُس نے دلِ مضطر کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

ماں اُن دونوں کو چھوڑ کر گھر کے کاموں میں لگ گئی جب کہ یاری خان کافی دیر تک چھوٹے بھائی کو کریدتا رہا مگر اُس نے اپنے دلی جذبات کو کچھ اس انداز میں چھپایا کہ یاری خان بالکل مطمئن ہو گیا۔

☆☆☆

گل رُخ جابر خان اور زرینہ کی اکلوتی اولاد تھی۔ وہ جابر خان کو اپنی جان سے بھی پیاری تھی۔ رات کو کھانے کے بعد جب گل رُخ اپنے کمرے میں سونے کے لیے چلی گئی تو زرینہ نے ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے شوہر کے سامنے خانم کا پیغام دہرادیا۔ جابر خان نے پہلے تو زرینہ کو آنکھیں دکھائیں اور پھر ناگوار انداز میں بولا۔

"کیا خانم پاگل ہے اُسے گل رُخ اور یاری خان کی عمر میں کوئی فرق نظر نہیں آتا؟"

وہ بولی۔ "اُن کی عمروں میں کوئی اتنا بڑا فرق تو نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ دس بارہ سال کا فرق ہوگا"۔

"خانم کی طرح شاید تمہارا بھی دماغ خراب ہو گیا ہے۔ دس بارہ سال سے بھی زیادہ کا فرق ہوگا اور یہ بہت بڑا فرق ہے"۔ وہ ایک دم غصہ ہو گیا۔

"آپ خواہ مخواہ غصہ کر رہے ہیں۔ ذرا ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کریں عمر کا یہ فرق لڑکی کے لیے اچھا ہوتا ہے"۔ زرینہ نے دلیل دی۔

وہ بولا۔ "تجھے دانش ور بننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ گل رُخ کا رشتہ میں خود طے کروں گا۔ تم بس اپنے کام سے کام رکھا کرو"۔

"کیوں..... میں کیا گل رُخ کی کچھ نہیں لگتی؟" زرینہ کو بھی غصہ آ گیا۔ "نو ماہ اُسے پیٹ میں لے کر پھرتی رہی ہوں۔ اڑھائی برس اُسے دودھ پلایا ہے۔ میں ماں ہوں اُس کی، آپ سے زیادہ اُس پر میرا حق ہے"۔

حکایت

کا شمارہ ستمبر 2014ء

سالگرہ نمبر

ہوگا

جو اپنی سابقہ روایات کے مطابق
ایک مستقل کتاب کی اہمیت کا حامل
ہوگا۔ اپنی کاپی ہاکر سے کہہ کر بک کرالیں۔

سالگرہ نمبر 320 صفحات پر مشتمل ہوگا۔

قیمت -/100 روپے

قارئین کرام اور ایجنٹ حضرات نوٹ فرمالیں۔

''حق کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اُسے آگ میں جھونک دیا جائے۔ شادی گڈے گڑیا کا کھیل نہیں ہوتی عمر بھر کا ساتھ ہوتا ہے۔ انسان کو سوچ سمجھ کر رشتا طے کرنا چاہیے۔ ویسے بھی عجلت کا کام شیطان کا ہوتا ہے''۔ اُس نے بھڑک کر جواب دیا۔

''میرا بھانجا لاکھوں میں ایک ہے۔ کیا کمی ہے اُن کے گھر میں، خدا کا دیا سبھی کچھ ہے اُن کے پاس، دو ہی تو بھائی ہیں۔ گل رُخ وہاں راج کرے گی''۔

''میں جو بھی فیصلہ کروں گا سوچ سمجھ کر کروں گا مگر فی الحال میں اس کام کے لیے سنجیدہ نہیں ہوں۔ اگر خانم کو جلدی ہے تو تم اُسے انکار کردو۔ گل رُخ ابھی بچی ہے، شادی کے لیے بڑی عمر پڑی ہے۔ ابھی تو اُس کے کھیلنے کودنے کے دن ہیں''۔

وہ بولی۔ ''گل رُخ پورے اٹھارہ برس کی ہو چکی ہے اور یہ شادی کے لیے مناسب عمر ہے۔ میں جانتی ہوں کہ آپ اُس سے بہت زیادہ محبت کرتے ہیں۔ مگر یہ بھی تو سوچیں کہ وہ بیٹی ہے آپ اُسے ساری عمر اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتے''۔

''میں نے کہا ہے ناں! کہ میں سوچ سمجھ کر فیصلہ کروں گا، پھر تم کیوں اس بات کے پیچھے پڑ گئی ہو...... کیا گل رُخ کسی کے ساتھ بھاگی جارہی ہے؟'' وہ زچ ہوگیا۔

''اللہ نہ کرے کیسی بات کرتے ہیں؟ میں تو بس یہ چاہتی تھی کہ وہ جتنی جلدی گھر کی ہوجائے اتنا ہی اچھا ہے''۔

''یہ دیکھ''۔ اُس نے بیوی کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ ''اللہ کی بندی! مجھے چند دن سوچنے کے لیے تو دے؟''

''ٹھیک ہے''۔ وہ خوشی سے کھل اُٹھی۔ ''جتنے دن دل چاہے آپ سوچیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ بس سوچتے وقت اتنا خیال رکھنا کہ یاری خان میرا بھانجا اور گل رُخ کا خالہ زاد ہے۔ وہ گل رُخ کے لیے اچھا شریکِ حیات ثابت ہوگا''۔

''اچھا اب زیادہ بک بک نہ کر اور میرے لیے قہوہ بنادے''۔ اُس نے ٹالنے والے انداز میں جواب دیا اور زرمینہ اُٹھ کر کچن کی طرف چل دی۔

ایسے ہی وقت بیرونی گیٹ پر دستک ہوئی تو وہ اُٹھ کر گیٹ کی طرف چل دیا۔ اُس نے گیٹ کھولا تو سامنے صمد خان کھڑا ہوا تھا۔ جابر خان اُسے دیکھ کر لحہ بھر کے لیے تو حیران رہ گیا، پھر پوچھا۔ ''کیا بات ہے صمد خان...... کیسے آنا ہوا؟''

''آپ..... آپ سے ایک ضروری کام ہے خالو''۔ اُس نے جھجک کر جواب دیا۔

''ٹھیک ہے اندر آجاؤ''۔ اُس نے ہاتھ سے اشارہ کیا تو صمد خان تیزی سے اندر آگیا۔

جابر خان نے گیٹ کو دوبارہ بند کیا اور صمد خان کو ساتھ لیے اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ ''بیٹھو''۔ اُس نے ایک چارپائی کی طرف اشارہ کیا تو صمد خان جھجکتے ہوئے بیٹھ گیا۔

''ہاں اب بولو کیا کام ہے؟'' جابر خان نے اُس کے سامنے دوسری چارپائی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

گوکہ صمد خان اکثر اُن کے گھر آیا کرتا تھا مگر جابر خان سے اُس کا سامنا کم ہی ہوا کرتا تھا۔ زیادہ تر وہ اُس کی غیر موجودگی میں خالہ کے ہاں جایا کرتا تھا۔ اُسے جابر خان کی غصیلی طبیعت کے متعلق اچھی طرح معلوم تھا۔ چنانچہ جابر خان نے جس طرح اُس سے سوال کیا اس سے وہ قدرے نروس ہوکر کش مکش کا شکار ہوگیا۔ اُسے سمجھ ہی نہیں آرہی تھی کہ بات شروع کرے تو کس طرح کرے؟ جابر خان بدستور جواب طلب نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سردیوں کا موسم ہونے کے

باوجود صمد خان کو اپنا گلا خشک سا ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ اب وہ اُس وقت کو کوس رہا تھا جب اُس نے اِدھر آنے کا ارادہ کیا تھا۔

"تم چپ کیوں ہو...... کیا منہ میں زبان نہیں ہے؟" اس بار جابر خان نے قدرے سختی کے ساتھ پوچھا۔

صمد خان کا سر جھکا ہوا تھا۔ تاہم وہ ہمت مجتمع کرتے ہوئے بولا۔ "وہ...... وہ خالو...... دراصل...... میں کہنا چاہتا تھا...... کہ آپ...... آپ اس رشتے سے انکار کر دیں"۔

"کس رشتے کی بات کر رہے ہو؟" جابر خان نے آنکھیں نکالیں۔

"یا...... یاری خان...... اور گل...... گل رُخ کے رشتے کی"۔ اُس نے بدقت تمام جواب دیا۔

"کیوں تمہیں کیا تکلیف ہے اس سے؟" جابر خان نے مشکوک انداز میں پوچھا۔

"یاری خان ٹھیک آدمی نہیں ہے خالو...... وہ...... وہ گل رُخ کو خوش نہیں رکھ سکے گا"۔ اُس نے سہمے ہوئے انداز میں بتایا۔

"اوہ...... تو تم گل رُخ کے ہمدرد بن کر آئے ہو؟" جابر خان نے طنزیہ انداز اختیار کر لیا۔ "لیکن کیوں...... تمہیں اپنے سگے بھائی سے زیادہ گل رُخ سے ہمدردی کیوں ہے؟ اس کی کوئی نہ کوئی وجہ تو ضرور ہوگی؟ مفت میں کون اتنی تکلیف اُٹھاتا ہے...... اصل بات کیا ہے بولو؟"

"نن...... نہیں خالو! ایسی تو...... کک...... کوئی بات نہیں ہے"۔ وہ ایک دم بوکھلا اُٹھا۔ "مم...... مجھے...... دراصل آپ سے ہمدردی ہے...... گگ رُخ سے تو...... مم...... میں نے کبھی...... بب...... بات بھی نہیں کی...... آ...... آپ بلاوجہ...... مجھ پر شک کر رہے ہیں مم...... میں ایسا ویسا آدمی نہیں ہوں"۔

"سچی بات بتا دو، ورنہ گلا گھونٹ کر مار ڈالوں گا"۔ وہ جارحانہ انداز میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "بولو گل رُخ سے تمہارا کیا تعلق ہے؟ اور خبردار! اب کی بار اگر تم نے جھوٹ بولا تو میں تمہاری کھال ادھیڑ ڈالوں گا"۔

"مم...... میں قسم کھاتا ہوں خالو! کہ ایسی...... کوئی...... " وہ ابھی ہکلا ہی رہا تھا کہ جابر خان نے آگے بڑھ کر اُسے دو تھپڑ جڑ دیے۔

"حرام زادے! تمہاری یہ ہمت کہ تم جابر خان کی بیٹی کا نام لو"۔ جابر خان نے اُسے گریبان سے پکڑ لیا۔ "میں تجھے زندہ زمین میں گاڑ دوں گا۔ بولو تمہارا گل رُخ سے کیا تعلق ہے؟ بولو ورنہ مار ڈالوں گا"۔

ایسے ہی وقت زرینہ قہوہ لے کر کمرے میں داخل ہوئی تو اندر کا منظر دیکھ کر وہ چلائی۔ "جابر خان! اسے کیوں مار رہے ہو؟ کیا کیا ہے اس نے...... خدا کے لیے اسے چھوڑ دو...... میں خانم کو کیا منہ دکھاؤں گی؟"

جابر خان نے اُسے گریبان سے پکڑ کر چارپائی سے نیچے پٹخ دیا اور پھر اُس کے پہلو میں ایک زوردار ٹھوکر رسید کرتے ہوئے گرجا۔ "پوچھ اپنے اس حرامی بھانجے سے کہ یہ میرے گھر میں کون سا مقصد لے کر آیا ہے اور گل رُخ سے اس کا کیا تعلق ہے؟"

"مجھے لگتا ہے کہ آپ کو کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے"۔ زرینہ قہوے کا کپ میز پر رکھتے ہوئے آگے بڑھی اور بپھرے ہوئے خاوند سے لپٹ گئی۔ "خدا کے لیے مجھے بتاؤ کہ معاملہ کیا ہے اور یہ یہاں اس وقت کیسے آ گیا؟"

"مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی ہے"۔ جابر خان خود کو چھڑاتے ہوئے بولا۔ "بلکہ تم اندھی ہو چکی ہو اپنے بھانجے کی محبت میں۔ پوچھو ذرا اس سے کہ یہ یہاں کس نیت سے آیا ہے؟ اور گل رُخ کو بھی بلاؤ، مجھے لگتا ہے کہ یہ اسی کی شہ پا کر یہاں آیا ہے۔ وہ یقیناً اس کے ساتھ ملی

ہوئی ہے"۔

"خدا کا خوف کرو جابر خان! اپنی معصوم بچی پر اس قدر گھناؤنا الزام مت لگاؤ"۔ وہ تڑپ کر بولی۔ "صمد خان کے ساتھ اُس کا کوئی تعلق نہیں ہے"۔

"خالہ جی! تمہیں اللہ کا واسطہ مجھے خالو سے بچاؤ"۔ معاً صمد خان اُٹھ کر زرینہ کے قدموں سے لپٹ گیا۔ "خدا کی قسم! میں تو خالو سے یاری خان کے رشتے کی بات کرنے کے لیے آیا تھا مگر خالو نے میری بات سننے کی بجائے مجھے مارنا شروع کر دیا، گھر آئے مہمان کے ساتھ بھی بھلا کوئی ایسا سلوک کرتا ہے؟"

صمد خان کو یوں گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے دیکھ کر جابر خان کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ چلایا۔ "حرام زادے! مجھ پر الزام لگاتے ہو، ابھی تھوڑی دیر قبل تو تم مجھ سے کہہ رہے تھے کہ یاری خان اچھا آدمی نہیں ہے اور میں گل رُخ کا رشتا اُس نہ کروں"۔

"خالو! خدا کا خوف کریں میں نے ایسا کب کہا ہے؟" صمد خان نے باقاعدہ رونا شروع کر دیا۔

"تیری تو......" وہ ایک گالی دیتے ہوئے طیش کے عالم میں اُس کی طرف بڑھا۔ "آج میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا"۔

"نہیں آپ اسے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے"۔ زرینہ نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا اور پھر ڈٹ کر اُس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ "مجھے یقین ہے کہ میرا بھانجا سچ کہہ رہا ہے۔ البتہ آپ کے دل میں اس قدر میل ہوگا یہ بات میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچی تھی"۔

"تیرے بھانجے کی ایسی کی تیسی"۔ جابر خان تیزی سے دیوار پر ٹنگی ہوئی رائفل کی طرف بڑھا اور رائفل اُتارتے ہوئے بولا۔ "آج میں اس کمینے بدذات کا قصہ ہی پاک کر دیتا ہوں"۔

رائفل اُتار کر وہ جونہی پلٹا عین اُسی وقت گل رُخ کمرے میں داخل ہوئی اور باپ اور صمد خان کے درمیان دیوار بن کر کھڑی ہو گئی۔ "نہیں ابا جی! میں آپ کو ایسا نہیں کرنے دوں گی۔ آپ اس کے خون سے ہاتھ نہ ہی رنگیں تو اچھا ہوگا"۔

"ہٹ جاؤ گل"۔ جابر خان جنونی انداز میں چلایا۔ "آج اسے میرے ہاتھ سے کوئی بھی نہیں بچا سکتا۔ میں اسے چھلنی کر کے ہی رہوں گا"۔

"اگر یہ بات ہے ابا جی تو پہلے گولی آپ کو مجھ پر چلانا پڑے گی"۔ گل رُخ نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "مجھے مار کر ہی آپ اس تک پہنچ سکتے ہیں"۔

"گل! میں کہتا ہوں کہ میرے راستے سے ہٹ جاؤ ورنہ بے موت ماری جاؤ گی"۔ جابر خان نے رائفل سیدھی کرتے ہوئے اُسے وارننگ دی۔

"میں نہیں ابا جی ہٹنے والی، اگر آپ کو گولی چلانی ہے تو بے شک چلا دیں"۔ اُس نے ایک عزم سے جواب دیا۔

"اور گل کے بعد میری باری ہوگی"۔ زرینہ نے مداخلت کی۔ "اب آپ سوچیں مت بلکہ گولی چلائیں، ہم مرنے کے لیے تیار ہیں"۔

صورتِ حال کو یک دم پلٹتے دیکھ کر اُس نے رائفل اپنی کنپٹی پہ رکھ دی۔ "ٹھیک ہے اگر یوں نہیں تو پھر یوں سہی"۔ وہ فیصلہ کن انداز میں بولا اور دائیں بازو کو لمبا کرتے ہوئے انگوٹھا ٹریگر پر رکھ دیا۔

"نہیں...... نہیں......" دونوں ماں بیٹی ہذیانی انداز میں چیختی ہوئیں اُس کی طرف بھاگیں مگر اس سے قبل کہ وہ اُس تک پہنچ پاتیں معاً "دھائیں دھائیں" کی آواز گونجی اور جابر خان کٹے ہوئے درخت کی طرح لہراتا ہوا زمیں بوس ہو گیا۔

(اس سنسنی خیز داستان کے بقیہ واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ کیجیے)

اِدھر اُدھر سے

☆---0345-7094506--- رانا محمد شاہد

مہمان نے اینکر پرسن کی آن ایئر دھنائی کر دی: ٹیلی وژن چینلو کے ٹاک شوز، کھانے پکانے کے پروگراموں میں میزبان کی الٹی سیدھی حرکتیں ان کے گلے بھی پڑ جاتی ہیں۔ ایسا ہی معاملہ مصر کے ٹیلی وژن چینل کی ایک میزبان نیہا عابدین کے ساتھ پیش آیا۔ مہمان خاتون نے آن ایئر کسی بات پر طیش میں آ کر ان کی دھنائی کر دی۔ ہوا کچھ یوں کہ میزبان نے اپنی مہمان کک خاتون کو چڑانے کے لئے ان کی تیار کردہ ڈش میں سرکہ ڈال دیا۔ بس پھر کیا تھا، پروگرام میں کھانے پکانے کی مہارت کا مظاہرہ کرنے والی خاتون اتنی جذباتی ہوئیں کہ انہوں نے اپنی ڈش کے خراب ہونے پر اپنی میزبان پر مار دھاڑ کی بارش کر دی۔ انہوں نے عابدین کو بالوں سے پکڑ کر نیچے گرا دیا اور ان کی دھنائی کر دی۔ اس خبر کے منظر عام پر آنے سے پتہ چلا کہ صرف پاکستان ہی نہیں دنیا بھر میں خواتین کے لڑائی اور مار کٹائی کا انداز ایک جیسا ہے۔

انوکھی ٹیکنالوجی..... درختوں کے ذریعے مواصلات کا نظام: کیسا ہو گا کہ سڑکوں کے کنارے لگے ہوئے درختوں سے ایسی روشنی خارج ہو جو رات کے وقت سڑکوں پر اجالا کر دے اور انہی درختوں کی شاخیں موبائل فونز اور دیگر مواصلاتی سروسز کے لئے انٹینا کا کام انجام دیں۔ یقیناً ان کی توانائی کا ذریعہ جڑیں ہی ہوں گی۔ جی ہاں ایسا اب شاید ممکن ہو جائے۔ گزشتہ ماہ امریکی

ریاست میساچوسٹ کے انسٹیٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کے پروفیسر مائیکل سینٹر ینو اور ان کی ٹیم نے پودوں پر کچھ تجربات کئے جن کی روشنی میں انہوں نے یہ انکشاف کیا کہ چھوٹے پودوں اور بڑے درختوں سے ایسے بہت سے کام لئے جا سکتے ہیں جو بظاہر ان کے لئے نہیں ہیں۔ پروفیسر مائیکل نے سب سے پہلے پالک کے پتوں پر تجربہ کر کے اس بات کا اندازہ لگایا ہے کہ اگر پودوں کی "فوٹو سینتھیسز" کے عمل کو تین گنا تیز کر دیا جائے تو نہ صرف پودوں کی نشوونما تیز ہو گی بلکہ انہیں برقی سینسرز کے طور پر بھی استعمال کیا جا سکے گا۔ انہی سینسرز کی مدد سے مواصلات کا نظام چلایا جا سکتا ہے اور روشنی پیدا کی جا سکتی ہے۔ یقیناً یہ تحقیق ٹیلی کام کی صنعت سے تعلق رکھنے والی کمپنیوں کے لئے خوش خبری ثابت ہو گی۔ اب انہیں اپنی سروسز صارفین تک پہنچانے کے لئے بڑے بڑے نیٹ ورکنگ ٹاورز کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اس طرح کے پودوں کو "بائونک پلانٹس" کا نام دیا گیا ہے۔

نیو یارک ریسٹورنٹ...... پانچ سال تک ایڈوانس بکنگ ہو چکی: اچھے ہوٹلوں میں کھانا کھانے کے لئے انتظار تو کرنا پڑتا ہے مگر امریکہ میں ایک ریسٹورنٹ ایسا بھی ہے جس میں کھانا کھانے کے لئے پانچ سال انتظار کرنا پڑے گا۔ نیو یارک میں واقع ون مین ریسٹورنٹ میں بنے کھانے اتنے لذیذ ہیں کہ اب اس کی شہرت دور دور تک پھیل چکی ہے۔ اس ریسٹورنٹ میں ایک ہی شیف ہے جس کے ہاتھوں کا کھانا کھانے کے لئے ایڈوانس بکنگ کرانی پڑتی ہے۔ اگر آپ کو بھی یہاں کھانا کھانا ہے تو بس 2019ء تک انتظار کرنا پڑے گا۔ کیونکہ یہاں اگلے پانچ سال تک کی تمام بکنگ ہو چکی ہے۔

مشینی پرندہ: حقیقی پرندوں کے علاوہ اب مصنوعی پرندے بھی اڑان بھر سکیں گے۔ حال ہی میں جرمن سائنسدانوں نے کبوتروں کی طرح اڑان بھرنے والا روبوٹ تیار کیا ہے جسے دیکھ کر حقیقی پرندے کا گمان ہوتا ہے۔ سمارٹ برڈ نامی روبوٹک پرندے کا وزن صرف 400 گرام ہے جسے جاسوسی کے لئے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ کبوتر کی طرح نظر آنے والا یہ روبوٹک برڈ مختلف زاویوں پر مڑنے اور لینڈ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

ایرانی دوشیزاؤں کو ڈرائیونگ کرتے رقص مہنگا پڑ گیا: سماجی رابطے کی ویب سائٹ "یوٹیوب" پر ایک ویڈیو تیزی سے مقبول ہو رہی ہے جس میں دو ایرانی لڑکیاں گاڑی چلاتے ہوئے ایک گانے کی دھن میں مگن رقص کر رہی ہیں۔ ان کی خوشی اس وقت ادھوری رہ گئی کہ جب ان کی تیز رفتار گاڑی اچانک ایک خوفناک حادثے کا شکار ہوتی ہے، تاہم خوش قسمتی سے دونوں محفوظ رہتی ہیں۔ موبائل فون سے بنائی گئی ویڈیو میں صاف دیکھا جا سکتا ہے کہ گاڑی چلانے والی ایک دوشیزہ گانے اور ناچنے میں اس قدر مگن تھی کہ اس نے سٹیئرنگ سے ہاتھ اٹھا لئے تا کہ اپنی اداؤں کو کیمرے کی آنکھ میں محفوظ کر سکے۔ عین اسی لمحے ان کی گاڑی حادثے کا شکار ہوئی۔

سردار جی کی کیا بات ہے: حضرت علامہ اقبالؒ کے لاکھوں مداحوں میں کچھ سکھ حضرات بھی تھے۔ ہربندر سنگھ سے علامہ اقبالؒ کی خاصی دوستی تھی۔ ایک دن ہربندر سنگھ علامہ اقبال کے گھر آئے۔ مشاعرہ ختم ہوا تو رات ہو گئی۔ ہربندر سنگھ علامہ اقبال سے گفتگو میں اتنے مگن ہوئے کہ انہیں احساس بھی نہ ہوا کہ بادل گھرے ہوئے ہیں، بارش سے پہلے گھر چلے جائیں۔ اتنے میں موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ علامہ صاحب نے کہا۔ "سردار جی! بارش نے بہت زور پکڑ لیا ہے، آپ یہیں ٹھہر جائیں"۔ سردار جی مان گئے۔ علامہ صاحب ان کے لئے بستر وغیرہ کا انتظام کرنے کے لئے اندرون خانہ چلے گئے۔ چادر تکیہ لے کر آئے تو سردار جی غائب تھے۔ نوکر وغیرہ سب سو چکے تھے۔ علامہ صاحب کھڑکیاں دروازے بند کرنے

گئے تو انہوں نے ہر بندر سنگھ کو پانی میں شرابور دروازے پر کھڑا پایا۔ علامہ صاحب نے انہیں اندر بلا لیا اور دریافت کیا کہ وہ کہاں چلے گئے تھے۔ سردار جی بولے۔ "میں اپنے گھر سلیپنگ سوٹ لینے اور یہ بتانے گیا تھا کہ آج علامہ صاحب نے مجھے اپنا مہمان بنا لیا ہے۔ اس لئے رات کو گھر نہ آ سکوں گا"۔ علامہ صاحب نے کہا۔ "گھر پہنچ گئے تھے تو واپس آنے کی کیا ضرورت تھی، وہیں آرام کرتے"۔ سردار جی نے کہا۔ "آپ نے مجھے مہمان بنا لیا تھا۔ اس وڈائی (شرف) کو پورا کرنا ہی تھا۔
("زندگی زندہ دلی" فضل الرحمٰن خاں شیروانی کی کتاب سے اقتباس)

کاک پٹ گھر: دنیا میں غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک افراد کی کمی نہیں۔ ایسے لوگ بہت جلد دوسروں کی توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں۔ برطانوی علاقے بکنگھم شائر کے رہائشی ایک جوڑے نے اپنے گھر کی پہلی منزل پر موجود ٹیرس کو بوئنگ 737 نامی طیارے میں تبدیل کر دیا ہے اور اس شوق کے لئے 40 ہزار پاؤنڈ خرچ کر ڈالے ہیں۔ اسٹیو اور رکی نے طیارے کے اندرونی حصے میں موجود تمام چیزیں اس ٹیرس میں نصب کر دی جس میں کاک پٹ، 12 میٹر کیبن، ڈپارچر لاؤنج اور ائر برج شامل ہیں۔ جوڑے نے اس طیارے میں بیٹھنے کے لئے 75 پاؤنڈ کا ٹکٹ لگا دیا ہے۔

خوئے حکمرانی: برصغیر کے مغل فرمانرواؤں میں سے سب سے نیک اور متقی کہلائے جانے والے شہنشاہ نے اپنے والد کو آگرہ کے قلعے میں اس طور نظر بند رکھا کہ وہاں سے پرندوں کا گزر بھی ممکن نہ تھا۔ مکمل قید تنہائی۔ جب سابق شہنشاہ برسہا برس کی قید تنہائی سے اکتا گیا تو اپنے بیٹے اور وقت کے شہنشاہ کو پیغام بھجوایا کہ اس کے پاس کچھ طالب علم بھجوا دیے جائیں جنہیں وہ قرآن پڑھا سکے۔ اپنے والد شاہ جہاں کا پیغام سن کر اورنگزیب عالمگیر مسکرایا اور والد کی استدعا کو رد کرتا ہوا بولا۔ "ابھی تک اس بوڑھے کے دماغ سے خوئے حکمرانی نہیں گئی۔ کیا اب بھی وہ چاہتا ہے کہ طالب علموں کی صورت اس کا دربار سجا ہو اور ان پر اپنا حکم چلاتا رہے"۔

قیامت کی نشانی: سورج مغرب سے نکلے گا۔ ناسا نے "قیامت کی نشانی" کو قبول کر لیا ہے۔ امریکی خلائی ادارے ناسا کی تحقیق کے مطابق 30 جولائی کو اس سیارے کی مشرق کی سمت گردش رک گئی تھی جبکہ اگست اور ستمبر کو مریخ نے اپنے راستے کی سمت تبدیل کر لی۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ مریخ سیارے میں گردش میں تبدیلی اس امر کی غمازی کرتی ہے کہ تمام سیاروں کی گردش میں ایک دفعہ تبدیلی ضرور آئے گی۔ جہاں تک زمین کا تعلق ہے اس کی گردش بھی مخالف سمت میں ہو گی اور سورج مغرب سے طلوع ہوگا اور ایسا جلد ہوگا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ "قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ سورج مغرب سے طلوع ہوگا اور اس دن توبہ کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو جائے گا"۔ (صحیح مسلم)

بچوں کی حس مزاح: ایک نئی تحقیق میں بتایا گیا ہے کہ بچوں کی حس مزاح کا تعلق ان کے والدین سے ہوتا ہے۔ اس لئے اگر مائیں سنجیدہ مزاج ہیں تو آپ یہ ہرگز مت سوچئے گا کہ بچے حسِ مزاح سے مالا مال ہوں گے کیونکہ بچوں کی مزاح کی حس ماں جیسی ہی ہو گی۔ محققین کے مطابق بچوں میں حس مزاح 18 ماہ کی عمر سے پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہے اور اپنے والدین کو دیکھ کر ہی ان کی حسِ مزاح تشکیل پاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بچوں کے ساتھ ہر وقت موجود مائیں اگر سنجیدہ مزاج ہوں تو بچوں کی حس مزاح بھی محدود ہو کر رہ جاتی ہے کیونکہ بچے دو سال کی عمر سے یہ سمجھنا شروع ہو جاتے ہیں کہ کون سی چیزیں سنجیدہ ہیں اور کون سی مزاح کے دائرے میں آتی

ہیں۔

__دنیا کی سب سے بڑی عبادت گاہ:__ خانہ کعبہ کی عمارت 49.5 فٹ بلند ہے۔ اس کی دیواروں کی لمبائی کچھ اس طرح ہے۔ مشرقی دیوار 38 فٹ 18 انچ، مغربی دیوار 39 فٹ 1.5 انچ، شمالی دیوار 33 فٹ 6.5 انچ۔ اس کے دروازے (باب ملتزم) کی لمبائی 6 فٹ 6.5 انچ اور چوڑائی 3 فٹ 13.5 انچ ہے۔

__برصغیر کا پہلا ڈاک ٹکٹ:__ برصغیر میں پہلا ڈاک ٹکٹ یکم جولائی 1852ء کو سندھ کے گورنر نے جاری کیا۔ اس کی مالیت آدھا آنہ تھی اور یہ صرف 5 اضلاع کے لئے جاری کیا گیا تھا۔ اسے کرنسی نوٹ چھاپنے والے ادارے تھامس ڈی لارے اینڈ کمپنی نے شائع کیا تھا۔ اس کی شکل گول اور رنگ سرخ تھا۔ اس ٹکٹ کو براعظم ایشیا کے پہلے ڈاک ٹکٹ ہونے کی حیثیت بھی حاصل ہے۔ اس کے اندر گول دائرے میں "سندھ ڈسٹرکٹ ڈاک" چھپا ہے۔

__دنیا کی مہنگی ترین گلی:__ ہانگ کانگ میں واقع رسل سٹریٹ دنیا کی مہنگی ترین گلی ہے۔ عالمی ذرائع ابلاغ کے مطابق رسل سٹریٹ میں ایک دُکان کی قیمت دو کروڑ 30 لاکھ ڈالر ہے اور یہاں سب سے زیادہ قیمت پر دکانیں کرائے پر ملتی ہیں۔ رسل سٹریٹ میں دُکان خریدنا تو درکنار یہاں خریداری کرنا بھی آسان نہیں۔ دنیا کے امیر ترین لوگ ہی یہاں آ کر کچھ خرید سکتے ہیں ہر کسی کے بس میں نہیں کہ وہ یہاں شاپنگ کر سکے۔

__بیٹے کی شرارت باپ کے لئے مصیبت:__ کبھی کبھی بچوں کی شرارتیں بڑوں کو کسی ایسی مصیبت میں مبتلا کر دیتی ہیں جس سے وہ کوشش کے باوجود بھی چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے۔ ایسا ہی کچھ چینی سیاح کے ساتھ ہوا جو اپنے 4 سالہ بیٹے کی شرارت کے باعث جنوبی کوریا میں پھنس گیا۔ رپورٹ کے مطابق مسٹر ژینگ اپنے بیٹے کے ساتھ جنوبی کوریا کے دورے پر تھے اور اس دوران ان کے بیٹے نے ان کے پاسپورٹ پر ڈرائنگ بنا کر مکمل طور پر اپنے فن کا مظاہرہ دکھایا جس کے باعث کسٹم حکام نے انہیں وطن واپسی سے روک دیا۔ جونیئر ژینگ نے اپنے والد کے پاسپورٹ پر جانوروں کی تصاویر سے لے کر بادلوں اور پودوں تک کی تصاویر بنا ڈالیں۔ بات یہیں ختم نہیں ہوئی جونیئر ژینگ نے اپنے والد کی مونچھیں اور داڑھی بنا کر انہیں مزید پرکشش بنانے کی بھی کوشش کی۔ اب مسٹر ژینگ نے چینی حکام سے رابطہ کیا ہے اور مدد کی درخواست کی ہے۔

__30 لاکھ ڈالر انعام دینے کا اعلان:__ ملائشیا کے گم شدہ بوئنگ 777 طیارے کے مسافروں کے رشتہ داروں نے ایک چندہ مہم شروع کی ہے اور جمع شدہ رقم میں سے طیارے کے بارے میں مصدقہ اطلاع دینے والے کو 30 لاکھ ڈالر انعام دینے کا اعلان کیا ہے۔

__کیلے چور کہیں کے:__ وسطی امریکی ریاست نکاراگوا کی عدالت نے تین مردوں کے خلاف دو کیلوں کی چوری کے الزام میں مقدمہ شروع کر دیا ہے۔ رپورٹ کے مطابق ماہرین قانون نے اس مقدمے کی وجہ سے عدالت کو مذاق کا نشانہ بنایا ہے۔ سماعت کے دوران اٹارنی جنرل کے ادارے نے کہا کہ تین ملزموں نے گزشتہ سال دسمبر میں 32 سینٹ مالیت کے دو کیلے ایک دُکان سے چوری کرنے کی کوشش کی تھی۔ دو ملزموں کو حراست میں رکھا گیا ہے جبکہ ایک اپنے گھر میں نظر بند ہے۔ ان لوگوں کے وکیل نے کہا کہ ان کے مؤکلوں کے خلاف مقدمہ شروع کرنے کے عدالت کے فیصلہ کی وجہ ناقابلِ وضاحت ہے۔

اگر پولیس محنت اور دیانت داری سے تفتیش کرے تو پاتال میں چھپے
مجرموں کو بھی ڈھونڈ نکالتی ہے۔ یہ تفتیشی کہانی اس بات کا کھلا ثبوت ہے۔

ڈکیتی کے بعد

☆ ------------0300-9667909------------ دستگیر شہزاد

گلاب پور کے جنوبی علاقہ نرالا نگر پر ایک ڈیری والی روڈ واقع ہے جہاں بینک آف پنجاب کی برانچ بھی مین روڈ پر ہی واقع ہے۔ دن ساڑھے تین بجے کا وقت تھا۔ سڑک پر کافی گہما گہمی تھی۔ بینک میں اس وقت منیجر بابر بابا کے علاوہ کیشئر نجف علی، علینہ چوہدری، جی ایم زیدی، طارق باجوہ، چپڑاسی ذاکر حسین، سوپر طارق کے علاوہ گاہک روحہ علی اور اس کی ماں عائشہ، نعیم جوزی، محمد آصف و خورشید تھے۔ ٹھیک تین بج کر پینتالیس منٹ پر دو نوجوان بینک میں داخل ہوئے، دونوں ہی ہیلمٹ پہنے ہوئے تھے۔ ایک نوجوان روحہ علی کے پیچھے کرسی پر بیٹھ گیا جبکہ دوسرا نوجوان منیجر کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

منیجر بابر بابا اُس وقت کسی فائل پر نظریں گاڑے ہوئے تھے جبکہ ان کی مقابل کرسی پر ایک گاہک بیٹھا تھا۔ نوجوان سیدھا منیجر کی بغل میں پہنچ گیا اور ان کے کندھے پر ہاتھ مار کر پیچھے دھکیلا۔ انہوں نے حاضر دماغی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خطرے کے الارم والا سوئچ دبایا مگر سائرن دھوکا دے گیا۔ اتنے میں نوجوان نے اُن کی کنپٹی پر ریوالور کی نال لگادی۔

"خبردار! اگر چالاکی دکھائی تو بھیجا اڑا دوں گا"۔ اس نے سرد لہجے میں کہا۔ "ہاتھ پیچھے گردن پر رکھو اور کھڑے ہو جاؤ"۔

بابر بابا کی جان سوکھنے لگی اور سامنے بیٹھا گاہک کانپنے لگا۔ انہیں اپنی موت بالکل قریب دکھائی دے رہی تھی جس سے وہ خوف سے کانپ رہے تھے اور وہ حکم کے

مطابق وہی کر رہے تھے جیسا وہ کرنے کو کہہ رہا تھا۔ اسی دوران روحہ علی منیجر کے کمرے کی طرف آئی اور اس نے دیکھا کہ نوجوان منیجر کی کنپٹی پر ریوالور لگائے انہیں باہر کی طرف لا رہا ہے۔ روحہ علی چپ چاپ اپنی ماں کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور ماں کو بتانے لگی۔ تبھی اچانک اس کے پیچھے بیٹھا نوجوان ریوالور لہراتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

"سبھی لوگ چپ چاپ کھڑے ہو جائیں"۔ اس نے حکم دیا۔ "ہاتھ سر پر رکھ لیں اور اپنے موبائل زمین پر پھینک دیں"۔

پھر وہ اسٹرانگ روم کی طرف بڑھا۔ گاہکوں کے پاس والا نوجوان بھی گاہکوں کو کور کیے ہوئے اسٹرانگ روم میں لے آیا۔ اسی دوران ذاکر حسین، طارق اور جی ایم زیدی نے کچھ حرکت کرنے کی کوشش کی تو ڈاکوؤں نے ریوالور تان کر انہیں ساکت کر دیا۔ پھر ایک بدمعاش سبھی کو گن پوائنٹ پر کور کیے رہا جبکہ اُس کا دوسرا ساتھی لائے ہوئے بیگوں میں نوٹ بھرنے لگا۔ روپے بھرتے وقت اس بدمعاش کے ہاتھ بھی کانپ رہے تھے۔ یہ دیکھ کر روحہ علی کو لگا کہ وہ اناڑی ہے پیشہ ور ڈاکو نہیں ہے اور ڈر رہا ہے، اُس نے ریوالور والے بدمعاش سے بھڑنا چاہا لیکن تبھی اس کی ماں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔ محض پندرہ منٹ میں فلمی انداز سے بینک لوٹ کر دونوں بدمعاش ریوالور لہراتے ہوئے فرار ہو گئے۔

> آدمی خوددار کیا ہوگا خوددار تو بکری کا بچہ ہوتا ہے جو کھائے چارے کی قیمت اپنا گوشت کھلا کر ادا کرتا ہے۔

ڈاکوؤں کے بھاگ جانے کے بعد روحہ علی بینک کے باہر آئی اور پڑوسی دکاندار علی جان سے موبائل لے کر 15 نمبر پر واقعہ کی اطلاع پولیس کو دے دی۔ تھوڑی ہی دیر میں کئی تھانوں کی پولیس اعلیٰ پولیس افسران کے ساتھ موقع پر پہنچ گئی۔ افسران نے بینک میں موجود تمام لوگوں سے لٹیروں کے بارے میں گہرائی سے پوچھ گچھ کی۔ افسران نے ڈاکوؤں کے ذریعے چھوڑے گئے بیگ کی تلاشی لی لیکن کچھ حاصل نہیں ہوا۔ ڈاگ سکواڈ بھی باہر آ کر رک گیا۔ بینک میں لگے سی سی ٹی وی کیمروں کی بابت بینک ملازمین نے بتایا کہ وہ کئی ماہ سے خراب ہیں۔ اس کی اطلاع اعلیٰ افسران کو دے دی گئی ہے۔ آئی جی قیصر عباس نے اعلان کیا کہ جو بھی لٹیروں کی اطلاع دے گا اُسے ایک لاکھ روپے کا نقد انعام دیا جائے گا۔ واقعہ کی رپورٹ تھانہ سول لائن ڈکیتی کے تحت درج کی گئی اور تفتیش کا کام انسپکٹر عاطف چوہدری کے سپرد کر دیا گیا۔

29 نومبر کو ڈکیتی ہوئی تھی۔ رات دیر گئے تک جانچ پڑتال جاری تھی۔ افسران لوٹ کی واردات پر بحث کر رہے تھے کہ تبھی خبر آئی کہ باغ جناح پارک میں کچھ نوجوان ایک بائیک کو آگ لگا کر بھاگ گئے ہیں۔ علاقائی لوگوں کی اطلاع پر باغ جناح پولیس نے موقع پر پہنچ کر آگ بجھائی اور نیم سوختہ بائیک قبضہ میں لے لی۔ اگلے دن آر ٹی اے سے معلومات حاصل کی گئی تو علم ہوا کہ مذکورہ بائیک رجانہ کے باشندے احمد فراز راجو کے نام پر ہے۔ پولیس نے احمد فراز راجو سے رابطہ قائم کیا تو انہوں نے بتایا کہ بائیک پچھلے ہفتے راول جھیل سے چوری ہو گئی تھی جس کی رپورٹ تھانہ رجانہ میں درج ہے۔ پولیس نے علاقہ کے کئی مشتبہ لوگوں اور کئی پرانے کار چوروں کو پکڑ کر حراست میں لے کر پوچھ گچھ کی مگر معاملہ صفر ہی نکلا۔ ادھر سول لائن پولیس نے بینک کے ملازم طارق اور احمد حسن کو حراست میں لے کر پوچھ گچھ شروع کر دی۔

> سچ یہ نہیں کہ لوگوں کو خوفزدہ کر دیا جائے سچ یہ بھی نہیں ہے کہ اس کے سبب دولت و شہرت کمانے نکل جائیں۔ سچ یہ ہے کہ جھوٹ کسی طرح بھی اس کی جگہ نہ لے سکے۔

دن گزرتے گئے مگر پولیس کو کوئی کامیابی نہیں ملی تو حسن عباس نے عہدے کی ذمہ داری سنبھالتے ہوئے سب سے پہلے سول لائن تھانہ انچارج عاطف چوہدری کا تبادلہ کر دیا اور ان کی جگہ ناصر گجر کو لایا گیا۔ بینک ڈکیتی کی تفتیش کر رہی پرانی ٹیم کو ہٹا کر نئی ٹیم بنائی گئی۔ ڈی پی او حسن عباس نے سافٹ ویئر کی ایک بالکل نئی تکنیک کا استعمال کیا۔ اس تکنیک سے موبائل ٹاور پر ہیوی ٹریفک کے باوجود پولیس کو آسانی سے کئی مشتبہ نمبر ملے جس سے پولیس کو کافی مدد ملی۔ پولیس کو ایک ایسا نمبر مل گیا جو حادثہ کے بعد سے ہی بند تھا جبکہ حادثہ کے وقت اس کی لوکیشن بینک کے موبائل ٹاور میں موجود تھی۔

پولیس ٹیم نے اس نمبر کی آئی ڈی نکالی تو اعجاز کا پتہ ملا جو اس بینک کا خاص کھاتے دار تھا اور اب یہ کھاتے بند تھے۔ پولیس نے تینوں کی آئی ڈی نکلوائی اور پھر نیو لیبر کالونی کے باشندے اشرف عرف چھرا، نواب پور کے باشندے ساہر کے علاوہ بنگلہ کے رہنے والے اعجاز کو گرفتار کر لیا۔ اشرف عرف چھرا اور ساہر طالب علم تھے جبکہ اعجاز ایم ایس سی کا طالب علم تھا۔

پوچھ گچھ میں ملزموں نے بنک ڈکیتی کا اعتراف کر لیا۔ انہوں نے ڈکیتی کا واقعہ جو بیان کیا تو اُسے سن کر افسران بھی ہکا بکا رہ گئے۔ اعجاز قریشی نے پولیس کو بتایا کہ بنگلہ کے مکان نمبر 257 میں ہم رہتے تھے مگر حاجی وسیم وغیرہ نے دھوکا دے کر مکان اپنے نام لکھوا لیا۔ تب سے ہم لوگ بے گھر ہو گئے ہیں۔ راحیل میرا دوست ہے جو لیبر کالونی میں رہتا ہے۔ اشرف عرف چھرا کا دوست ساہر ہے جو اشرف کے ساتھ ایم ایس سی کر رہا ہے۔ میرا گھر جب وسیم وغیرہ نے لے لیا تو میں اشرف کی مدد سے سول لائن چوراہے کے پاس کرائے کا کمرہ لے کر رہنے لگا۔ میرے ماں باپ بہن بھائی بھی ساتھ رہتے تھے۔ تھوڑے دن بعد ہی ہم عثمان پور میں واقع ناصر کے پتنگ کے کارخانے میں بغیر کرائے کے جا کر رہنے لگے۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ ہم لوگ پریشان تھے، میری ایک بہن بھی بنگلہ سے اغوا ہو گئی۔

> کوؤں کا اتحاد اور چیونٹیوں کی تنظیمی قطار کسی بھی قوم کا گھرانے کے لئے مشعل راہ ہو سکتی ہے۔

اسی دوران ایک دن اشرف عرف چھرا میرے گھر آیا اور مجھ سے کہا کہ کچھ کیا جائے ورنہ پریشانی بڑھتی جا رہی ہے۔ اشرف کا دوست ساہر بھی پریشان تھا، اس کا باپ 18 سال قبل ہی لاپتہ ہو گیا تھا۔ تب سے آج تک اس کا پتہ نہیں چلا۔ وہ ایم ایس سی کی فیس بھی نہیں جمع کرا پا رہا تھا۔ اسی وقت فون کر کے اشرف نے ساہر کو بلوا لیا۔ ہم لوگوں نے پارک میں بیٹھ کر بینک ڈکیتی کا منصوبہ بنایا۔ میرا بینک آف پنجاب نیو لیبر کالونی میں کھاتہ تھا۔ اسی سبب مجھے وہاں کی سرگرمیوں کا علم تھا۔ میں نے وہیں بیٹھ کر بینک کا نقشہ بنایا اور اشرف اور ساہر کو سمجھایا۔ اس کے بعد اشرف ساہر نے کئی بار بینک کی ریکی کر کے وہاں کا جائزہ لیا۔ اس کے بعد ہم لوگوں نے طے کیا کہ ایک موٹر سائیکل دو ریوالور و کارتوس کا انتظام پہلے ہی کر لیا جائے۔ میں نے اپنے دوست بنگلہ کے رہنے والے شاداب سے ایک ریوالور و کارتوس کا انتظام کر لیا۔ اس کے بعد اشرف سے وقت لے کر وکیل احمد جس کی بریانی کی دکان ہے، اس سے ایک ریوالور و کارتوس لے آیا۔

اسلحہ کا بندوبست ہو گیا۔ تب ایک موٹر سائیکل کے مسئلہ پر غور کیا گیا۔ منصوبے کے مطابق اشرف عرف چھرا اور میں آئی پی ماما موٹر سائیکل سے گول چکر گئے اور وہاں سٹینڈ میں اپنی گاڑی کھڑی کر دی اور پرچی لے کر دونوں سول لائن واپس آ گئے اور اسی پرچی سے کمپیوٹر کی دکان سے سکین کرا لیا۔ اس طرح ہمارے پاس دو پرچیاں ہو گئیں۔ اس کے بعد واپس جا کر ایک پرچی سے اپنی پاما

موٹر سائیکل اٹھائی اور دوسری سکین پرچی سے موٹر سائیکل کا نمبر لکھ کر رات 8 بجے اُسے بھی اٹھا لیا۔ یہ موٹر سائیکل اشرف کے گھر ہی رہتی تھی۔ گھر والوں کے پوچھنے پر اُس نے بتا دیا کہ ایک دوست کی ہے۔ کبھی کبھی وہ میرے گھر بھی کھڑی کر جاتا تھا۔ جب ہمارے پاس دو موٹر سائیکل ہو گئیں اور ریوالور دو کارتوس بھی ہو گئے تو اشرف عرف چھرا میرے گھر آیا اور فون کر کے ساہر کو بھی وہیں بلا لیا۔ دوپہر تقریباً ساڑھے تین بجے بینک آف پنجاب پہنچے۔ ہم دونوں نے ایک سم دونوں سیٹ میں ڈال کر اپنے پاس اور ایک اشرف نے رکھ لی اور تیسری سم ساہر کے موبائل میں ڈال کر بینک کے سامنے سڑک کی دوسری پٹڑی پر کھڑے ہو کر اپنے اپنے موبائلوں میں کال کانفرنسنگ کر لی۔ ساہر کو بینک کے باہر نگرانی پر لگا کر موٹر سائیکل لال حویلی جانے والی گلی میں کھڑی کر کے میں اور اشرف ہیلمٹ لگائے ہوئے ساڑھے تین بجے کے بعد بینک میں داخل ہوئے۔ مگر اُس دن بینک میں گاہکوں کی تعداد زیادہ تھی۔ اس لئے ہمت نہیں پڑی ہم بھی اُس دن واپس ہو لئے۔

مؤرخہ 27 نومبر کو بھی اسی طرح ہم لوگ اُسی وقت بینک گئے مگر اُس دن بھی امید سے زیادہ بھیڑ تھی۔ سو لوٹ آئے۔ پھر اگلے دن چھٹی ہو گئی۔ 29 نومبر کو پھر موٹر سائیکل پر سوار ہو کر ہم لوگ بینک میں پہنچے۔ ساہر کو سڑک پر اتار کر میں اور اشرف ہیلمٹ لگائے بینک کے اندر داخل ہوئے۔ میرے ہاتھ میں پہلے سے ہی تین ہینڈ بیگ روپوں کو بھرنے کے لئے تھے اور اشرف اپنے ہاتھ میں تالا لئے تھا جس نے صدر گیٹ میں کنڈی بند کر کے تالا لگا دیا تاکہ نہ کوئی باہر سے اندر آ سکے اور نہ ہی اندر سے کوئی باہر جا سکے۔ ایک چابی اشرف کے پاس تھی اور دوسری مجھے دے دی تھی۔ ہم لوگوں نے اپنی انگلیوں میں ٹیپ لگا لئے تھے تاکہ نشان نہیں آ سکے۔

بینک لوٹنے کے بعد صدر گیٹ کا تالا کھول کر ہم باہر نکل آئے اور ریوالور لہراتے ہوئے موٹر سائیکل کے پاس پہنچ گئے۔ آس پاس کے دُکاندار اور راہ گیر ریوالور دیکھ کر بھاگنے لگے۔ اس کے بعد اشرف نے موٹر سائیکل سٹارٹ کی تو میں پیچھے بیٹھ گیا اور لال حویلی ہوتے ہوئے عثمان پورہ کالونی پہنچے جہاں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ میرے گھر والے سول لائن والے کرائے کے کمرے میں تھے۔ ہم لوگوں نے کمرہ بند کر کے وہیں پر سارے روپے گنے، وہ کل رقم ایک کروڑ دس لاکھ نکلی۔

وہ ہنڈا موٹر سائیکل اندر کھڑی کر دی۔ پھر روپوں سے بھرے دونوں بیگ پتنگوں کے ڈھیر کے درمیان میں چھپا دیئے اور اپنے بھائی کو فون کر کے بلوا لیا۔ اس نے کچھ دن پہلے ہی گیئر والی سائیکل سات ہزار میں خریدی تھی۔ بھائی کے آنے پر اُس کی گیئر والی سائیکل اشرف کو دلوا دی۔ اشرف روپوں سے بھرا ایک بیگ لے کر اپنے گھر چلا گیا اور روپے اپنے گھر میں رکھ کر سائیکل سے میرے پاس آ گیا۔ اس بار سائیکل گھر میں کھڑی کر دی اور میں اپنی یاماہا موٹر سائیکل سے اور اشرف ہنڈا موٹر سائیکل سے دوسرا بیگ لے کر اشرف کے گھر کی طرف چلے۔ میں آگے آگے چل رہا تھا، اشرف میرے پیچھے تھا۔ جب ہم لوگ باغ جناح پارک کے پاس پہنچے تو ہنڈا کی چین ٹوٹ گئی۔ جسے اشرف نے وہیں چھوڑ دیا اور میری بائیک پر بیٹھ کر اپنے گھر پہنچا۔ اشرف نے دونوں بیگ اپنے اوپری کمرے کے مچان میں رکھ دیئے۔ ساہر کو پہلے ہی بتا دیا تھا کہ بینک لوٹنے کے بعد وہ وہیں سے اپنے گھر چلا جائے گا۔ میں تو اشرف کے گھر سے واپس چلا آیا۔ موبائل سیٹ و سم اسی دن توڑ کر بند پڑے ٹی وی کے اندر ڈال دیئے تھے۔ اُدھر رات گئے سناٹے کا فائدہ اٹھا کر اشرف نے ثبوت مٹانے کی غرض سے ہنڈا موٹر سائیکل کو آگ لگا دی اور چپ چاپ اپنے گھر بھاگ گیا۔

اگلے دن اشرف نے مجھے بیس لاکھ 53 ہزار

روپے دیئے۔ اُسی دن ہم لوگ مال روڈ پر گئے، یہاں سے سام سنگ گلیکسی ٹیب موبائل لیا۔ اسی دُکان سے اشرف نے بھی موبائل اور کچھ کپڑوں کی خریداری کی۔ پندرہ ہزار روپے پتنگ والے کے اُدھار چکتا کیے اور پچاس ہزار پانچ سو روپے گڑیا ماں کا اُدھار چکایا۔ اگلے دن میں اپنے گھر والوں کو لے کر لاہور چلا گیا۔ مال روڈ پر واقع ایک ہوٹل میں سات دن رہا جس کا کرایہ بیس ہزار چکتا کیا۔ اس دوران ڈیفنس میں ایک کوٹھی کرایہ پر لے لی۔ انہی دنوں میں واپس گلاب پور آیا اور ٹرک سے اپنا سامان لاہور لے گیا۔ ٹرک کا کرایہ بیس ہزار روپے دیا۔ ایک لاکھ روپے اپنے بھائی ہارون کے کھاتے میں بینک آف پنجاب کی برانچ میں جمع کیے۔ اس طرح لوٹ کی رقم سے ہی کافی روپیہ کھانے پینے میں خرچ کر دیا۔

اسی طرح ساہر اور اشرف نے بھی اقبال جرم کر لیا۔ تینوں سے پولیس نے لوٹ کی کافی رقم برآمد کی۔ ساہر نے فیس کے 50 ہزار روپے جمع کرائے تھے جو کالج انتظامیہ نے پولیس کو واپس کر دیئے۔ اسی طرح پتنگوں والے اور گڑیا ماں سے بھی رقم واپس مل گئی۔ پولیس نے تینوں کو عدالت میں پیش کیا۔ جہاں سے انہیں سیدھے جیل بھیج دیا گیا۔ بینک آف پنجاب نے پولیس کی پوری ٹیم کو اعزاز بخشا اور اپنے ملازم طارق و گاہک روحہ علی کو بھی بلاخوف حوصلہ دکھانے کے لئے اعزاز دیا گیا۔

> جس طرح کسی خلائی جہاز کو مدارِ ارضی کی گرفت سے نکلنے کے لئے ایک انتہائی بلند رفتار کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح ہمیں بھی اپنے مخصوص میلانات و تعصبات سے بالاتر ہونے کے لئے بہت زیادہ قوتِ ارادی درکار ہے۔

❁❁❁

ضربِ سکندری

باعثِ ذلت یا باعثِ شرمندگی

یہ امر حیران کن ہے اور اہل ہند کے لئے مقام عبرت بھی کہ
ایک تمیں کی برتری کے باوجود اور وہ بھی اپنی ہی سرزمین پر ہم غلام بن گئے
اور وہ بھی چند دنوں یا چند سالوں کے لئے نہیں بلکہ کم وبیش دوسو سالوں کے لئے۔

سکندر خان بلوچ

شکست و فتح جنگ کا حصہ ہوتی ہیں۔ اکثر چھوٹی افواج بڑی افواج پر غالب آ جاتی ہیں جس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ جنگِ بدر میں بھی یہی کچھ ہوا تھا کہ 313 کا مسلمان لشکر ایک ہزار کفار پر غالب آ گیا۔ اگر اس جنگ کا تجزیہ کیا جائے تو دو وجوہات سامنے آتی ہیں۔ اوّل: جنگی قیادت اور دوم: جنگی جذبہ۔ اُس وقت مسلمانوں میں یہ دونوں چیزیں بدرجہ اُتم موجود تھیں۔ جنگی قیادت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ میں تھی اور یہ مٹھی بھر مسلمان جذبہ اسلام سے بھی سرشار تھے۔ جس فوج میں یہ دونوں صلاحیتیں موجود ہوں وہ ہمیشہ فتح سے ہمکنار ہوتی ہے۔ یہی صلاحیتیں مسلمانوں کے اُس لشکر میں بھی تھیں جو طارق بن زیاد کی قیادت میں ساحل اندلس پر لنگر انداز ہوا اور اندلس کا مالک بن گیا۔

اسی اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے جب ہم بّرِ صغیر میں برطانوی جنگوں کا تجزیہ کرتے ہیں تو ہمارا سر شرم اور ذلت سے جھک جاتا ہے۔ برطانیہ ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے جو کم وبیش بّرِ صغیر سے 6 ہزار میل دُور ہے۔ خشکی کا کوئی راستہ نہیں کہ وہاں تک پہنچا جا سکے یا وہاں کے لوگ یہاں تک پیدل مارچ کرتے ہوئے پہنچ جائیں لیکن حیران کن بات یہ ہے کہ وہاں سے لوگ آ کر یہاں حکمران بن گئے۔ جب انگریز برصغیر میں آئے تو وہ محض تاجر تھے اور وہ تاجروں کی طرح مختصر سی جماعت کے ساتھ یہاں پہنچے۔ آئے بھی صرف ایک جہاز میں تھے جس پر اگر قبضہ کر لیا جاتا تو وہ تڑپ تڑپ کر مر جاتے واپس اپنے وطن نہ جا سکتے۔ (1608 میں ہیکٹر نامی 500 ٹن وزنی صرف ایک جہاز جنوبی ہند کی بندرگاہ "سورت" پر لنگر انداز ہوا۔ یہ جہاز کیپٹن ہاکنز نامی شخص کمانڈ کر رہا تھا۔) اُس دور میں ہوائی جہاز بھی نہ تھے کہ ایک ہی دن میں واپس

پہنچ سکتے یا مزید کمک یہاں آسکتی۔

جب انگریزوں نے سرزمین ہند پر قدم رکھا تو مغل حکومت عروج پر تھی۔ وسائل بھی بے انتہا تھے اور انہی وافر وسائل کی وجہ سے ہندوستان سونے کی چڑیا کہلاتا تھا۔ بھوکی ننگی یورپی اقوام ہندوستان پہنچنے کے لئے بے قرار تھیں۔ اُس دور میں نہر سویز بھی نہ تھی کہ برطانوی ایک دو ہفتوں میں یہاں پہنچ جاتے بلکہ انہیں آدھی دُنیا کے گرد چکر لگا کر یہاں آنا پڑتا تھا۔ وہ انگلستان سے روانہ ہو کر مغربی یورپ کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے مراکو تک پہنچتے تھے اور پھر پورے افریقہ کے گرد چکر لگا کر سورت جنوبی ہندوستان تک پہنچتے تھے۔ کچھ تاریخی حوالوں سے یہ کم از کم 9 ماہ کا سفر تھا۔ Navigation کے طریقے بھی جدید نہ تھے جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ کولمبس یورپ سے ہندوستان کے لئے روانہ ہوا اور ہندوستان کی بجائے شمالی امریکہ جا پہنچا ...... ان حالات پر جب غور کیا جائے تو کوئی ذی ہوش انسان یہ قبول نہیں کر سکتا کہ برطانوی تاجروں کی یا ملاحوں کی اتنی دُور سے بے سروسامانی کی حالت میں یہاں پہنچنے والی چھوٹی سی ٹولی اتنے بڑے برصغیر کی مالک بن گئی۔ اتنی بڑی ہندی افواج کو شکست دی اور شکست بھی مکمل برطانوی فوج کے ساتھ نہیں بلکہ ان انگریزی تاجروں کی قائم کردہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم سپاہیوں کے ساتھ یعنی وہی سپاہی جب اپنے وطن کی طرف سے وطن کی حفاظت کے لئے لڑے تو ریت کی دیوار ثابت ہوئے لیکن جب انگریزی کمان کے تحت لڑے تو اپنے سے کئی گنا بڑی اپنے ہی وطن کی افواج کو تہس نہس کر ڈالا۔ سمجھ نہیں آتی ایسا کیونکر ہوا۔

سترویں صدی کے شروع میں برطانیہ کی کل آبادی بمعہ آئرلینڈ پچاس لاکھ کے لگ بھگ تھی اور ظاہر ہے کہ یہ تمام کے تمام لوگ فوجی نہ تھے اور نہ ہی یہ سب لوگ برصغیر آسکتے تھے۔ اُس وقت کے برصغیر کی آبادی تقریباً 15 کروڑ تھی۔ اگر پوری برطانوی آبادی کا تناسب بھی نکالا جائے تو اہل ہند کو ایک کے مقابلے میں تیس کی برتری حاصل تھی جبکہ جنگ بدر میں اہل کفار کو ایک کے مقابلے میں تین کی برتری حاصل تھی۔ یہ امر حیران کن ہے اور اہل ہند کے لئے مقام عبرت بھی کہ ایک تیس کی برتری کے باوجود اور وہ بھی اپنی ہی سرزمین پر ہم غلام بن گئے اور وہ بھی چند دنوں یا چند سالوں کے لئے نہیں بلکہ کم وبیش دو سو سالوں کے لئے۔

یہ امر مزید حیران کن ہے کہ برصغیر میں دوسری جنگ عظیم کے دوران زیادہ سے زیادہ برطانوی فوج جسے گورا فوج کہا جاتا تھا وہ صرف ساٹھ ہزار تھی اور کسی ایک وقت میں زیادہ سے زیادہ سول بیوروکریٹ بشمول تمام ملازمین دو ہزار سے زائد نہ تھے۔ بالالفاظ دیگر انگریزوں نے محض 62 ہزار برطانوی اشخاص کی مدد سے 40 کروڑ ہندوستانیوں اور 37 لاکھ مربع کلومیٹر پر حکومت کی۔ یاد رہے کہ 1941 تک ہندوستان کی آبادی بڑھ کر 40 کروڑ تک پہنچ چکی تھی۔ اس حساب سے تو تناسب فی برطانوی چھ ہزار ہندوستانی بنتا ہے اور اگر فوج کا حساب بھی لگایا جائے تو دوسری جنگ عظیم میں 60 ہزار برطانوی فوج کے علاوہ 21 لاکھ ہندوستانی فوج بھی تھی جنہیں برطانوی آفیسرز کمان کر رہے تھے یعنی ایک گورے سپاہی کے مقابلے میں تقریباً 35 مسلح ہندوستانی سپاہی تھے۔ پھر بھی حکومت انگریزوں کی ہی رہی۔ ایک اچھا اور پھرتیلا گڈریا بھی بیک وقت 20 سے 25 بھیڑوں کو قابو میں رکھ سکتا ہے یا 15 سے 20 بڑے جانوروں کو۔ لیکن یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک گڈریا ہزاروں کی تعداد میں جانوروں کو اپنے قابو میں رکھ سکے چہ جائیکہ انسانوں کو لیکن ہم تو جانوروں سے بھی بدتر نکلے۔ 40 کروڑ کی تعداد میں ہوتے ہوئے 62 ہزار کی غلامی میں رہے ...... غلامی

اور تابعداری اس حد تک کہ کم و بیش اڑھائی لاکھ ہندوستانیوں نے انگریزوں اور انگریزی حکومت کے لئے جان دے دی۔ یہ لوگ مختلف محاذوں پر برطانیہ کی طرف سے لڑتے رہے۔ تقریباً 12 لاکھ ہندوستانی انگریزی پالیسیوں کی وجہ سے مارے گئے ان میں 10 لاکھ افراد تو صرف 1947 کی تقسیم ہند میں مارے گئے حالانکہ انگریز اس مسئلے کو صحیح صفائی سے حل کرا سکتے تھے اور تقریباً 2 لاکھ کے لگ بھگ اُن انگریزی جنگوں میں کام آئے جو انگریزوں اور مقامی راجوں مہاراجوں کے درمیان ہوئیں۔

1857 میں جنگ آزادی کے وقت کل انگریزی فوج کی تعداد 45 ہزار برطانوی تھے اور تقریباً اڑھائی لاکھ کے قریب ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیرسایہ ہمارے لوگ فوجی ملازمت کرتے تھے جو 'Native Infantry' یعنی مقامی انفنٹری کہلاتے تھے۔ یہ لوگ کلکتہ سے پشاور تک مختلف چھاؤنیوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ اُس وقت جبکہ نقل و حرکت اور مواصلاتی وسائل بھی نہ ہونے کے برابر تھے لہٰذا 45 ہزار برطانوی فوج کے لئے اڑھائی لاکھ کی فوج جو کہ 37 لاکھ مربع کلومیٹر میں پھیلی ہوئی تھی کو قابو میں رکھنا یقیناً آسان کام نہ تھا۔ انگریزی حکومت کی طرف سے فوجی نظم و ضبط قائم رکھنا واقعی قابل ستائش عمل تھا۔ 1857 میں جب فوجی بغاوت ہوئی تو یہ بغاوت میرٹھ سے شروع ہو کر پشاور تک پہنچ گئی۔ ہندی سپاہی انگریزوں کے ساتھ لڑنے کے لئے اور اپنی جان دینے کے لئے تو تیار تھے لیکن بدقسمتی سے اُن کے پاس کوئی قومی سطح کی قیادت نہ تھی جس کے ارد گرد وہ اکٹھے ہوتے اور اُس کی زیرقیادت لڑتے۔ لے دے کر آخری مغل حکمران بہادر شاہ ظفر تھا جو بادشاہ سے زیادہ درویش تھا یا شاعر تھا۔ اُس میں بڑی فوج کی قیادت کرنے کی صلاحیت ہی نہ تھی نہ ہی اُس کے پاس کوئی تجربہ کار جرنیل تھے جو افواج کو لڑا سکتے۔ دوسری بدقسمتی یہ تھی کہ بغاوت کرنے والی فوج میں ہندی آفیسرز نہ تھے۔ اُس وقت تک کسی بھی ہندوستانی کے لئے سب سے بڑا رینک صوبیدار تھا اور یہ لوگ زیادہ تر راجوں اور مہاراجوں کی اولادیں تھیں جنہیں یہ رینک ان راجوں کو قابو میں رکھنے کے لئے اعزازی طور پر دیا جاتا تھا اور یہ لوگ برٹش آفیسرز اور ہندی فوج کے درمیان محض رابطے کا کام دیتے تھے۔ یہ لوگ جنگی قیادت کے اہل نہ تھے۔

ان حالات میں بغاوت کرنے والے فوجی ملک کے طول و عرض سے دلی کی طرف بھاگے تاکہ بادشاہ سلامت کی قیادت میں لڑیں۔ تقریباً 80 فیصد فوج باغی ہو کر بھاگ گئی۔ بہت سے لوگ راستے کی مشکلات کا شکار ہو کر مارے گئے اور ایک بڑی تعداد کو انگریزی افواج نے چن چن کر مار دیا .... مثلاً پشاور اور گرد و نواح

بیٹی

(پیاری بیٹی ثمینہ انور کے نام جو کمسنی میں فوت ہوگئی)

محمد ادریس انور کھوٹ

تم نے تو کہا تھا عید پہ آ جاؤں گی
لوٹ آؤ جان پدر عید آئی ہے

بابا سے بچھڑنے کا کب سوچا تھا تُو نے
یہ کیسا وچھوڑا ہے، کیسی یہ جدائی ہے

جنت کی فضاؤں میں پرواز تیری ہر دم
وہ کیسی دنیا ہے جو تُو نے بسائی ہے

حوروں نے تجھے ہاتھوں ہاتھوں لیا ہوگا
لگتا ہے ستاروں نے تیری مانگ سجائی ہے

جدا ہو کے جو ہم سے، رخت سفر باندھا
مڑ کے بھی نہ دیکھا کیسی قیامت ڈھائی ہے

نوشہرہ، مردان میں تقریباً 3 ہزار انگریز فوج اور 12 ہزار ہندی فوج موجود تھی۔ صرف پشاور چھاؤنی میں دس ہزار مقامی فوج موجود تھی۔ یہ سب لوگ بغاوت کر کے بھاگ گئے لیکن انگریز فوج کی بہادری اور جرأت کی داد دینا پڑتی ہے کہ اس تین ہزار فوج نے 10 ہزار بھاگنے والی فوج کا پیچھا کیا اور اکثریت کو مار دیا۔ اس جرأت مندانہ قدم سے کم از کم اس علاقے میں مزید بغاوت رُک گئی اور بعد میں مقامی فوج نے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ انگریزی فوج پنڈی، کوہاٹ، پشاور، نوشہرہ اور جالندھر سے مقامی فوجی یونٹس لے کر مقابلے کے لئے دلی پہنچی۔

جنگ کا آخری محاذ دلی شہر تھا۔ 45 ہزار کی انگریز فوج اور اتنی ہی تعداد مقامی انفنٹری کی تھی۔ ان یونٹوں نے دلی کا محاصرہ کیا۔ دلی میں ایک بہت بڑی ہندوستانی فوج موجود تھی۔ اسلحے کی بھی کمی نہ تھی۔ انگریزوں نے مقابلہ کرنے سے پہلے دلی کے اندر رہائش پذیر کچھ نوجوانوں اور دیسی افواج کے سپہ سالاروں کو خریدا اور جاسوسی کا ایک مربوط نظام قائم کر دیا اور یوں پل پل کی خبریں انگریزوں تک پہنچنے لگیں۔ اس کے بعد دلی کا قبضہ محض رسمی کارروائی ثابت ہوئی۔ اس بغاوت میں مقامی فوج کے کئی ہزار سپاہی مارے گئے اور برطانوی فوج کا بہت کم نقصان ہوا۔

برطانوی بیٹھے بٹھائے تو ہندوستان کے مالک نہیں بنے تھے۔ انہوں نے کئی خوفناک جنگیں بھی لڑیں لیکن حیران کن بات یہ ہے کہ مٹھی بھر انگریز فوجیوں نے اپنے سے کئی گنا بڑی فوجوں کو نہ صرف شکست دی بلکہ وہ اُن کے سامنے محض ریت کی دیواریں ثابت ہوئیں۔ انگریزوں کی کامیابی کی سب سے بڑی وجہ ایک موثر نظام جاسوسی اور مقامی سپہ سالاروں کی خرید تھی۔ مثلاً پلاسی کی جنگ میں نواب سراج الدولہ کی افواج کی تعداد 50 ہزار پیادہ اور 18 ہزار گھڑسوار تھی۔ جنگ کے لئے 53 عدد بھاری توپیں بھی تھیں۔ اُس زمانے کے مطابق یہ فوج مکمل تربیت یافتہ اور ہتھیاروں سے لیس تھی۔ انگریزی فوج لارڈ کلائیو کی زیر کمان محض 750 برطانوی سپاہیوں، 150 توپخانہ کے لوگ اور تقریباً 2 ہزار مقامی سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ یہ تعداد ہر لحاظ سے معمولی تھی اور ایک دلیر جرنیل ایک دن میں 50 ہزار کی فوج کے ساتھ اس چھوٹے سے دستے کی تباہی لا سکتا تھا مگر کلائیو نے سراج الدولہ کے سپہ سالار میر جعفر کو خرید رکھا تھا۔ لہٰذا 50 ہزار کی مقامی فوج 750 برطانوی سپاہیوں سے شکست کھا گئی۔ یہی کچھ ٹیپو سلطان کے ساتھ بھی ہوا۔ اسی طرح 1760ء میں اُس وقت کے بادشاہ ہندشاہ عالم اور اودھ کے نواب شجاع الدولہ نے مل کر ایسٹ انڈیا کمپنی کو سبق سکھانے کے لئے 40 ہزار کا جری لشکر تیار کیا۔ اتنے بڑے لشکر کو دیکھ کر ہی ایک کمانڈر کا خون خشک ہو جاتا ہے لیکن انگریز ہندوستانیوں کی کمزوریوں سے واقف تھے۔ لہٰذا بغیر گھبراہٹ اور پریشانی کے انہوں نے مقابلے کا چیلنج قبول کیا۔ 27 اکتوبر 1764ء کو میجر منرو Munro محض 850 برطانوی تقریباً 18 ہزار مقامی فوجیوں کے ساتھ میدان جنگ میں خیمہ زن ہوا اور اُس نے اس 40 ہزار کے جری لشکر کو بُری طرح شکست دی۔ کہا جاتا ہے کہ کئی ہزار آدمی مارے گئے۔

انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستانی فوج کی اتنی بڑی شکستیں ناقابل فہم ہیں۔ اگر 45 ہزار فوجیوں کو بھیڑیں مارنے پر بھی لگا دیا جائے تو وہ پونے دو لاکھ بھیڑیں نہیں مار سکتے جو انہوں نے 1857ء کی جنگ آزادی میں ہندوستانی مارے۔ 1840ء کی دہائی میں جنرل جیکب کی زیر کمان جب انگریزوں نے سندھ پر قبضہ کیا تو اُن کے حوصلے اتنے بڑھ چکے تھے کہ ایک انگریز لیفٹیننٹ نے دعویٰ کیا تھا کہ اگر اُسے ایک کمپنی برطانوی سپاہیوں کی دے دی جائے تو وہ پورا بلوچستان فتح کر سکتا ہے۔ (جاری ہے)

ہم سب کے لئے شرم اور ڈوب مرنے کا مقام ہے۔
کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ برطانوی افواج اپنے اعلیٰ ہتھیاروں کی وجہ سے کامیاب ہوئی لیکن یہ دعویٰ بھی صحیح نظر نہیں آتا کیونکہ اُس ابتدائی دور میں فوج کے پاس محض دو قسم کے ہتھیار تھے ایک تو توپخانہ تھا اور اُس زمانے میں توپ کی حدِ فائر محض ایک ہزار گز تک تھی اور رفتار تین منٹ میں ایک گولہ۔ دوسرا ہتھیار ایک بزو کہ قسم کی بندوق تھی جس کی فائر رینج محض پچاس گز تک تھی اور ہر فائر کے بعد کھو کھا نکال کر دوبارہ لوڈ کرنا پڑتی تھی۔ یوں رفتار ایک منٹ میں ایک گولی تھی۔ ان ہتھیاروں کے ساتھ دلیر سے دلیر سپاہی بھی حملہ آور فوج کا بہت زیادہ نقصان نہیں کر سکتا تھا۔ ایک دلیر حملہ آور کیولری کمانڈر تین منٹ میں فائر کرنے والے کے سر پر پہنچ سکتا تھا۔ لہٰذا یہ مفروضہ غلط ہے کہ انگریزوں کے پاس زیادہ اچھے ہتھیار تھے۔ واحد فرق یہ تھا کہ انگریزوں کے لئے جنگ زندگی اور موت تھی لہٰذا وہ جرأت سے لڑے اور عقل کا استعمال کیا جبکہ ہندوستانی حکمران اور افواج آرام پسند اور شدید جنگ کے لئے قطعاً مائل نہ تھے۔ لہٰذا یا تو افواج دوڑ جاتی تھیں یا گاجر مولی کی طرح کٹ جاتی تھیں۔ دلیرانہ مقابلہ کرنے کے قابل ہی نہ تھیں اور نہ ہی اُن کے کمانڈرز لڑنے کے اہل تھے۔ اس کے علاوہ اہم ہتھیار تلوار تھی جس میں دیسی لوگوں کا پلہ بھاری تھا لیکن پھر بھی یہ کچھ نہ کر سکے۔ یہ بھی غلط ہے کہ یورپی اقوام دیسیوں سے زیادہ عقلمند اور زیادہ دلیر تھیں۔ جہاں جم کر مقابلہ ہوا یورپیوں کی ہار ہوئی۔ یہاں دو مثالیں قابل غور ہیں۔

1841ء میں 18 ہزار برطانوی فوج افغانستان پر حملہ آور ہوئی۔ شدید جنگ لڑی لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔ نامراد واپس لوٹی۔ کابل سے واپسی پر افغانیوں نے فوج کو بہت زیادہ نقصان کیا لیکن جب انہیں ہمارے موجودہ قبائلی علاقے سے گزرنا پڑا تو قبائلیوں نے انگریز فوج کو اپنی آزادی کے لئے خطرہ سمجھا۔ لہٰذا کمر کس کے مقابلے کے لئے آ گئے۔ اُن کے پاس کوئی خاص ہتھیار بھی نہ تھے نہ ہی فوجی تنظیم تھی۔ انہوں نے فوج کی واپسی کا راستہ بند کر دیا پے در پے حملے کر کے مکمل فوج کو تباہ کر دیا۔

18 ہزار کے لشکر میں سے صرف ایک ڈاکٹر زندہ بچا۔

دوسری مثال جاپان کی ہے۔ جاپان اُس دور میں ترقی کے لحاظ سے ہندوستان سے بہت پیچھے تھا۔ 1854ء میں امریکن نیوی کا کموڈور پیری Perri بمعہ ایک بڑے نیول دستے کے جاپان کے ساحل پر لنگر انداز ہوا۔ اُس کا مقصد بھی تجارت تھا اور تجارت کی آڑ میں قبضہ۔ خوش قسمتی سے جاپان کی قیادت بڑی ہوشیار، عقلمند اور دُور رس سوچ کی حامل تھی۔ انہوں نے تجزیہ کیا کہ امریکن ان سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ لہٰذا انہوں نے امریکیوں کو خوش آمدید کہا۔ امریکن طرز کی تعلیم رائج کی۔ ان سے علم و ہنر سیکھا۔ امریکن طرز پر ان کی مدد سے انڈسٹری قائم کی اور نصف صدی کے عرصہ میں اتنی ترقی کی کہ 1905ء میں جب روس نے ایک بہت بڑے بحری بیڑے کے ساتھ جاپان پر حملہ کیا تو جاپانیوں نے جاپان کے اپنے بنے ہوئے جہازوں سے نہ صرف اس حملے کا مقابلہ کیا بلکہ تمام روسی بحری بیڑے کو سمندر میں غرق کر دیا۔ دوسری جنگ عظیم لڑنے اور ایٹمی حملے برداشت کرنے کے باوجود جاپان آج بھی آزاد ہے اور ایک معاشی طاقت ہے۔ ہم بالواسطہ طور پر آج بھی غلام ہیں اور معاشی طور پر بھکاری اور مفلوک الحال۔ آئیں اپنی کارکردگی کا تجزیہ کریں اور زمانے کے ساتھ چلنے کی کوشش کریں ورنہ ہمیشہ کے لئے مٹ جائیں گے (خدا نخواستہ)۔

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

❁❁❁

وردی کا تقدس

میرا ایمان ہے کہ اگر ہمارے معاشرے کو ایماندار پولیس مل جاتی تو کم از کم نصف معاشرتی برائیاں ختم ہو چکی ہوتیں۔

☆ .... ڈاکٹر مبشر حسن ملک

وردی کی اپنی ایک عظمت ہوتی ہے، تقاضے بھی۔ وردی کسی مشن کے تحت پہنی جاتی ہے جو دھرتی ماں با وردی سپوتوں کو سونپ دیتی ہے۔ وہ کڑیل اور جیلا جوان تھا، پولیس افسر، جو تنہا کئی ڈکیتوں کا مقابلہ کر رہا تھا، پھر سینے میں پیوست گولیاں سجائے شہید ہو گیا۔ میں نے سارا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ حتیٰ کہ اس کا بدن تابوت میں بند کر دیا گیا تھا اور لکڑی کے اس باکس پر شہید کے تمغے سجا دیے گئے تھے۔ ان تمغوں کے ساتھ اس کی کیپ بھی پڑی تھی جو وردی کے اس تقدس کی غمازی کرتی ہے جس کی آن کے دفاع میں شہید نے اپنی جان دی تھی۔

وہ سال میرے لڑکپن کے تھے۔ اس دور کے واقعات ذہن پر گہرا اثر کرتے ہیں۔ پھر یہ تاثر بڑا دیرپا ہوتا ہے، شاید عمر بھر کے لئے اسباق دے جاتا ہے۔ تب

اس شہید کا نام نہ جان سکا۔ جانتا تو بھی شاید نہ لکھتا کیونکہ وہ میرا ہیرو تھا، صرف ہیرو، جو اپنا نصب العین میرے ذوقِ حیات میں سجا گیا تھا.. میں ایسے تمام جاں نثاروں کو سلام پیش کرتا ہوں جو اپنی جان انسان اور وطن پر قربان کر دیتے ہیں۔

کبھی زندگی میں محافظانِ وطن کا تصور ابھرا تو وہی شہید میرے ذہنی آفاق پر مسکرانے لگا، پھر عجب سی خواہش لہو میں سرایت کرتی تھی کہ کاش! تمام وردی پہننے والے قربانی کے اسی سانچے میں ڈھل جائیں جسے اہلِ وطن بے ساختہ تکریم دے سکیں۔ پھر ایک روز قسمت نے مجھ کو بھی فوجی وردی زیب تن کرا دی مگر میں اپنے لڑکپن کے ساتھی ہیرو کو کبھی نہ بھول سکا بلکہ اس کو ان تمام شہیدوں کی جمعیت میں احترام دیتا رہا جو فوجی ادوار میں میری کتابِ زیست پر اپنے نقوش چھوڑتے رہے۔

مجھے اپنا ہیرو زندگی میں کئی بار یاد آیا، ان وقتوں میں بھی جب میں اسے خیالوں سے دور رکھنا چاہتا تھا بلکہ شاید یادوں سے محو کر دینا چاہتا تھا تاکہ اسے شرمندگی کے اس لبادے میں نہ دیکھ سکوں جو معاشرے کی ہوس ناکیوں نے گزرتے ادوار میں شعبہ ہائے زندگی کو پہنا ڈالا ہے کیونکہ مجھے اپنا ہیرو جب بھی کرب میں نظر آیا، بے حد ذہنی اذیت کا سامنا کرنا پڑا۔

ان دنوں کی بات ہے جب ہم ریگزاروں میں دفاعِ وطن کر رہے تھے۔ مشکل دور تھا گرمی اپنے زوروں پر تھی۔ صحرا میں قدرتی سائے ناپید تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ شمس کی حدت نے ہمارے رنگ و روپ کو جھلسا دیا تھا۔ تپتی دھوپ میں کبھی ریگِ صحرا پر نکلتے تو اس طور دکھتے کہ دشمن ہمارے گرد منڈلاتی صحرائی مکھیاں بھی کھوج لیا کرتا تھا۔ ہمیں سونپے گئے فرائض اور ان کی بجا آوری کے باعث اہلیانِ وطن چین کی نیند سو سکتے تھے۔

کبھی چھٹی ملتی تو ہمیں گھر بے تحاشہ یاد آنے لگتا۔ دل چاہتا کہ کاش وجود کو پروں کا سہارا مل جائے اور ہم ساعتوں کا فاصلہ لمحوں میں طے کر لیں۔ ہوم وزٹ کی یہ سہولت کبھی کبھار ملتی تھی۔ ایسا ہی ایک ناخوشگوار سفر میری یادوں میں جاگزیں اور اَن مٹ نقوش چھوڑ گیا۔ مجھے آج بھی یاد ہے میں اپنی کار میں محوِ سفر تھا کہ ایک چوکی پر پولیس نے میری گاڑی روک لی، وہاں اور بھی گاڑیاں کھڑی تھیں۔

چوکی کا انچارج مجھے یوں گھورنے لگا جیسے میں کوئی جرائم پیشہ شخص تھا۔ میرا قصور کیا تھا، میں نہ جان سکا۔ مجھے گاڑی سے باہر آنے کا حکم دیا گیا، جو میں نے مان لیا۔ میری گاڑی کی تلاشی کے بہانے میرا سامان سڑک پر بکھرا دیا گیا بعد میں علم ہوا کہ میں صوبۂ پنجاب کی حد میں داخل ہو رہا تھا اور میں نے دیگر افراد کی طرح جیب سے سو روپیہ نکال کر چوکی کے باسیوں کی مٹھی گرم نہیں کی تھی۔ اس نے سیدھے سادے لفظوں میں فرمائش دہرائی بھی تھی۔ ناکردہ جرم کی یہ سزا ملی تو میں غصے میں لال پیلا ہو گیا۔

"تم کس سرحد کی بات کرتے ہو، ایک سرحد سے تو میں آیا ہوں"۔ میں نے کہا۔ اس کے بعد میں لگاتار بولنے لگا۔ "سرحد تو وہ ہے، جہاں ماؤں کے تنومند لعل ارضِ وطن اپنے لہو سے سینچ رہے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ تم جیسے حشرات الارض عوام الناس کی حلال کمائی جیبوں سے نکلوا کر ان کے لئے جہنم کا سامان پیدا کریں۔ خدا کا خوف کرو، تم تو نار میں جاؤ گے ہی، ان کو بھی مرتشی کے طور ساتھ لے جاؤ گے"۔

اگلے لمحے "محافظ" کی بپھری، مگر جرم سے تھرتھری ہوئی آواز میری سچائی کے لہجے میں دب کر نحیف ہو گئی۔ مجھے لگا جیسے میرے دل و ذہن میں سجا ہوا ہیرو چیخ مار کر رو پڑا ہو اور اس کا جوان لاشہ قبر میں تڑپ گیا ہو۔ سفر کے دوران اس کی شہادت کا منظر میرے ذہن میں بار بار

رہا۔

اس واقعے کو بہت سال گزر گئے میرے عروج کا سورج غروب ہوگیا اور ایک نئی نسل پل کر جوان ہوگئی مگر ظالم اور مظلوم کا رشتہ بدرجہ اتم موجود رہا بلکہ شاید بڑھتا گیا۔

میں اپنی گاڑی پر پنجاب کے ایک بڑے شہر میں داخل ہو رہا تھا۔ ایک بڑا پل عبور کر کے موٹروے سے شہر کی طرف اتر رہا تھا کہ سیدھا محافظ پولیس کے "مستقل" ناکے میں گھر گیا۔ وہی منظر درپیش ہوا جسے میں ذہنی نہاں خانوں میں حقارت کی نظر سے دیکھا کرتا تھا۔ ایک طالب علم ناکے کا شکار ہو رہا تھا۔ نوجوان مجھے اپنے بیٹے کی طرح دکھائی دیا، جس کے گرد قانون کے محافظ بھیڑیوں کی طرح جمع تھے۔

"مگر میں نے تو کوئی غلطی نہیں کی؟" نوجوان کے چہرے پر پریشانی کا پسینہ جھلک رہا تھا۔

"تمہاری کار سے یہ پاؤڈر برآمد ہوا ہے"۔ ایک سپاہی نے اسے لفافہ دکھاتے ہوئے کہا۔ "نشہ کرتے ہو؟" سپاہی کی آواز بلند ہوگئی۔ ڈانٹ کا لہجہ سن کر حاضرین کا پتہ پانی ہوگیا۔

"مگر یہ لفافہ میرا تو نہیں، آپ کا ہے"۔ نوجوان نے بھولپن میں اصرار کیا۔

"کار ایک طرف لگاؤ، تلاشی ہوگی۔ تمہاری بھی اور گاڑی کی بھی"۔ ایک دوسرے بھاری بھرکم سپاہی نے اپنا حکم صادر کیا اور پیٹ سنبھالنے کی سعی کرنے لگا۔

نوجوان نے کار سڑک کے کنارے کھڑی کردی۔ پولیس کا بھاری بھرکم سپاہی نوجوان کی تلاشی پر مامور ہو گیا۔ چند لمحوں بعد نوجوان کا پرس سپاہی کے ہاتھوں میں کھل رہا تھا۔ چند دیگر حریص نگاہیں بھی پرس پر مچل رہی تھیں۔

"اوئے، اس میں تو صرف پانچ سو روپے ہیں"۔ سپاہی نے تقریباً چلاتے ہوئے کہا۔

"جی مجھے گھر سے روزانہ اتنے ہی ملتے ہیں"۔ نوجوان نے دوبارہ معصوم سا جواب دیا۔

"اوئے، کوئی پٹرول، ڈیزل کے پیسے نہیں ملتے؟ گاڑی ہے، راستے میں اچانک خراب بھی ہو سکتی ہے؟"

"میرے پاس اے ٹی ایم کارڈ موجود رہتا ہے"۔ نوجوان نے معصوم رویہ برقرار رکھا۔

"کسی دوست وغیرہ کو بلاؤ، اس کے ہمراہ جاؤ اور کم از کم پندرہ ہزار کے نوٹ ساتھ لے کر آنا"۔ سپاہی نے کچھ اس انداز میں کہا جیسے وہ اپنی تنخواہ وصول کر رہا تھا۔ "نشہ آور اشیاء کا گاڑی سے برآمد ہونا بڑا کیس بن سکتا ہے"۔ اس نے نوجوان کو گھورتے ہوئے بات ختم کی۔

تمام معاملہ دیکھ کر میرا جی کڑھنے لگا۔ مجھے نوجوان پر بہت ترس آیا۔ میں نے اپنی گاڑی ایک طرف روکی اور آؤ دیکھا نہ تاؤ، وہ سب کچھ کہہ دیا جو میں عموماً نہیں کہتا مگر اس دم موقعے کی مناسبت سے ضروری تھا۔ اس روز میرے ذہن میں بسا سپاہی کا تصوراتی روپ ایک بار پھر چکنا چور ہوا۔ میں دیر تک بے حد بے چین رہا۔ وہ کام بھی نہ کر سکا جس کے لئے عازم سفر ہوا تھا۔

اب میں اس واقعے کی طرف چلتا ہوں جس کی وجہ سے میں نے یہ تحریر مرتب کی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس غیر متوقع حادثے نے مجھے ہلا کر رکھ دیا اور اس میں مجھے معاشرے کا گھناؤنا چہرہ عیاں نظر آیا۔

ڈرامے کا مرکزی کردار میرا انیس سالہ بیٹا شرجیل تھا جو ایک بڑے شہر میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ میں نے اسے کالج کے قریب چھوٹا سا فلیٹ کرائے پر دلا رکھا تھا۔ اس کے پاس اپنی چھوٹی سی گاڑی بھی تھی۔ عمارت میں اس کے کالج کے چند دیگر طلباء بھی مقیم تھے۔

ایک منحوس سہ پہر مجھے اجنبی نمبر سے ٹیلی فون کال

معمول ہوئی کہ میرا بیٹا گزشتہ شام سے لاپتہ تھا۔ اس کی گاڑی بھی عمارت میں موجود نہیں تھی۔ پیغام سن کر میرے اوسان خطا ہو گئے اور پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی۔

"مجھے تفصیلات معلوم کر کے بتائیں"۔ میں نے اجنبی کالر سے درخواست کی اور اپنے دل کی دھڑکن پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ میری بیگم بے حد پریشان ہو گئی۔

"علم میں آیا ہے کہ آپ کے بیٹے کو پولیس نے کل شام اٹھایا تھا اور اب کسی نامعلوم مقام پر پہنچا دیا ہے"۔ ٹونی نے ذرا دیر بعد مجھے بتایا۔

یہ کٹھن وقت ہمت کا تقاضا کرتا تھا۔ بیگم کی کیفیت سے آگاہ تھا اس لئے اسے ہمراہ لیا، ڈرائیور کو گھر سے بلایا، گاڑی نکالی اور بیٹے کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ اس نوع کے سفر بڑی مشکل سے کٹا کرتے ہیں۔

بیگم نے مجھے بتایا کہ شام بیٹے سے اس کی بات ہوئی تھی۔ وہ اس وقت اپنے فلیٹ میں موجود تھا۔ کہہ رہا تھا کہ وہ باہر جانے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ بیگم اس سے اداس ہو چکی تھی اسے ملنا چاہتی تھی۔ اس کے اصرار پر بیٹے نے اگلے روز گھر آنے کی ہامی بھر لی۔

میرا ذہن اب کڑیاں ملا رہا تھا۔ میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا، بہت سارا کام باقی تھا۔ دوران سفر سیل فون سے استفادہ ممکن تھا۔ اسی واسطے سے چند دیگر تفصیلات حاصل کر لیں۔

"ہم نے کھڑکی کے راستے دیکھا"۔ شرجیل کے ہمسائے نے مجھے بتایا۔ "کمرے میں اس کا لیپ ٹاپ آن ہے۔ غالباً انٹرنیٹ چل رہا ہے۔ اس کے دونوں کی بورڈ بھی آن ہیں۔ کمرے کی تمام بتیاں روشن ہیں۔ اندازہ ہوتا ہے کہ اسے لمحہ بھر کے لئے کہیں باہر جانا پڑا ہو گا"۔ مجھے بتایا گیا۔

تھوڑی دیر بعد پیچیدگی بڑھ کر ابتدائی گتھیاں سلجھانے لگی۔ بے ربط سی کچھ اور باتیں معلوم ہوئیں۔

شرجیل پر بڑے خطرناک الزامات تھے۔ اس نے شراب سپلائی کرنے کی کوشش کی تھی اور اسی دوران دھر لیا گیا تھا۔ بات سن کر میں چکرا سا گیا۔ شرجیل پڑھنے والا لڑکا تھا۔ سمجھدار بھی ہو رہا تھا۔ ایسا گھٹیا کام کیسے کر سکتا تھا؟ جبکہ اسے اخراجات کا مسئلہ بھی نہیں تھا۔ ہم اس کی ضروریات پوری کر رہے تھے۔ افکار میرے ذہن میں گردش کرنے لگے۔ مجھے یقین ہو چکا تھا کہ میرا بیٹا حالات کا شکار ہو چکا تھا اور کسی گہری مصیبت میں پھنس گیا تھا۔

پرائے شہر میں مجھے اپنے بھائی کی مدد حاصل ہو گئی، وہ پولیس کے سینئر افسران سے رابطہ قائم کر چکا تھا۔

رات ڈھل رہی تھی، ہماری حالت غیر ہو چکی تھی۔ بھوک اور تشنگی کا گمان یاس و بیم کے جذبوں تلے دب چکا تھا۔ ہر دم بیٹے کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ اس کی عافیت کی دعائیں لبوں پر تھمنے میں نہ آتی تھیں۔

ٹونی نے بے حد مدد کی۔

"میرا تعلق انڈر ورلڈ سے ہے"۔ ٹونی نے اپنا تعارف کرایا۔ "مجھے دیکھ کر پولیس والوں کے بدن میں خون کی حرکت تیز ہو جاتی ہے"۔ وہ بولا۔ "میں رات حوالات میں بند تھا۔ وہیں شرجیل سے ملاقات ہوئی تھی۔ بے چارہ حد درجہ پریشان دکھتا تھا۔ بھوکا پیاسا تھا اور بری طرح رو رہا تھا"۔ ٹونی نے تفصیل بیان کی۔ ہماری طرف دیکھا، گرد حالات کا جائزہ لیا پھر بات جاری رکھی۔ "آج میری ضمانت منظور ہوئی ہے۔ مجھے آپ کا ٹیلی فون نمبر شرجیل نے دیا تھا۔ میں نے ازراہ ہمدردی آپ سے رابطہ قائم کیا تھا۔ میں آپ کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ مجھے آپ لوگوں کی چتا پر تاسف ہے"۔ اس نے کہا۔ اس دم وہ مجھے رحمت کا فرشتہ دکھنے لگا۔ قطع نظر اس کے کہ اس کا تعلق کسی مافیا سے تھا، میں نے اس پر بھروسہ کر لیا۔ اس کے علاوہ

شاید اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

رات کے اندھیرے میں سڑکوں پر ٹوٹی کی موٹر بائیک دھیرے دھیرے چل رہی تھی۔ ہماری گاڑیاں اس کے عقب میں رواں دواں تھیں۔ اس تواتر میں ہم نے کئی راہیں روند ڈالیں، کئی لمحوں کا عذاب جھیل ڈالا۔ مسافت تھی کہ ہر موڑ پر بڑھتی نظر آتی تھی۔ خدا خدا کر کے ہم آخر منزل شناس ہوئے۔ اونگھتی سڑکوں نے آخر ہمارے درد کا درماں کر دیا۔

بےہنگم سی عمارت پر رات کی پرچھائیاں پھیل چکی تھیں۔ ہم بوجھل قدموں کے ساتھ عمارت کے پچھلے دروازے میں داخل ہوئے۔ بجلی کے چند قمقمے چھائی گہری ظلمت کے خلاف نبرد آزما نظر آتے تھے۔ میں چوکی انچارج کے دفتر کی جانب لپکا۔ ملحقہ چھوٹی سی حوالات میں میرا بیٹا سلاخوں کے پیچھے کھڑا تھا۔ میرا دل اچھل کر گردن میں اٹک گیا۔ میں نے چونک کر بڑھتے قدم روک لیے۔ نیم تاریکی میں مجھے بیٹے کا سراپا دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے قریب پا کر وہ رو پڑا۔

”ابو، میں خدا کی قسم کھاتا ہوں کہ کوئی غلط کام نہیں کیا۔“ رندھی ہوئی تھکی ماندی صدا شب کے سکوت میں ابھری اور دیواروں سے ٹکرا کر میرا دل پاش پاش کر گئی۔ بیٹے کو اس طرح اس مقام پر دیکھا تو میں روح تک کانپنے لگا۔

شرجیل نے داستانِ الم مجھے سنائی جو خوفناک تھی۔ تجزیہ کریں تو کچھ اس طرح سمجھائی دیتی تھی۔

”امی نے مجھے گھر آنے کو کہا تو مجھے احساس ہوا کہ میرے پاس نقد پیسے کم ہیں۔ شام گہری ہو چکی تھی، سوچا کہ قریبی اے ٹی ایم مشین سے تین ہزار روپیہ نکلوا لیتا ہوں تاکہ سفر کے دوران مشکل پیش نہ آئے۔ اندازہ تھا کہ دس منٹ میں واپس لوٹ آؤں گا۔ گاڑی پارکنگ سے نکال رہا تھا کہ مغل صاحب نظر آ گئے۔ میری طرح وہ بھی عجلت میں تھے۔ ان کے ہاتھ میں تھیلا سا تھا، جو قدرے بھاری دکھتا تھا۔ مغل صاحب سے قریبی ریسٹوران میں گاہے بگاہے ملاقات ہو جاتی تھی۔ دوستی قطعاً نہیں تھی، بس معمولی سی جان پہچان تھی۔ کہنے لگے کہ مجھے بھی ہمراہ لے جاؤ۔ اگلے چوک پر کچھ کام ہے، ضروری جانا ہے، سواری نہیں مل رہی۔ میں نے بادل ناخواستہ انہیں ساتھ بٹھا لیا۔

اے ٹی ایم سہولت زیادہ دور نہیں تھی۔ مغل صاحب میری کار سے اترے تو فوراً قریب کھڑی دوسری گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔ میں بینک کی سمت چلا گیا۔ پیسے نکلوا کر لوٹا تو نواح میں افراتفری مچی نظر آئی۔ مغل صاحب پولیس کے نرغے میں تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر اچنبھا سا ہوا۔ پولیس نے چھاپا کالی کرولا کار پر مارا تھا۔ چند ہاتھوں میں چمکتی بوتلیں دیکھ کر میں اور بھی حیران ہوا۔ معاملہ سمجھ سے بالا لگا۔

یکایک کالی گاڑی سے ایک نوجوان اترا اس نے پرس میں سے ڈھیر ساری رقم نکالی اور پولیس کے حوالے کر دی۔ پھر بوتلوں سمیت کار دوڑاتا ہوا تاریکی میں غائب ہو گیا۔ مغل صاحب کو پولیس نے حراست میں لے لیا۔ اس دوران میں اپنی کار کے قریب لوٹ چکا تھا۔ نظر آتا منظر پرایا معاملہ سمجھ کر میں اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اگلے لمحے پولیس میری کار پر بھی حملہ آور ہو چکی تھی۔ تھوڑی دیر بعد میری کنپٹی پر پستول تھا اور میں گاڑی انجانی راہوں پر چلا رہا تھا۔ سفر کتنی دیر جاری رہا، میں نہیں جانتا۔ اسی دم سے طویل عذاب میرے اوپر جاری ہے“۔

معلوم ہوا کہ چند بوتل شراب شرجیل کی گاڑی پر لائی گئی تھی مگر اس پہلو اسے قطعی یقین نہیں تھا، نہ ہی اسے احساس ہوا کہ مغل مہربان اسے ہاتھ دکھا چکے تھے۔

اگلے روز شرجیل کو ضمانت مل گئی۔ عدلیہ نے اس کی کہانی درست مان لی۔ پولیس سے سوال کیا گیا کہ آپ

بڑے مگرمچھوں پر ہاتھ کیوں نہیں ڈالتے؟ مغل حضرت نے اعتراف جرم کر لیا۔ شرجیل کی رہائی پر پولیس چوکی میں بھی خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اب میں محافظانِ وطن کے بارے میں اصل موضوع کی طرف لوٹتا ہوں۔

بیٹے کی جان خلاصی ہوئی تو سب سے پہلے میرے پاس ایک کھڑا سا پولیس مین آیا جسے کھڑا عاشق کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس کا احسان کچھ اس طرح تھا۔

"سر! میں نے حوالات میں بند شہزادے کو رات تین مرتبہ پیشاب کروایا ہے، جب بھی اس نے کہا۔ میں اسے ٹائلٹ لے گیا۔ سوچیں، اگر میں یہ نہ کرتا تو آپ کے صاحبزادے کا کیا حشر ہو سکتا تھا؟"

مجھے اس کی بات معقول لگی یا نامعقول، میں نے مٹھائی کے لئے پیسے اسے دے دیے۔ اس نے مجھے سیلوٹ کیا اور دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔ چند تاکیدیں بھی کیں۔

"ابو! آپ جو ڈھیر سا کھانا رات میرے لئے چھوڑ گئے تھے، وہ اسی شخص نے کھایا تھا۔ اس دوران مجھے یہی کہتا رہا کہ میں کھانا چیک کر رہا ہوں کہ کہیں زہریلا تو نہیں۔ ابو یہ تین بڑی بوتلیں مشروب کی بھی ایک ہی سانس میں پی گیا تھا"۔ شرجیل نے مجھے بتایا، میں قطعاً حیران نہ ہوا۔

تھوڑی دیر بعد چوکی کا سب انچارج میرے قریب آیا کہنے لگا۔ "آپ جانتے ہی ہوں گے کہ بچے کو رہائی ہمارے بنائے ہوئے کاغذات کی بدولت ملی ہے۔ کاغذ بنانے والے کا ہزار روپیہ "مقرر" ہے۔ اگر آپ نے وہ نہ دیا تو اس غریب کا دل خراب ہوگا۔ آگے آپ کی مرضی۔ ہم آپ سے رشوت نہیں مانگ سکتے"۔ اس نے کہا اور بھیگی بلی بن گیا۔

میں نے رقم ادا کر دی۔ "اور میری مٹھائی؟" اب بلا کی بے شرمی اس کے چہرے پر ناچ رہی تھی۔ میں نے اسے مٹھائی کھلا دی۔

دو سپاہیوں نے میری بیگم کا گھیراؤ کر لیا۔ "ہم نے آپ کے شہزادے کو ہتھکڑی تک نہیں لگائی۔ سوچیں، اگر ہم اسے ہتھکڑیاں پہنا دیتے تو اس کا دل کتنا خراب ہوتا؟ اور ہاں، ہم نے اسے حوالات میں مارا پیٹا بھی نہیں"۔ وہ یک زبان ہو کر بولے۔

بیگم نے انہیں بساط سے بڑھ کر ادا کر دیا۔

اب گاڑی واپس لینے کا مرحلہ درپیش تھا۔ ایک سپاہی ہاتھ میں وہیل پانا اٹھائے وارد ہوا، بولا "صاحب! پولیس کے پاس آئی ہوئی گاڑی کبھی سالم نہیں ملتی۔ لوگ کھوکھا دھکیلتے ہوئے واپس لے جاتے ہیں۔ ہم نے آپ کی گاڑی چلائی ضرور ہے مگر صحیح سالم واپس کر رہے ہیں"۔ میں نے اسے تحسین بھری نظروں سے دیکھا اور کچھ پیسے دے دیے۔

چوکی انچارج اے ایس آئی جوان افسر تھا۔ تعاون پر آمادہ نظر آیا۔ اس نے کسی بھی فرمائش سے اجتناب برتا بلکہ میرے بیٹے کو نصائح کرتا رہا اور احتراماً ہمیں گیٹ پر آ کر خدا حافظ کہا۔

ہم واپسی کا سفر شروع کرنے والے تھے کہ چوکی کا سب انچارج سرعت سے رواں دوبارہ ہمارے پاس چلا آیا۔ اس نے ہمیں شرجیل کا پرس واپس کیا۔ پرس میں تمام کارڈ موجود تھے، درست حالت میں۔ نقدی البتہ ہرن ہو چکی تھی۔ اس نے ہمیں شرجیل کا سیل فون بھی واپس کیا مگر اس دم میرا ذاتی پرس پیسوں سے خالی ہو چکا تھا۔ میں نے اپنا قیمتی پرس اسے دے دیا۔

پولیس کا ہے فرض مدد آپ کی

میرا ایمان ہے کہ اگر ہمارے معاشرے کو ایماندار پولیس مل جاتی تو کم از کم نصف معاشرتی برائیاں ختم ہو چکی ہوتیں۔

دینی و تاریخی مغالطے اور ان کی حقیقت

ہمارے معاشرے میں ایسی بہت سی باتیں اور تصورات رائج ہو چکے ہیں جو کہ سرے سے غلط ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بعض غیر معتبر کتب میں درج ہیں اور غیر محققین علماء واعظین اور اساتذہ انہیں بغیر سوچے سمجھے بیان کر دیتے ہیں۔

مجاہد ادیب شیخ

ذیل میں ہم کچھ ایسی مشہور باتیں اور ان کی حقیقت واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔

مشہور ہے کہ "سیدنا عبداللہ بن جحشؓ جو اپنی بیوی اُم حبیبہؓ بنت ابوسفیان کے ہمراہ رسول اللہ کے حکم سے حبشہ ہجرت کر گئے تھے وہاں جا کر عیسائی ہو گئے اور اسی حال میں مر گئے تو نجاشی نے ان کی بیوہ کا نکاح رسول کریم سے کرا دیا"۔ اس سلسلے میں مختلف دینی کتب میں جتنی بھی روایات پائی جاتی ہیں ان میں واقدی جیسا ناقابل اعتبار راوی موجود ہے جو کہ علماء محدثین و محققین کے نزدیک جھوٹا، روایتیں گھڑنے والا، احادیث میں ہیر پھیر کرنے والا اور متروک الحدیث تھا (تاریخ کبیر 178:1، تاریخ اوسط 220:2، تاریخ صغیر 283:2، بخاری ترجمہ 334، الضعفاء والمتروکین، نسائی ترجمہ: 334، العلل ومعرفۃ الرجال 264:3 فقرہ 5166، الجرح وتعدیل 21:8، سیر الاعلام النبلاء 462:9، 463، 469، سیرت النبی 27:1) حافظ ذہبی نے اس کہانی کو منکر کہا ہے (سیر الاعلام النبلاء 221:2)

بعض مؤرخین نے اس روایت کو عروہ بن زبیر کی سند سے بیان کیا ہے جن کی پیدائش سیدنا عمر فاروقؓ کے دور کے اوائل میں ہوئی تقریباً 23 ہجری کے لگ بھگ وہ اس سے آگے اوپر کا سلسلہ بیان نہیں کرتے اس لئے یہ روایت منقطع ہے اس لئے ناقابل اعتبار ہے۔ لہٰذا ایک کذاب راوی اور منقطع روایات کی بنیاد پر کسی صحابی کو مرتد قرار نہیں دیا جا سکتا جاہے اسے کسی نے بھی نقل کیا ہو اس سلسلے میں ایک صحیح روایت موجود ہے جسے محدثین نے امام ابن مبارک، از معمر، از زہری، از عروہ، از سیدہ ام حبیبہؓ کی سند سے نقل کیا جو حدیث کے معیارات کے مطابق کھری ہے کہ "سیدہ ام حبیبہؓ سیدنا عبداللہ بن جحش کی منکوحہ تھیں جو نجاشی کے ملک میں وفات پا گئے اور سیدہ حبشہ میں ہی تھیں کہ ان کا نکاح نجاشی نے رسول اللہ سے کر دیا ان کا مہر چار ہزار درہم نجاشی نے ہی ادا کیا پھر انہیں شرجیل بن حسنہؓ کی ہمراہی میں مدینہ منورہ بھیج دیا"۔ (سنن ابی داؤد احادیث 2086، 21076، 2108۔ سنن نسائی حدیث 3350۔ دلائل النبوۃ۔ بیہقی 460:2) اس صحیح حدیث میں ان کے وفات پا جانے کا ذکر تو موجود ہے مگر ان کے عیسائی ہونے کا کوئی ذکر نہیں یقیناً یہ افسانہ دشمنانِ اسلام کا گھڑا ہوا ہے اس لئے اس پر یقین کرتے اور بیان کرتے ہوئے مذکورہ حقائق کو مدنظر رکھنا چاہئے اور سوچنا چاہئے کہ اس کی زد کہاں پڑتی ہے؟ کیا ہمارے نبی کی تربیت معاذاللہ اتنی ہی ناقص تھی کہ پہلی ہجرت حبشہ کی

سعادت حاصل کرنے والے جلیل القدر صحابی ہی مرتد ہو گئے۔

مشہور ہے کہ غزوۂ احد میں نبی کریمؐ نے جن تیراندازوں کو پہاڑی درے پر مقرر کر کے وہاں سے کسی حال میں نہ ہٹنے کا حکم دیا تھا اکثر مال غنیمت اکٹھا کرنے کے لالچ میں درے سے اتر آئے اور ان کے اس عمل کا لشکر اسلام کو ناقابل تلافی نقصان ہوا“۔ اس میں ایک درست واقعے کو غلط انداز دیا گیا ہے ہوا یوں کہ جب جنگ شروع ہوئی تو جلد ہی مسلمانوں کا پلڑا بھاری ہو گیا اور کفار گاجر مولی کی طرح کٹنے لگے تو وہ میدان جنگ سے بھاگنے لگے اور پہاڑ لشکر اسلام کی پشت پر تھا جس میں موجود درے پر نبی کریمؐ نے عبداللہ بن جبیرؓ کی قیادت میں پچاس تیراندازوں کو مقرر کیا تھا تاکہ دشمن پشت سے حملہ نہ کر سکے۔ دشمن نے اس کی کوشش بھی کی مگر تیراندازوں کی وجہ سے ناکام ہو گئے حتیٰ کہ کفار کو شکست ہو گئی تو کچھ مسلمان ان کے تعاقب میں نکل گئے اور باقی مال غنیمت اکٹھا کرنے میں مصروف ہو گئے اس وقت درے پر متعین اکثر تیراندازوں نے سمجھا کہ جنگ ختم ہو گئی ہے لہٰذا انہوں نے بھی جوش فتح میں مال غنیمت اکٹھا کرنے کا سوچا لیکن جب وہ درہ چھوڑنے لگے تو عبداللہ بن جبیرؓ نے ان کو روکا مگر دس کے سوا باقی اتنے جوش و خروش میں تھے کہ وہ نہ رُکے اور مال غنیمت اکٹھا کرنے کے لئے درے سے اتر آئے۔

یہ دیکھ کر کفار کے واپس جاتے ہوئے لشکر میں خالد بن ولیدؓ (جو کہ نہایت بہادر جنگجو تھے اور ابھی مسلمان نہ ہوئے تھے) نے ساتھیوں کے ہمراہ درے کی جانب سے لشکر اسلام پر حملہ کر دیا۔ اس حملے میں عبداللہ بن جبیرؓ اور ان کے تیرانداز ساتھی سب سے پہلے شہید ہوئے اور پھر انہوں نے نبی کریمؐ پر حملہ کر دیا تو کئی جلیل القدر صحابہ ان کے سامنے ڈھال بن کر شہید ہو گئے۔ خود نبی کریمؐ بھی زخمی ہو گئے۔ جب کفار کے تعاقب میں جانے والے اور مال غنیمت اکٹھا کرنے والے مجاہدین کو اس حملے کا علم ہوا تو وہ پلٹے اور کفار کو بھگایا لیکن تب تک لشکر اسلام کا ناقابل تلافی نقصان ہو چکا تھا۔ یہ سب واقعی تیراندازوں کی غلطی سے ہوا لیکن اس کی وجہ مال کی ہوس ہرگز نہ تھی بلکہ یہ غلط فہمی تھی کہ جنگ ختم ہو چکی ہے اور دوسری وجہ مال غنیمت اکٹھا کرنے کا جوش و خروش تھا اس میں بھی لالچ کا کوئی عنصر نہیں کیونکہ اسلام میں مال غنیمت جمع کرنے والے کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتا تھا اور مسلمان اسے لوٹتے نہیں بلکہ اکٹھا کرتے تھے اور اکٹھا کر کے امیر لشکر کے حوالے کر دیتے تھے جو کل مال غنیمت کا پانچواں حصہ الگ کر کے اسلامی حکومت کی بیت المال کے لئے دارالحکومت روانہ کر دیتے جسے امور مملکت اور فلاح عامہ پر خرچ کیا جاتا۔ باقی چار حصے مجاہدین میں ان کی کارکردگی اور ذمہ داری کو مدنظر رکھ کر تقسیم کر دیئے جاتے۔ اس سے یہ واضح ہو گیا کہ مال غنیمت اکٹھا کرنے میں ہوس کا قطعاً کوئی دخل نہیں تھا کیونکہ صحابہ مال غنیمت کے لئے نہیں بلکہ اللہ و رسولؐ کی خوشنودی کے لئے لڑتے تھے۔ اس معاملے میں مال غنیمت اکٹھا کرنے میں صحابہ کا جوش و جذبہ ظاہر ہوتا ہے جو کفار پر فتح کے باعث سامنے آیا اور وہ اطاعت امیر کے تقاضے فراموش کر بیٹھے غلطی تو ان سے ہوئی کہ وہ فرشتے تھے نہ نبی کی طرح معصوم وہ اپنی غلطی پر نادم ہوئے تو نبی کریمؐ نے ان کی خطا معاف کر دی اور مال غنیمت سے حصہ بھی دیا اور ان میں اوّلین مہاجرین و انصار اور بدری صحابہ بھی شامل تھے جن کو جنگ بدر میں حصہ لینے کی وجہ سے خوش خبری دی گئی تھی کہ آج کے بعد اگر وہ گناہ بھی کریں گے تو لکھا نہ جائے گا ایسی ہستیوں کے لئے مال غنیمت کے لالچ، ہوس یا لوٹ کے الفاظ کا استعمال بہت بڑی گستاخی ہے۔

مشہور ہے کہ عزیز مصر کی وفات کے بعد اللہ نے

زلیخا کو پھر سے جوان اور باکرہ کر دیا اور اس کا نکاح یوسف علیہ السلام سے ہوا۔ محققین کے مطابق یہ قصہ گو لوگوں کی باتیں ہیں ان کی کوئی بنیاد نہیں اور محدثین کے نزدیک یہ قطعاً قابل اعتبار نہیں (روح المعانی صفحہ 5 جلد 3)۔

مشہور ہے کہ زمین پر دو نبی زندہ ہیں۔ خضرؑ اور الیاسؑ جن میں سے الیاسؑ جنگلوں بیابانوں میں اور خضرؑ پانیوں پر بھولے بھٹکوں کی راہنمائی کرتے ہیں۔ بعض اسرائیلی روایات میں اس کا ذکر ہے جو بعض مفسرین نے بھی درج کر دی ہیں لیکن علماء محققین کے مطابق حیات الیاسؑ میں کوئی حقیقت نہیں (روح المعانی صفحہ 139 جلد 23) اور خضرؑ تو پیغمبر نہیں بلکہ فرشتے تھے جو اللہ کے حکم سے موسیٰؑ کو کچھ باتوں کی تعلیم دینے آئے تھے اور اس کے بعد وہ واپس آسمان پر چلے گئے۔ اب وہ زمین پر کہیں موجود نہیں (تفہیم القرآن)۔

مشہور ہے کہ جس مکان میں آیت الکرسی پڑھی جاتی ہے شیاطین تیس دن تک کے لئے اس مکان سے بھاگ جاتے ہیں اور چالیس راتوں تک جادو نہیں ہو سکتا اور آیت الکرسی شفاعت کرے گی۔ جو آدمی جمعہ کے دن سورۃ آل عمران پڑھتا ہے تو اللہ اور اس کے فرشتے غروب آفتاب تک اس پر رحمتیں بھیجتے رہتے ہیں اور جو آدمی ہر رات سورۃ واقعہ پڑھتا ہے اسے کبھی فاقہ لاحق نہیں ہوتا نہ اسے غافلین میں لکھا جاتا ہے اور جو آدمی دو سو دفعہ سورۃ اخلاص پڑھتا ہے تو اسے اللہ تعالیٰ ڈیڑھ ہزار نیکیاں عطا کرتے ہیں اور جو آدمی قرآن پڑھتا ہے تو اسے دو سو دینار ملیں گے اگر دنیا میں نہ ملے تو آخرت میں ضرور ملیں گے اور جو آدمی جمعہ کے دن نماز عصر کے بعد 80 مرتبہ ایک مخصوص درود پڑھے گا اس کے اسّی سال کے گناہ معاف ہو جائیں گے اور 80 سال کی عبادت کا ثواب اس کے لئے لکھا جائے گا۔ محققین کے نزدیک یہ

تمام اور ایسی سب روایات من گھڑت ہیں سلسلہ الاحادیث الضعیفہ صفحہ 412 جلد 2، صفحہ 305 جلد 1، صفحہ 314 جلد 1، صفحہ 101 جلد 2، صفحہ 138 جلد 2)۔

اور یہ روایت بھی موضوع ہے کہ جب کسی قوم کا بچہ سورۃ فاتحہ پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے سنتے ہی چالیس سال تک اس قوم سے عذاب اٹھا لیتے ہیں (الاسرائیلیات والموضوعات صفحہ 144) دراصل کچھ لوگوں نے عوام کو قرآن کی طرف مائل کرنے کے لئے اس قسم کی روایات گھڑیں (الاتقان صفحہ 341 جلد 2) اور ان میں سے کچھ مقصد عوام کو قرآن کی تفہیم سے ہٹا کر محض پڑھنے پر لگا کر دراصل قرآن سے دور کرنا تھا (مذہبی داستانیں از علامہ حبیب الرحمٰن کاندھلوی، تفسیری افسانے از عبدالرؤف میانوی، انبیائے عظام اور صحابہ کرام پر اعتراضات کا علمی جائزہ از ڈاکٹر سراج الاسلام حنیف)۔

مشہور ہے کہ نبی کریمؐ کی وفات کے بعد صحابہ میں خلافت کے لئے اختلاف پیدا ہو گیا اور بعد میں صحابہ کے درمیان اقتدار کے لئے جنگیں بھی ہوئیں۔ تو اتنی بات تو درست ہے کہ وفاتِ نبیؐ کے بعد صحابہ میں وقتی اختلاف رائے تو ہوا اور بہت بعد میں ان میں جنگیں بھی ہوئیں مگر ان کی وجہ اقتدار نہیں بلکہ کچھ اور تھی۔ دراصل ہوا یہ کہ نبی اکرمؐ کی وفات کے بعد صحابہ نے فوری طور پر امیر مقرر کرنا چاہا کیونکہ نبی کریمؐ کا یہ حکم ان کے پیش نظر تھا کہ جماعت کو ایک لمحے کے لئے بھی بغیر امیر کے چھوڑا نہیں جا سکتا کیونکہ تجہیز و تکفین تدفین وغیرہ بھی امیر ہی کی ذمہ داری تھی لہٰذا بنی ساعدہ کے محلے میں مہاجرین و انصار کی ایک جماعت اس مقصد کے لئے اکٹھی ہوئی جس میں یہ تجویز سامنے آئی کہ مہاجرین و انصار دونوں میں سے ایک ایک امیر مقرر کر لیا جائے تاکہ دونوں جماعتیں مطمئن رہیں۔ جب یہ خبر سیدنا عمر فاروقؓ کو ملی تو وہ سیدنا صدیق اکبرؓ کو ساتھ لے کر وہاں پہنچے اور ان کو سمجھایا کہ امیر ایک ہی ہو سکتا ہے ورنہ اختلاف پیدا ہو جائے گا اور امیر رسول اللہؐ کے حکم کے مطابق قریش (مہاجرین) میں سے ہو گا اور قریش میں امارت کے سب سے بڑھ کر اہل صدیق اکبرؓ ہیں جو کہ نبی اکرمؐ کے یارِ غار، علم و عمل اور حیثیت میں ممتاز، افضل الصحابہ، نبی کریمؐ کے سر اسلام کے لئے سب سے بڑھ کر قربانیاں دینے والے مدبر اور منتظم ہیں اور پھر نبی کریمؐ اپنی حیاتِ طیبہ کے آخری دنوں میں انہیں اپنے مصلے پر کھڑا کر کے اور خود ان کے پیچھے نماز ادا کر کے ہمیں اشارہ دے گئے ہیں کہ اُن کے خلیفہ اور ہمارے آئندہ امیر وہی ہوں گے۔

یہ کہہ کر انہوں نے سیدنا صدیق اکبرؓ کی بیعت کر لی دیگر صحابہ کو بھی شرح صدر ہو گیا اور انہوں نے برضا و رغبت فوراً آگے بڑھ کر بیعت کر لی یہ خاص صحابہ کی بیعت تھیں عام بیعت کا سلسلہ اس کے بعد بھی کئی دن جاری رہا۔ اگر کسی نے بیعت نہیں بھی کی تو اس نے خاموشی اختیار کر لی اجماع صحابہ کا احترام کیا اور اختلاف پیدا نہیں کیا۔ حالات نے ثابت کیا کہ ان کا انتخاب نہایت درست اور برمحل تھا۔

انہوں نے اپنے مختصر دور میں کئی خطرناک فتنوں کی سرکوبی کی اور اپنی قائدانہ صلاحیتوں سے مسلمانوں کو دین پر ثابت قدم رکھنے کے لئے اہم کردار ادا کیا۔ پہلا مسئلہ تو وفاتِ نبویؐ پر ہی پیدا ہو گیا تھا جب سیدنا عمر فاروقؓ یہ خبر سن کر فرطِ غم سے ہوش کھو بیٹھے اور ننگی تلوار لے کر گھر سے نکل آئے کہ جس نے کہا نبی کریمؐ فوت ہو گئے ہیں اس کا سر قلم کر دوں گا۔ صدیق اکبرؓ کو ان کی اس کیفیت کا علم ہوا تو انہوں نے آ کر مسجد نبوی میں ننگی تلوار لے کر گھومتے سیدنا عمر فاروقؓ کو سختی سے نیچے بٹھا کر یہ مختصر سا خطبہ دے کر حقیقت حال واضح کی کہ لوگو! تم میں سے جو کوئی محمدؐ کی عبادت کرتا تھا وہ جان لے کہ محمدؐ فوت ہو گئے اور جو اللہ کی

عبادت کرتا تھا وہ جان لے کہ اللہ زندہ ہے۔ پھر انہوں نے سورۃ آل عمران کی آیت 144 کی تلاوت کی کہ "محمد تو ایک پیغمبر ہیں وہ اگر فوت ہو جائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو کیا تم دین سے الٹے پاؤں لوٹ جاؤ گے"۔

یہ سن کر تمام صحابہ اور عمر فاروقؓ اس کیفیت سے نکل آئے اور ان کے ذہن نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا۔ انسانی فطرت میں یہ کمزوری ہے کہ وہ اپنے پیاروں کی موت کو تسلیم نہیں کرتی جب ہستی اتنی عظیم ہو اور اس سے محبت بھی بے انتہا ہو تو یہ کمزوری خطرناک صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یہ سیدنا صدیق اکبرؓ کے حسن تدبیر کا ہی نتیجہ تھا کہ اس مسئلے کو پیدا ہوتے ہی ختم کر دیا پھر لشکر اسامہ کو روانہ کرنے کا فیصلہ جس کا حکم نبی کریمؐ نے آخری دنوں میں دیا تھا حالانکہ وفات نبویؐ کے سانحے اور اسامہ کی کم عمری کے باعث عمر فاروقؓ جیسے جرأت مند صحابی بھی اس لشکر کی فوری روانگی کے حق میں نہ تھے لیکن صدیق اکبرؓ نے لشکر روانہ کیا اور لشکر فتح یاب ہوا پھر مانعین زکوٰۃ سے جنگ کا دلیرانہ فیصلہ حالانکہ عام صحابی بھی اس کے حق میں نہ تھے کہ لوگ اتنی سختی سے اسلام سے متنفر نہ ہو جائیں لیکن صدیق اکبرؓ نے اسلام کے ایک بنیادی رکن اور حکم کو معطل کرنے کی بجائے اس کے باغیوں کی سرکوبی کو ضروری سمجھا تاکہ آئندہ کوئی اسلام کے بنیادی حکم کی خلاف ورزی نہ کرے پھر نبوت کے جھوٹے دعوے داروں سے جنگ میں بھی انہوں نے کوئی کمزوری نہ دکھائی حالانکہ یہ تمام فتنے بیک وقت اٹھ کھڑے ہوئے اور ریاست کی صورت حال نبی کریمؐ کے بعد بے حد نازک تھی۔ پھر ان کی درویشانہ زندگی انہوں نے ہر لحاظ سے خود کو اس انتخاب کا اہل ثابت کیا۔

پھر جب وہ مرض وفات میں مبتلا ہوئے تو انہوں نے سیدنا عمرؓ کو خلیفہ نامزد کرنے کا فیصلہ کیا جسے عام صحابہؓ نے تو ان کی جرأت مندی، بہادری اور قائدانہ صلاحیتوں کے باعث پسند کیا۔ چند ایک صحابہؓ نے ان کی طبیعت کی سختی کی وجہ سے تحفظات ظاہر کئے تو سیدنا صدیق اکبرؓ نے فرمایا۔ لوگو! میں تم میں سے سب سے بہتر آدمی کو منتخب کر رہا ہوں، ان کی سختی کی وجہ میری نرم مزاجی تھی۔ جب خلافت کی ذمہ داری کا بوجھ ان پر پڑے گا تو وہ مسلمانوں کے معاملات میں نرم ہو جائیں گے۔ اور یہی ہوا آج تک تاریخ ان کے طرز حکمرانی، انتظام اور اداروں کی تشکیل کی مثال پیش نہیں کر سکی، نہ کر سکے گی۔ ان کے دور میں بڑی بڑی اسلام دشمن سپر طاقتیں روم، ایران اور مصر سرنگوں ہو گئیں اور ان کے دور میں کوئی فتنہ سر نہیں اٹھا سکا تو ان فتوحات کا بدلہ لینے اور آئندہ فتوحات سے روکنے کے لئے یہودی، مجوسی اور عیسائی راہنماؤں نے سازش کر کے نماز فجر میں ان پر قاتلانہ حملہ کرا دیا۔ شہادت سے قبل سیدنا عمر فاروقؓ نے چھ جلیل القدر صحابہ کی کمیٹی بنا دی کہ اپنے میں سے ایک فرد کو خلیفہ منتخب کر لینا جنہوں نے باہم مشورے اور عام مسلمانوں کی رائے سے سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ منتخب کر لیا جس پر کسی کو بھی اعتراض نہ تھا۔ (صحیح مسلم باب استخلاف، الرحیق المختوم)

سیدنا عثمان غنیؓ عمر فاروقؓ کے برعکس نرم طبیعت کے مالک تھے اور سزا کی بجائے معافی اور درگزر کو پسند کرتے تھے اور ان کی اس نرمی کا فائدہ دشمنان اسلام نے اٹھایا جو مفتوح ہونے کے بعد بدلے کی آگ میں جل رہے تھے اور منافقانہ طور پر مسلمان ہو کر سازشوں کے ذریعے اسلامی سلطنت کا شیرازہ بکھیرنے کی کوشش کر رہے تھے کیونکہ مسلمانوں کی قوت وشوکت کا راز ان کے اتحاد و ایمان میں ہی مضمر تھا اور عمر فاروقؓ کی شہادت کے باوجود دشمنوں کی توقع کے مطابق مسلمانوں کی فتوحات کا سلسلہ رکا نہ تھا اور اسلامی سلطنت روز بروز وسیع ہو رہی تھی اور کفر کے سینے پر سانپ لوٹ رہے تھے۔ لہٰذا عثمان غنیؓ کے

خلاف ایک خفیہ محاذ بنایا گیا جس نے پروپیگنڈہ مہم کے ذریعے سیدنا عثمان غنیؓ کے اعمال اور حکومتی ذمہ داروں پر الزام تراشیاں کیں۔ جب یہ بات سیدنا عثمان تک پہنچی تو انہوں نے تحقیقات کرائیں لیکن حقیقت کچھ بھی نہ نکلی۔

اپنا منصوبہ ناکام ہوتے دیکھ ان باغی منافقین نے عین اس وقت سیدنا عثمان غنیؓ کے گھر کا محاصرہ کرلیا جب زیادہ تر مسلمان حج کو گئے ہوئے تھے۔ مدینے میں جو صحابہ اور فوج موجود تھی انہوں نے عثمان غنیؓ سے ان کے خلاف کارروائی کی اجازت طلب کی تو انہوں نے اپنی ذات کے لئے خون بہانے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ باغیوں کا مطالبہ تھا کہ سیدنا عثمان حکومت چھوڑ دیں لیکن عثمان غنیؓ نے جمیع صحابہ کے اجماع سے سپرد کی گئی امانت کو چند باغی منافقین کے کہنے پر چھوڑنے سے انکار کردیا کہ اس سے عظیم فتنے پیدا ہونے اور مسلم سلطنت کی تباہی کا شدید خطرہ تھا وہ ان کے اصلی عزائم کو بھانپ چکے تھے کیونکہ ان کی ڈوریں یہودیوں اور مجوسیوں کے ہاتھوں میں تھیں۔ لہٰذا ان کو چالیس روز محاصرے میں بھوکا پیاسا رکھ کر عین اس حال میں شہید کردیا گیا جب وہ قرآن مجید کی تلاوت کررہے تھے۔ پھر ان باغیوں نے مسلمانوں کے عتاب اور سزا سے بچنے کے لئے سیدنا علیؓ کو زبردستی خلیفہ بنادیا اور بزور شمشیر اُن کے لئے بیعت لینا شروع کردی۔

زیادہ تر صحابہ نے قاتلانِ عثمانؓ سے قصاص لینے سے قبل بیعت سے انکار کردیا جو کہ عملاً سیدنا علیؓ کے لئے ممکن ہی نہ تھا کیونکہ وہی باغی اور قاتل تو اصل حکمران تھے، سیدنا علیؓ کو تو انہوں نے ایک طرح سے یرغمال بنایا ہوا تھا۔ انہوں نے بیعت کر کے ہاتھ مضبوط کرنے کو کہا اور وقت مانگا تاکہ وہ قصاص لے سکیں یوں قصاص عثمانؓ کے معاملے پر مسلمانوں میں شدید اختلاف پیدا ہوا۔ سیدنا علیؓ سمیت تمام صحابہ قصاص عثمانؓ لینا واجب سمجھتے تھے کیونکہ اکثر صحابہ بیعت رضوان میں شہادت عثمان کے بدلے کی بیعت کرچکے تھے چونکہ اس وقت عثمان شہید نہ ہوئے تھے اس لئے کبھی نے سمجھا کہ وہ بیعت اس وقت کے لئے تھی لیکن قاتلانِ عثمانؓ رکاوٹ بنے ہوئے تھے لہٰذا مسلمانوں کے درمیان جمل اور صفین کی جنگیں ہوئیں اور بے شمار مسلمان شہید ہوئے لیکن یہ جنگیں قصاص عثمانؓ کے لئے ہوئیں نہ کہ حکومت کے لئے جیسا کہ عموماً مغالطہ دیا جاتا ہے جنگوں کے باوجود قصاص کا مسئلہ حل نہ ہوا اور مسلمان دشمنوں کی خواہش کے مطابق دو گروہوں (شیعہ اور سنی) میں تقسیم ہو گئے۔ (تاریخ طبری، تاریخ ابن خلدون، سیرت النبی شبلی/ندوی، الرحیق المختوم)

یہ جنگیں انہی منافقین نے بھڑکائیں مسلمان تو صلح کرنا چاہتے تھے مگر رات ہوتے ہی منافقین دو گروہ ہو کر دونوں لشکروں میں گھس کر تیر اندازی، آتش زنی اور قتل و غارت شروع کر کے جنگ کی آگ دوبارہ بھڑکا دیتے تھے تاکہ وہ بکھر نہ جائیں اور مسلمان لڑلڑ کر کمزور ہو جائیں اور ان کی فتوحات رک جائیں اور ان کا بدلہ پورا ہو جائے۔ یہ یقیناً مسلمانوں کا مخالف گروہ ہی تھا اور مسلمانوں میں ہی شامل تھا۔ اسی گروہ نے سیدنا عمار بن یاسر کو بھی شہید کیا۔ سیدنا علیؓ جنگ کے باوجود سیدنا امیر معاویہؓ کے گروہ کو مسلمان ہی سمجھتے تھے اس کا ثبوت جنگ بندی کے بعد بھیجے جانے والے گشتی مراسلے کی یہ عبارت ہے۔

"اور ہمارے معاملے کی ابتدا ہوئی کہ ہم میں اور اہل شام میں مقابلہ ہوا۔ یہ ظاہر ہے کہ ہمارا اور ان کا خدا ایک نبی ایک دعوت اسلام ایک اللہ پر ایمان رکھنے میں اور اس کے رسول کی تصدیق کرنے میں نہ ہم ان سے زیادہ نہ وہ ہم سے زیادہ بس صرف خون عثمان کے معاملے میں ہم میں اور ان میں اختلاف ہوا حالانکہ ہم اس سے بری تھے" (نہج البلاغہ جزو ثانی صفحہ 159)

یہ مراسلہ جنگ جمل وصفین کے بعد سیدنا علیؓ نے اپنی طرف سے تمام شہروں میں بھجوایا تھا دونوں طرف کے مقتولین کو انہوں نے شہید کہا اور ان کا اکٹھا جنازہ پڑھایا۔ صحابہ کی پیش قدمی قصاص عثمانؓ کے لئے تھی مگر قاتلوں نے اپنے بچاؤ کے لئے مسلمانوں کو آپس میں لڑا دیا حالانکہ مسلمان آپس میں کوئی جنگ نہ کرنا چاہتے تھے اس لئے اپنے اپنے اجتہاد کے مطابق کچھ صحابہ اگر دونوں گروہوں میں شامل ہو کر جنگ میں شامل ہوئے تو کافی صحابہ غیر جانبدار بھی رہے، بیعت کی جنگ میں نہ شامل ہوئے کیونکہ وہ الجھن میں پڑ گئے کہ کس طرف جائیں کیونکہ دونوں طرف جلیل القدر صحابہ تھے اور ہمیں ان کے کارناموں اور قرآن وحدیث میں دی گئی ان کو جنت کی بشارتوں کے باعث ان سب کے بارے میں نیک گمان رکھنا چاہئے اور ان کے بارے میں بات کرنے سے پہلے اپنی اوقات کو ضرور دیکھ لینا چاہئے۔ یہ نہ ہو کہ ہم ان کے بغض میں اپنے اعمال ضائع کر بیٹھیں اور اللہ اور رسول کو ناراض کر بیٹھیں۔

مشہور ہے کہ سیدنا امیر معاویہؓ نے سیدنا حسنؓ اور سیدہ عائشہؓ کو شہید کرایا۔ یہ انتہائی خلاف حقیقت الزامات ہیں جن پر کوئی احمق اور عقل کا اندھا ہی یقین کر سکتا ہے کیونکہ جب سیدنا حسنؓ خود ہی امیر معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہو گئے تھے اور بخوشی ان کی بیعت کر لی تھی تو پھر انہیں ان کو قتل کرا کے اپنی ساکھ خراب کرنے کی کیا ضرورت تھی اور سیدہ عائشہؓ تو جنگ جمل کے بعد سیاست سے مکمل طور پر کنارہ کش ہو چکی تھیں اور امیر معاویہؓ سے ان کی کسی قسم کی کوئی رنجش نہ تھی بلکہ سیدہؓ کو امیر معاویہؓ کے دور میں وہی مقام حاصل تھا جو خلفائے ثلاثہ کے دور میں تھا اور مستند روایات سے ثابت ہے کہ دونوں کی وفات قطعاً طبعی تھی نہ کہ حادثاتی۔

جہاں تک ایسی تاریخی روایات کا تعلق ہے جن میں ایسی خلاف حقیقت باتیں درج ہیں ان کی قرآن و حدیث کے سامنے کوئی حیثیت نہیں قرآن تو لاریب ہے جبکہ حدیث کی چھان پھٹک بھی کی گئی ہے اور اس کی صحت کے لئے روایت، جرح وتعدیل اور اسماء الرجال جیسے علوم سے کام لیا جاتا ہے پھر بھی خلاف قرآن روایت کی تاویل قرآن کے مطابق کی جاتی ہے یا رد کیا جاتا ہے۔ تاریخ میں ایسی کوئی کسوٹی یا جانچ پرکھ نہیں پھر یہ بہت بعد میں لکھی گئیں ان کی بنیاد پر کسی مقدس ہستی کے خلاف الزام تراشی کو قطعاً تسلیم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ تاریخ میں سچ جھوٹ مکس ہے اس لئے اس پر کسی عقیدے کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی گو ابن خلدون اور محمد قاسم فرشتہ نے تاریخی روایات کی تنقیح سائنسی بنیادوں پر کی ہے مگر ان کی کوشش کو بھی آغاز کہا جا سکتا ہے مکمل نہیں۔

انہی تاریخوں کی بنیاد پر یہ مشہور ہے کہ سیدنا عثمان غنیؓ نے اپنے دور میں اقرباء پروری شروع کر دی تھی اور اپنے عزیزوں کو بڑے بڑے عہدے دے دیئے حالانکہ وہ اپنے عزیزوں کی مدد اپنے ذاتی مال سے کرتے تھے نہ کہ بیت المال سے اور یہ ان کا خلافت سے پہلے کا معمول تھا۔ اسی لئے تو غنی کہلائے تھے اور عزیزوں کو عہدے انہوں نے نہیں بلکہ زیادہ تر کو عمر فاروقؓ نے اہلیت کی بنیاد پر دیئے اور وہ ان کے خاندان سے ہرگز نہ تھے۔ تاریخ امیر معاویہؓ پر الزام لگاتی ہے کہ انہوں نے بیت المال کو ذاتی مال بنا لیا مگر کوئی مستند شہادت اس پر نہیں ملتی۔ دوسرا بڑا الزام ان پر یہ لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے موروثی خلافت کی بنیاد رکھی تو یہ بھی غلط ہے کیونکہ باپ کے بعد بیٹے کی خلافت کا آغاز سیدنا علیؓ کے بعد سیدنا حسنؓ کی خلافت سے ہوا۔

(تاریخ اسلام احمد حریری)

❀❀❀

☆-------------------- farrukhshahbaz03@gmail.com ---------فرخ شہباز وڑائچ

بہادر لڑکا

یہ 6 جنوری 2014ء کی صبح کا واقعہ ہے، خیبر پختونخواہ کے ضلع ہنگو میں گورنمنٹ ہائی سکول ابراہیم زئی میں بچے معمول کے مطابق سکول جا رہے تھے۔ انہی بچوں میں اعتزاز حسن بھی اپنے دوستوں کے ہمراہ علم حاصل کرنے کی تمناء لیے سکول کی طرف رواں دواں تھا۔ یہ علاقہ پسماندہ علاقوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ کسی بڑے شہر کے سکول کی طرح یہ سکول بھی آسائش و سہولیات سے لیس نہیں ہے۔ اس دوران اعتزاز نے ایک اجنبی نوجوان کو دیکھا جس نے اسی کے سکول کی یونیفارم پہن رکھی تھی، سکول جانے والے بچوں سے قریب واقع سکول کا پتہ دریافت کر رہا تھا۔ اعتزاز نے اس اجنبی نوجوان کو مخاطب کر کے کہا آپ تو ہمارے سکول کے طالبعلم نہیں، جس پر اس مشکوک نوجوان نے جواب دیا وہ اسی سکول کا طالبعلم ہے۔

اب وہ مشکوک نوجوان تیزی سے سکول کی طرف بڑھنے لگا تھا، اعتزاز کے دوستوں نے اسے خبردار کیا کہ یہ خودکش بمبار بھی ہو سکتا ہے تم پیچھے ہٹو، لیکن اس نے جواب دیا آپ لوگ پیچھے ہٹ جائیں میں اس کو قابو کرنے کی کوشش کرتا ہوں ورنہ یہ سکول کے اندر جا کر تباہی مچا دے گا۔ اعتزاز نے آگے بڑھ کر اس نوجوان کو روکنے کی کوشش کی۔ اس 15 سالہ بہادر بچے کا شک صحیح نکلا مشکوک نوجوان خودکش بمبار تھا، اس نے جب محسوس کیا کہ یہ بہادر بچہ اس کے ناپاک عزائم کو کسی صورت کامیاب نہیں ہونے دے گا تو خودکش بمبار نے اپنے آپ کو دھماکے سے اڑا لیا۔ اس کے ساتھ ہی بہادر اعتزاز کے بھی پرخچے اڑ گئے۔ خودکش بمبار کا ٹارگٹ سکول اسمبلی تھا جس میں ہزار کے لگ بھگ بچے شریک تھے۔ یہ بہادر بچہ اپنی ماں کو رلا کر سینکڑوں ماؤں کو رلانے سے بچا گیا۔ پندرہ سالہ اس بچے نے اپنی عمر سے بہت بڑا کام کر دکھایا، شجاعت کی ایسی لازوال مثال قائم کی کہ رہتی دنیا اس پر فخر کرے گی۔

عظیم معلمہ

25 مئی 2013ء کو گجرات کے گاؤں کوٹ ککہ روڈ پر صبح جناح پرائیویٹ پبلک سکول منگووال کے 24 بچوں کو اور خاتون ٹیچر کو عرفان نامی ڈرائیور وین پر سکول لا رہا تھا کہ اچانک وین سے آگ اور دھواں اٹھنے لگا اور اس کے ساتھ ہی دل دہلا دینے والی چیخوں سے فضاء گونجنے لگی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے آگ اتنی بھڑکی کہ 17 ننھی کلیاں آگ میں جل گئیں۔ شعلے برساتی آگ جب بچوں کو جلا کر راکھ کر رہی تھی تو وین ڈرائیور نے اپنی جان بچانے میں عافیت جانی جبکہ دوسری طرف خاتون

ٹیچر سمیعہ نورین جو اپنی جان بچا سکتی تھی، آگ کے شعلوں میں سے بچوں کو نکالتی رہی۔ ننھی جانوں کو بچاتے بچاتے اپنی جان بھی ظالم شعلوں کے سپرد کر دی۔ استاد ہونے کا فریضہ کچھ اس طرح سے ادا کیا کہ بچوں کو زندگی دیتے دیتے سمیعہ نورین نے اپنی زندگی قربان کر دی۔ یہ تنظیم معلمہ جماعت اسلامی کی کارکن تھیں۔

قابل فخر استاد

2 جون 2014ء کو کراچی کے نجی سکول عثمان پبلک سکول کا ایک گروپ مطالعاتی دورے پر ناران کاغان جا رہا تھا کہ بالاکوٹ کے مقام پر پیر کی دوپہر میٹرک کا طالبعلم سفیان عاصم پاؤں پھسل جانے کے باعث دریائے کنہار میں جا گرا۔ نصر اللہ شجیع جو سکول کے پرنسپل بھی تھے انہوں نے استاد اور طالبعلم کے رشتے کو اتنا مقدس جانا کہ بغیر یہ سوچے سمجھے کہ میری جان بھی جا سکتی ہے۔ دریا میں ڈوبنے والے طالب علم کی جان بچانے کے لئے دریا میں چھلانگ لگا دی۔ طالب علم کی جان بچاتے بچاتے خود کو سرکش لہروں کے حوالے کر دیا۔

نصر اللہ شجیع 1970ء میں کراچی کے علاقے حیدر آباد کالونی میں پیدا ہوئے۔ دور طالب علمی میں اسلامی جمعیت طلبہ سے منسلک رہے، جوشیلی طبیعت کے مالک، ہمت اور پختہ عزم سے بھرپور اس نوجوان نے طلبہ سیاست میں بھرپور کردار ادا کیا۔ نصر اللہ شجیع جماعت اسلامی کراچی کے نائب امیر تھے۔ 2002ء کے عام انتخابات میں ایم ایم اے کے پلیٹ فارم سے حصہ لیا صرف 30 سال کی عمر میں سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ سندھ اسمبلی میں متحدہ مجلس عمل کے ڈپٹی پارلیمانی لیڈر کی حیثیت سے پسے ہوئے طبقوں کی گرجدار آواز بنے۔ نصر اللہ شجیع کی زندگی جدوجہد سے بھرپور تھی۔ چاہے وہ طالب علمی کا زمانہ ہو یا سیاست کا دور ہر جگہ دوسروں کے حقوق کی آواز بلند کرتے نظر آئے۔

اس حادثے کے دن سے آج کے دن تک میں یہی سوچتا رہا اس زوال پذیر معاشرے میں جہاں اساتذہ، ڈاکٹرز، وکلاء سیاستدان غرضیکہ ہر شعبے میں کرپٹ لوگوں کی بہتات نظر آتی ہے۔ پستی کی طرف تیزی سے جاتے ہوئے اس معاشرے میں کوئی سیاستدان کسی کے لئے اپنی جان قربان کر سکتا ہے؟ ایک لمحے کے لئے نصر اللہ شجیع کو استاد کے روپ میں دیکھئے، وہ بچے کتنے خوش قسمت ہوں گے جن کو ایسا نیک سیرت انسان پڑھاتا ہوگا۔ نصر اللہ شجیع کتنے بڑے انسان ہیں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتے ہوئے اس ظالم سماج کو استاد لفظ کا تقدس اور اس کی شان بتا گئے۔ نصر اللہ شجیع نے صحیح معنوں میں معلم کا فرض نبھایا۔ بھیڑیوں کے ہجوم میں آپ جیسے فرشتہ صفت انسانوں کی شدید کمی ہے۔ آپ بارش کا پہلا قطرہ ہیں وہ قطرہ جس سے آغاز ہوتا ہے، وہ قطرہ جو خود مٹی میں مل جاتا ہے لیکن حبس زدہ معاشروں کی فضاء بدل دیتا ہے، وہ قطرہ جو اپنے آپ کو قربان کر کے تبدیلی کا محرک بنتا ہے۔ شکریہ نصر اللہ شجیع ہمیں پھر سے بتانے کے لئے کہ آج بھی استاد کا رشتہ زندہ ہے، آج بھی انسانیت سانس لے رہی ہے۔ اعتزاز حسن، سمیعہ نورین، نصر اللہ شجیع ہمیں تم پر فخر ہے۔ پاکستان کو تم پر فخر ہے، تم ہمارے ہیرو ہو۔ سنا ہے ہیرو کبھی نہیں مرتے، جی ہاں کبھی نہیں......!

کند ذہن بچہ

"یہ لڑکا کبھی کچھ سیکھ نہیں پائے گا۔" کلاس روم میں استاد کی آواز گونجی، اس کے بعد سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ استاد اس کم سن طالب علم کو گھور رہا تھا۔ طالب علم خاموشی سے ہاتھ باندھے اپنی نشست پر بیٹھا تھا۔ استاد نے تسلسل قائم رکھتے ہوئے دوبارہ بات شروع کی۔ "یہ تو

آسان سے آسان بھی باتیں نہیں سیکھ سکتا۔" کلاس روم کے طالب علموں کی نظریں اس لڑکے پر جمی ہوئی تھیں۔ کچھ طالب علم طنزیہ مسکرا رہے تھے۔

"میں نے تم سے ایک سوال پوچھا تھا اس کا جواب دو۔" استاد نے کہا۔

وہ طالب علم ٹس سے مس نہ ہوا جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ یہ کم سن طالب علم کسی اور ہی دنیا میں گم ہو۔ کلاس روم میں سکوت کا راج تھا۔ لڑکوں میں سنسنی پیدا ہوگئی۔ انہوں نے سوچا اب ہر روز کی طرح اس لڑکے کو مار پڑے گی۔ وہ خوش تھے کیونکہ وہ اس لڑکے کو پسند نہیں کرتے تھے اور پھر یہ بھی تو تھا کہ اس طرح ان کو کام سے کچھ فراغت ملتی تھی۔ اسی اثناء میں استاد غصہ سے چلانے لگا تھا۔ "کھڑے ہو جاؤ اور باہر چلے جاؤ اور دوپہر تک وہیں کھڑے رہو۔"

کم سن لڑکے نے اطمینان کا سانس لیا کیونکہ مار کھانے سے بہتر تھا کہ وہ باہر ہال میں سخت سردی میں کھڑا رہے حالانکہ یہ بہت مشکل تھا لیکن کلاس روم کے بے تکے سوالوں اور ڈانٹ ڈپٹ سے بہتر تھا۔

اس لڑکے کی زندگی کا آغاز نہایت معمولی تھا۔ تین چار سال کی عمر تک وہ بولنا شروع نہ کرسکا۔ وہ ایک معمولی بچے کی طرح آسان باتیں بھی نہ سیکھ سکتا تھا۔ بعد ازاں اسے سکول سے نکال دیا گیا کیونکہ استادوں کا خیال تھا کہ اپنی تعلیمی نااہلی کی وجہ سے وہ دوسرے طالب علموں پر برا اثر ڈالتا ہے۔ مگر پھر اس بچے نے محنت کرنا شروع کردی وہ اکثر آدھی رات تک اپنے کام میں مشغول رہتا تھا۔ اس کی دن رات کی محنت اسے اس بلندی پر لے گئی جو اس کے ہمعصروں میں سے کسی کو نصیب نہ ہوئی تھی۔ ایک وقت آیا اس معمولی سے بچے نے نوبل انعام حاصل کیا۔ آج دنیا اس معمولی بچے کو آئن سٹائن کے نام سے جانتی ہے۔

جی ہاں اس معمولی بچے کا دیا گیا فارمولا $E.mc^2$ دنیا بھر میں مشہور ہے۔ ہٹلر کی حکومت نے اعلان کیا جو شخص آئن سٹائن کو قتل کرے گا اس کو ۲۰ ہزار مارک انعام دیا جائے گا۔ اس زمانے میں یہ رقم بہت بڑی رقم تھی۔ مگر آئن سٹائن کی عظمت لوگوں کے دلوں میں اتنی قائم ہو چکی تھی کہ کوئی بھی اس انعام کو حاصل کرنے کی جرأت نہ کرسکا۔ البرٹ آئن سٹائن اپنی محنت کی وجہ سے اتنا مشہور ہوا کہ وہ جہاں کہیں بھی جاتا رپورٹر اس کے پیچھے لگے رہتے۔ ساری دنیا اس کی شکل سے واقف ہو چکی تھی۔ وہ بادشاہوں کا معزز مہمان بنتا۔ جب وہ کسی شہر سے گزرتا تو لوگوں کا ہجوم اسے دیکھنے کے لیے اُمڈ آتا۔ آخری عمر میں اسے ملنے والے لوگوں سے بچانے کے لیے محافظ رکھنا پڑا۔ لوگوں کو اس سے اتنی عقیدت ہو گئی تھی کہ وہ اس کے کوٹ کے بٹن بطور تحفہ اپنے پاس رکھ لیتے کہ ہم اس عظیم شخص سے مل چکے ہیں جس کی دماغی صلاحیت کی مثال پوری دنیا میں نہیں ملتی۔

تاریخ میں بہت سی مثالیں موجود ہیں معمولی زندگی سے آغاز کرنے والے بچوں نے بڑی بڑی کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ دراصل مشکل حالات ہی عملی محرک بنتے ہیں۔ پیچیدہ ترین صورت حال ہی انسان کی پوشیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرتی ہے۔ ہمیشہ زندگی کے بہترین سبق بدترین قسم کے حالات میں ملتے ہیں۔ معمولی حالات زندگی کا مضبوط زینہ ہیں۔ اس کا انحصار آپ پر ہے آپ مصائب اور طوفانوں میں آگے بڑھ کر کامیابی کی سیڑھی تھامتے ہیں یا مایوس ہو کر موقع گنوا بیٹھتے ہیں۔ کامیابی آپ کے سامنے ہے لیکن یہ بھی آسان راستوں پر چل کر نہیں ملتی!

کیا آپ تیار ہیں محنت کرنے کے لیے؟

”مجھے طلاق چاہیئے“

معاشرے میں طلاق کا بڑھتا ہوا رجحان

ہمارے ہاں کا حاکم مرد عورت کی زبان بند کروانے اور اس پر اپنی بالادستی قائم رکھنے کے لئے ہر جھگڑے کے وقت اسی ایک لفظ کو بطور ہتھیار استعمال کرتا ہے جو ایسی دھمکی ہے کہ عورت خاموشی میں ہی عافیت سمجھتی ہے۔

☆ ایس امتیاز احمد کراچی

”اب میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی، جانور نہیں جو تم اس قدر بے رحمی سے مجھے مارتے ہو، گالیاں دیتے ہو، مجھے طلاق (خلع) چاہئے اور اگر تم نے طلاق نہ دی تو میں عدالت تک جاؤں گی اور بچوں کا خرچہ بھی تم سے لوں گی۔“

”تم کیا سمجھتی ہو میں اتنی آسانی سے تمہیں طلاق دے کر بچے بھی تمہیں دے دوں گا۔ تم جیسی عورت بچوں کی کیا خاک تربیت کرے گی، دیکھتا ہوں تم عدالت کیسے پہنچتی ہو؟“ اور پھر شاہد نے حسب معمول روبی کو مارنا شروع کر دیا۔ پردے کے پیچھے چھپی ہوئی 7 سالہ زوبیہ کے ذہن میں طلاق کا لفظ گونج رہا تھا اور وہ سوچ رہی تھی کہ طلاق کیا چیز ہے جو مما روزانہ پاپا سے مانگتی ہیں اور پاپا مما کو یہ چیز لا کر دینے کے بجائے ہر روز مارتے ہیں۔

”ط......ل......ا......ق“ چار حروف پر مشتمل یہ مختصر لفظ ایک ایسا ”طمانچہ“ ہے جو کسی ابلتے ہوئے گرم لاوے سے کم نہیں اور جب یہ لاوا ابل کر پھوٹ پڑتا ہے تو بہت سی زندگیاں اجڑ جاتی ہیں اور اجڑنے کے بعد کی بچی کھچی زندگی کسی قبر سے کم نہیں ہوتی۔ یہ لفظ اپنے اندر اس قدر سختی، نفرت و حقارت، دوریاں اور کئی طعن جیسے جذبات لئے ہوئے ہے جسے سنتے ہی روح تک لرز اٹھتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اسے حلال ہونے کے باوجود سب سے قبیح اور ناپسندیدہ فعل قرار دیا ہے۔ کیوں کہ ایک عورت کو طلاق دینے کا مقصد صرف ایک عورت کو طلاق دینا نہیں ہے بلکہ خاندان کو سولی پر لٹکانے کے مترادف ہے۔ پورے خاندان کے جذبات کو مجروح کرتا ہے، کتنی ہی زندگیوں سے کھیلنے کا نام ہے لیکن سوال

یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کون سی وجوہات ہیں جن کی بنا پر گھر تیزی سے ٹوٹ رہے ہیں۔ دیکھا جائے تو موجودہ دور میں معمولی نوعیت کے تنازعات کو بنیاد بنا کر ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کی جا رہی ہے اور بچوں کے مستقبل کو پس پشت ڈال کر طلاق دے دی جاتی ہے۔

وہ میاں بیوی جن کے درمیان ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے کے باعث اختلافات پروان چڑھتے ہیں اور جو ہر وقت بچوں کے سامنے اپنے اختلافات یا نفرت کے باعث لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ ان کے لڑنے جھگڑنے کی وجہ سے بچوں کے معصوم ذہن پر ایسے نقوش بنتے جاتے ہیں جو مستقبل میں تلخ یادوں اور تکلیف دہ عمل کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ بچے کے سامنے جہاں ماں اپنی زبان درازی سے کام لیتے ہوئے لڑ رہی ہوتی ہے تو باپ صبر و تحمل اور قوت برداشت کو پس پشت ڈال کر ہاتھ اٹھانے سے بھی دریغ نہیں کرتا اور اس ناساز ماحول میں پرورش پانے والے بچوں کی موثر شخصیت سازی نہیں ہو پاتی اور وہ اپنی زندگی میں بے راہ روی اور بے قاعدگیوں کو اختیار کر لیتے ہیں۔ طلاق کی صورت میں بچے کو یا تو باپ کی شفقت کے سائے سے محروم ہونا پڑتا ہے یا ماں کی ممتا کی چھاؤں سے کوسوں دور جانا پڑتا ہے۔ ماں باپ میں سے کسی ایک کی محرومی سے بچے میں خود اعتمادی کی کمی بھی ہو سکتی ہے اور وہ دوسرے بچوں کے مقابلے میں خود کو تنہا محسوس کرتے ہیں۔ جدید تحقیق کے مطابق لڑکپن کی عمر میں جو بچے اپنے اہل خانہ سے قریب ہیں اور جن کی زندگیوں میں ان کے ماں باپ پوری طرح شامل ہیں، ان کا کردار درست رہتا ہے اور وہ آوارگی سے دور رہتے ہیں اور یہی اچھا اثر اچھے اساتذہ یا ایسے بزرگوں کا ہوتا ہے جو انہیں اپنے قریب رکھیں اور ان سے شفقت و محبت کا سلوک کریں۔

کچھ سالوں سے بے ترتیبی اور بے چینی کچھ اس انداز سے ہمارے معاشرے میں پھیلتی جا رہی ہے کہ ہر چہار جانب زوال ہی زوال نظر آ رہا ہے۔ بے حسی، ناقدری، قوت برداشت کی کمی اور زبان درازی سے ایسے بگاڑ پیدا ہوئے ہیں کہ اب شیرازے بکھرنے میں چند لمحے نہیں لگتے۔ چھوٹے چھوٹے اختلافات اس قدر گمبھیر صورت اختیار کر جاتے ہیں کہ علیحدگی کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا۔

محمڈن لاء کی دفعہ 308 کے مطابق "کوئی مسلمان جو عقل صحیح رکھتا ہو اور سن بلوغت کو پہنچ چکا ہو، جب چاہے اپنی بیوی کو طلاق دینے کا مجاز ہے"۔ اسلام میں طلاق کی اجازت صرف اس وقت ہے جب میاں بیوی میں باہمی مصالحت کا کوئی امکان نہ ہو، صرف معمولی بات پر طلاق دینا درست نہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے۔ "اگر یہ شک پیدا ہو جائے کہ بیوی بدکار ہے تو اسے سمجھایا جائے اور اس پر معمولی تشدد کیا جائے"۔ یعنی انتہائی ناگزیر حالات میں بھی طلاق کی اجازت نہیں دی گئی لیکن آج کل معمولی نوعیت کے اختلاف پر طلاق دینا عام سی بات ہے۔ بیوی شوہر سے محض اس لئے خار کھانے لگتی ہے کہ وہ اس کی آزادی کے خلاف ہے اور اس کی خواہشات پوری نہیں کر رہا۔ دوسری طرف مرد بڑھتی ہوئی ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لئے محض ایک مشین بن کر رہ گیا ہے۔ جس نے اس کے مزاج میں بے چینی اور چڑچڑاپن پیدا کر دیا ہے۔

شادی شدہ زندگی کا آغاز دو انسانوں سے ہوتا ہے جو خوشیوں اور محبتوں سے بھرے گھر کی خواہش اور معاشرے میں باوقار مقام پانے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں جس کے بعد ایک خوبصورت اور پرسکون گھر ہر انسان کی اولین اُمنگ بن جاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہمارے معاشرے میں 85 فیصد سے زائد شادیاں کامیاب ہوتی ہیں حتیٰ کہ بظاہر بے جوڑ نظر آنے والے جوڑوں نے بھی

زندگی کے اختلافات کی گٹھڑی کو یوں الگ باندھ کے رکھا ہوتا ہے کہ تمام عمر صرف چند خوبیوں کو مدِنظر رکھ کر ہی زندگی گزار دی تاکہ بچوں کو بہترین ماحول میسر آئے اور خاندان کی مہذب ساکھ بھی متاثر نہ ہو۔

لیکن ایسے والدین بھی ہمارے معاشرے میں موجود ہیں جو اپنے اختلافات کی وجہ سے بچوں کے مفادات کی بھی پروانہ کرتے ہوئے عدالت تک جا پہنچے ہیں اور میاں بیوی جنہیں ایک دوسرے کا لباس قرار دیا گیا ہے۔ اپنے مفادات کی خاطر جھوٹ اور سچ کو ملا کر ایک ایسا روپ دیتے ہیں کہ دونوں ہی دنیا کے غیر مہذب افراد دکھائی دینے لگتے ہیں۔ معمولی رنجشوں کو بنیاد بنا کر ایک دوسرے سے جان چھڑانے کی تدبیریں ہونے لگی ہیں اور اس سارے عمل میں بچوں کو کسی کھاتے میں شمار نہیں کیا جاتا۔ والدین اپنے درمیان رنجشوں کی جنگ میں ان معصوم پھولوں کو بھول جاتے ہیں جنہیں ان کے کسی غلط فیصلے کی بھینٹ چڑھنا ہوتا ہے۔ والدین آپس کے لڑائی جھگڑوں اور پھر طلاق کے بعد ان کی تقسیم ایسے کرتے ہیں جیسے یہ بچے نہیں کسی جائیداد کا حصہ ہوں۔ بچوں کی اس کھینچا تانی میں یہ پھول مرجھا کر رہ جاتے ہیں اور ان کی شخصیت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتی ہے۔ ایسے بچے کم عمری میں سنجیدگی کا شکار ہو جاتے ہیں جن کے حواسوں پر خوف اور آنے والے کسی لمحے کا ڈر ایسا سوار ہوتا ہے کہ وہ کبھی مکمل شخصیت لے کر بڑے نہیں ہوتے۔ محرومی ایسے بچوں کی ذات کا ایک حصہ بن جاتی ہے۔ جس کا اظہار بعض اوقات وہ خود کو اور کبھی دوسروں کو اذیت دے کر کرتے ہیں۔ طلاق ایک ایسی تلخ حقیقت ہے جس میں بچے عدم توجہ اور والدین کے درمیان پڑنے والی نفرت کو لے کر پروان چڑھتے ہیں تو ان میں بے راہ روی بڑھنے لگی ہے۔ جس کے بعد وہ جرائم کی دلدل میں دھنستے چلے جاتے ہیں اور کچھ نشہ میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔

چونکہ بچوں میں سیرت و کردار کی نشوونما اور تشکیل کا عمل والدین کے زیر سایہ ہو رہا ہوتا ہے چنانچہ ان میں گمراہ راستوں کا اثر اور بے راہ روی کا شکار ہونے کے امکانات کم ہوتے ہیں۔ محبت کرنے والے ماں باپ کے زیر سایہ پرورش پانے والے بچے صالح پُرامن شہری اور نیک کردار کے حامل ہوتے ہیں۔ مادہ پرستی ذمہ داریوں سے غفلت اور قوت برداشت کی کمی کے علاوہ اپنے ساتھی کو خوبیوں اور خامیوں سمیت قبول کرنے کے جذبے کی عدم موجودگی کے باعث پاکستان میں طلاق کی شرح بڑھتی جا رہی ہے۔ اس کے علاوہ ثقافتی یلغار نے خاندانی روایات کو توڑنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اب لڑکیاں سسرال والوں کی عام باتوں کو معمولی سمجھ کر نظرانداز نہیں کرتیں بلکہ ان سے لڑتی جھگڑتی رہتی ہیں۔ معاشرے میں خودغرضی بڑھ جانے کی وجہ سے لحاظ، مروت اور احترام ختم ہو رہا ہے۔ اب انسان کی قدر دولت سے ہے۔ فیشن کی دوڑ نے عمدہ تہذیب و روایات کو کمزور کر دیا ہے اور لڑکیوں کو تعلیم دلوانے کے شعور کی کمی کے باعث بھی لڑکیاں بیرونی اثرات زیادہ اور جلدی قبول کر رہی ہیں۔ ثقافتی یلغار اور گھریلو جھگڑوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے والے لٹریچر کے باعث نوعمر لڑکیوں کے معصوم ذہن اپنے گھر، بھائیوں، شوہر اور والدین کے خلاف سوچنے پر مجبور ہو رہے ہیں تو کچھ خاندانوں میں والدین بچوں کی پسند کو مدنظر رکھ کر شادیاں نہیں کرتے۔ بے جوڑ رشتے بھی خاندان کے ٹوٹنے کی وجہ ہیں۔ پرانے وقت میں عورتیں سمجھوتہ کر لیا کرتی تھیں لیکن موجودہ حالات میں شعور کی وجہ سے ہمارا خاندانی نظام ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ ہر لڑکی بہترین گھرانے اور ہینڈسم مرد کی خواہش کرتی ہے۔ اسی طرح لڑکے بھی خوبصورت لڑکی اور امیر گھرانے میں شادی کرنا چاہتے ہیں اور اگر توقعات پوری نہ ہوں تو اختلافات پروان چڑھنے لگتے ہیں اور طلاق تک نوبت آ جاتی ہے۔

پاکستان مسلم فیملی لاء آرڈیننس 1961ء کے تحت طلاق کا ایک طریقہ کار مقرر کیا گیا ہے جس کے مطابق شوہر کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق سے قبل ایک نوٹس بھیجے۔ نوٹس نہ بھیجنے کی صورت میں ایک سال قید یا 5000 روپے جرمانہ یا دونوں سزائیں ہو سکتی ہیں۔ اس کارروائی کے آغاز پر ہی متعلقہ چیئرمین مصالحتی کمیٹی دونوں فریقین کی طرف سے چند افراد کو چن کر ایک کمیٹی تشکیل دیتا ہے جو فریقین کے درمیان صلح کروانے کی کوشش کرتی ہے اور اگر دونوں صلح پر راضی نہ ہوں تو چیئرمین طلاق مؤثر ہونے کا سرٹیفکیٹ 90 دن میں جاری کرتا ہے اور طلاق ہو جاتی ہے۔

ایک سروے کے مطابق اس وقت عدالتوں میں 30 ہزار کے قریب طلاق کے مقدمات زیر سماعت ہیں جب کہ روزانہ 60 سے زائد نئے دعوے دائر ہوتے ہیں۔ اس قسم کے مقدمات کی تعداد 1800 ماہانہ سے زائد ہے۔ طلاق کے اس قدر بڑھتے ہوئے رجحان کا اولین سبب غیر سنجیدہ رویے ہیں۔ قوت برداشت کی کمی کے باعث معمولی معمولی جھگڑوں پر بھی طلاق جیسی سنگین دھمکی دی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں کا حاکم مرد عورت کی زبان بند کروانے اور اس پر اپنی بالادستی قائم رکھنے کے لئے ہر جھگڑے کے وقت اسی ایک لفظ کو بطور ہتھیار استعمال کرتا ہے جو ایسی دھمکی ہے کہ عورت خاموشی میں ہی عافیت سمجھتی ہے۔

پہلے ہمارے معاشرے میں مشترکہ خاندانی نظام رائج تھا جہاں سب مل جل کر رہتے تھے اور ایک دوسرے سے محبت، مروت اور احترام کے جذبات دلوں میں پائے جاتے تھے۔ لڑکے والدین کے دباؤ کی وجہ سے طلاق دینے سے گھبراتے تھے اور یہی حال لڑکی والوں کا بھی تھا کہ اگر ان کی بیٹی کبھی ناراض ہو کے میکے آ جاتی تو

والدین بیٹی کو مصالحت پر آمادہ کرتے اور سمجھوتہ کرنے کی تلقین کرتے اور یوں بگڑتے ہوئے حالات پھر سے سنورنے لگتے لیکن اب حالات یہ ہیں کہ لڑکی والدین کو مسئلہ بتاتی ہے اور والدین مسئلے کا حل نکالنے کے بجائے لڑکی کو گھر بٹھا لیتے ہیں۔

یاسمین جو کہ امیر والدین کی اکلوتی بیٹی ہے، اس کی شادی ڈاکٹر خالد سے 7 سال قبل والدین کی مرضی سے ہوئی تھی۔ خالد چونکہ حیدرآباد میں رہتا ہے اور وہیں ایک سرکاری ہسپتال میں کام کرتا ہے، اس لئے شادی سے پہلے یاسمین کے والدین نے اسے کراچی شفٹ ہونے کی شرط رکھی تھی جسے خالد نے بخوشی قبول کر لیا تھا لیکن شادی کے بعد یاسمین کراچی شفٹ ہونے کا ذکر کرتی تو خالد بہانے بازی سے کام لیتا کہ میری مستقل نوکری ہے، اتنی جلدی ٹرانسفر نہیں ہو گی وغیرہ۔ اس دوران یاسمین حیدرآباد کی گرمی سے بہت پریشان تھی۔ یاسمین کو جہیز میں اے سی بھی ملا تھا۔ جب یاسمین نے اسے اپنے کمرے میں لگانے کا ارادہ کیا تو بڑی جیٹھانی نے گھر میں جھگڑا ڈال دیا کہ یاسمین کے کمرے میں ائرکنڈیشن لگنے کی وجہ سے اس کا کمرہ مزید گرم ہو جائے گا کیوں کہ اے سی سے نکلنے والی گرم ہوا براہ راست اس کے کمرے میں آئے گی۔ یہ جھگڑا اتنا بڑھا کہ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے یاسمین اپنے لئے الگ کھانا بناتی تھی۔ یاسمین کا بڑا بھائی امریکہ میں رہتا تھا وہ چھٹیوں میں کراچی آیا ہوا تھا۔ یاسمین بھائی سے ملنے اپنے میکے گئی جہاں اس نے بھائی کو تمام صورت حال سے آگاہ کیا۔ بھائی نے جوش میں آ کر اپنی بہن کو گھر میں ہی روک لیا اور یاسمین اور بچوں کا خرچہ اٹھانے کا وعدہ کیا۔ ساتھ ہی اس نے ڈاکٹر خالد کو مختلف جائز و ناجائز طریقوں سے کراچی شفٹ کرانے کی کوشش کی مگر وہ ناکام ہوا۔

لہٰذا اس نے بہن کو خلع دلوانے کے لئے وکیل سے رجوع کیا۔ آج یاسمین کو دو سال سے زائد عرصہ ہو گیا ہے وہ اپنے والدین کے گھر میں خوش ہے۔ بھائی ہر مہینہ پچاس ہزار روپے بھیجتا ہے جب کہ یاسمین کے شوہر نے اسے واپس بلانے کے لئے اپنے والدین کو بھی بھیجا تھا لیکن یاسمین نے جانے سے انکار کر دیا۔ یاسمین کا کہنا ہے کہ خالد بہت اچھا انسان ہے اس نے مجھے خوش رکھنے کی بہت کوشش کی لیکن اس نے میرے والدین سے کیا ہوا وعدہ پورا نہیں کیا اور کراچی شفٹ ہونے سے انکار کر دیا۔ ویسے بھی حیدرآباد میں میرے بچے اچھی تعلیم حاصل نہیں کر سکتے تھے، کراچی سب سے بڑے اسکول میں میرے بچے پڑھ رہے ہیں اور میرا بھائی بچوں کے اخراجات اٹھا رہا ہے۔

یاسمین کے برعکس حسن بانو کا کیس بالکل ہی الگ ہے۔ حسن بانو ایک روایت پسند پٹھان خاندان سے تعلق رکھتی ہے جس کی شادی 17 سال کی عمر میں 40 سالہ شادی شدہ شخص گل نواز سے کر دی گئی جو اسے پشاور لے گیا جہاں گل نواز کی پہلی بیوی حسن بانو کو بہت مارتی تھی اور سارے گھر کا کام کاج اسی سے کرواتی تھی۔ جب حسن بانو گل نواز سے اس کی شکایت کرتی تو وہ اپنی پہلی بیوی کو سمجھانے کے بجائے حسن بانو کو مارتا پیٹتا تھا۔ اسی دوران حُسن بانو کو خدا کی طرف سے جڑواں تحفہ میں ملا جسے پا کر حُسن بانو بہت خوش تھی لیکن گل نواز اور اس کی پہلی بیوی اب تک حسن بانو کو مارتے پیٹتے تھے۔ ایک دن حُسن بانو موقع پا کر گھر سے فرار ہو گئی اور والدین کے پاس آ گئی لیکن یہاں بھی اسے سکون و آرام نصیب نہ ہوا۔ ماں باپ نے الگ لعن طعن کی اور بھائیوں نے اپنی بیویوں کے کہنے میں آ کر مارنے پیٹنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ بہنیں اپنے مستقبل کے بارے میں سوچتے ہوئے ناراض ناراض سی رہنے لگیں تا کہ وہ جلدی ہی اپنے شوہر کے پاس لوٹ جائے لیکن حُسن بانو کے لئے واپس جانا

جہنم میں جانے کے مترادف تھا۔ حُسن بانو اپنے اور اپنے بیٹے کے لئے لوگوں کے گھروں میں کام کرنے لگی جس کی بہت مخالفت کی گئی لیکن حُسن بانو نے ہتھیار نہیں ڈالے۔

دو سال بعد ایک دن اچانک حسن بانو کا شوہر اپنے بیٹے سے ملنے کے بہانے کراچی آ گیا۔ حسن بانو کے والدین نے صلح کروانے کی کوشش کی اور گل نواز حسن بانو کو ایک کوارٹر میں لے گیا جس کا کرایہ اکثر و بیشتر حسن بانو ہی دیا کرتی تھی۔ گل نواز چونکہ ٹرک ڈرائیور تھا اس لئے مہینے میں ایک دو بار حُسن بانو کے پاس آ جایا کرتا تھا۔ اس دوران حسن بانو کی گود میں ایک بیٹی اور ایک بیٹے کا مزید اضافہ ہو چکا تھا۔ حُسن بانو کچھ ہی سالوں کے لئے خوش رہ سکی تھی کہ ایک دن گل نواز کی جانب سے طلاق کا نوٹس آیا جسے دیکھ کر حسن بانو سکتے میں آ گئی اور اس کی بسی بسائی دنیا اجڑ گئی۔ گل نواز نے پھر کبھی مڑ کر حُسن بانو اور بچوں کا حال دریافت نہ کیا۔ اب حُسن بانو ایک گارمنٹ فیکٹری میں کام کرتی ہے اور اس کے بچے ننھیال میں ہوتے ہیں جہاں انہیں ڈانٹ ڈپٹ اور طعنوں کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ حسن بانو کا کہنا ہے کہ اپنے ماں باپ کی غلطی کی وجہ سے آج میں اس حال میں ہوں۔ انہوں نے ایک ایسے شخص سے میری شادی کر دی جو پہلے سے شادی شدہ تھا جس نے مجھ پر بہت ظلم کئے اور آج جب میں ان کی غلطی کی سزا بھگت رہی ہوں تو وہ شرمندہ ہونے کے بجائے مجھے ہی قصوروار ٹھہراتے ہیں کہ گھر بسانے کے قابل نہیں ہوں۔

اکثر خواتین کی بدقسمتی یہ کہ وہ ایسے شخص سے بیاہ دی جاتی ہیں جو یا تو شادی شدہ ہوتا ہے یا نشے کا عادی ہوتا ہے۔ مہنگائی اور بے روزگاری کے اس دور میں سانسوں کی ڈور کھینچنے کے لئے کمانا نہایت ضروری ہے ایسے ہی بعض حالات کا شکار ہو کر اور کئی خواتین روز روز کے درد سے بچنے کے لئے اپنے خاوند سے طلاق لیتی ہیں ورنہ تو ہر عورت اپنے بچوں کی خاطر مصالحت کا راستہ اپناتی ہے جب کہ مرد حضرات اسلام کے اس اصول کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں کہ ایک مرد چار شادیاں کر سکتا ہے۔ مردوں کے لئے ایک سے زائد شادیاں اہم ہیں اس بات کو قطعی بھول کر کہ کن حالات میں اور کن خواتین سے بوقتِ مجبوری شادی کی جا سکتی ہے۔

موجودہ دور میں اقدار اور روایات بدلتی جا رہی ہیں۔ بہت سے میاں بیوی میں ذہنی ہم آہنگی کا فقدان ہوتا ہے۔ دور حاضر کی لڑکیاں باشعور ہونے کی وجہ سے اپنے دفاع کے لئے لڑتی ہیں تو ان کو طلاق جیسی دھمکیاں بھی ملتی ہیں لہٰذا لڑکیوں کو چاہئے کہ وہ صبر و تحمل سے کام لیتے ہوئے سسرال والوں کی معمولی نوعیت کی باتوں کو نظرانداز کریں اور اپنے سسرال والوں سے تعاون کریں تا کہ اچھے تعلقات پروان چڑھ سکیں۔ کامیاب زندگی گزارنے کے لئے ضروری ہے کہ لڑکیاں چاہے مصنوعی روپ دھار کر ہی سہی سسرال والوں کی ہاں میں ہاں ملائیں تا کہ ان کا دل جیتا جا سکے۔ ہمارے معاشرے میں چونکہ مرد حاکم تصور کیا جاتا ہے اس لئے اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا ہر حکم مانا جائے اس لئے عورت کو ہی اس کے رنگ میں ڈھلنا پڑتا ہے۔ لہٰذا اگر شوہر غصے میں ہو تو بیوی کو خاموش رہنا چاہئے۔ اگرچہ خاوند کو بھی چاہئے کہ وہ اپنی بیوی سے حُسن سلوک سے پیش آئے۔ قوت برداشت کا استعمال کرتے ہوئے بیوی کو مارنے پیٹنے سے گریز کرے کیوں کہ جو شخص محض اپنا غصہ کسی عورت پر اتارتا ہے وہ دنیا میں کمزور کردار کا حامل شخص ہوتا ہے لیکن بعض مرد غصے کے زیادہ تیز ہوتے ہیں اور ایسی صورت میں بیویاں بھی زبان درازی کرتی ہیں تو معاملہ بگڑنے لگتا ہے اور طلاق جیسی صورت سامنے آتی ہے۔

✿✿✿

جنات کا دربار

''تمہاری مراد پوری ہو جائے گی لیکن جنات کے اس دربار میں تمہیں جب وہ چاہیں حاضری دینا ہو گی اور وہ تمہاری خواہش پوری کر رہے ہیں۔ تمہیں ان کی خواہش پوری کرنی پڑے گی''۔

☆ -- ٹی آئی ساگر

کہانیاں جو جیل سے ملتی ہیں وہ کسی کتاب سے نہیں مل سکتیں۔ ہر قیدی ایک کہانی کا کردار ہوتا ہے۔ ہر جرم کے پیچھے ایک کہانی ہوتی ہے۔ وہاں ہر قیدی اپنی کہانی سنانے کے لئے بیتاب رہتا ہے۔ چاردیواری کی دنیا کی چھوٹی چھوٹی باتیں جب واردات کی صورت اختیار کرلیں تو جیل میں جاکر سنسنی خیز کہانیاں بن جاتی ہیں۔

میں جب بھارت میں جاسوسی کے جرم میں پکڑا گیا تو تھرڈ ڈگری کی بھٹی میں سے گزار کر مجھے نابھہ جیل میں پھینک دیا گیا۔ میری ہڈی پسلی ایک ہو چکی تھی۔ سات آٹھ روز بعد جب میں چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو میں نے اچھی طرح دیکھا کہ میں کہاں ہوں اور میرے اردگرد کیا ہورہا ہے۔ اگر میں اپنی اس وقت کی حالت اور وہاں کا ماحول بیان کرنا شروع کردوں تو اصل کہانی جو میں آپ کو سنانا چاہتا ہوں وہ دھری رہ جائے گی۔ میں مزید تمہید کے بغیر اصل کہانی پر آتا ہوں۔

میں ایک ضعیف العمر قیدی کو پہلے روز ہی سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی داڑھی اور سر کا ایک بال بھی کالا نہیں رہا تھا۔ کیا قیدی اور کیا جیل کا عملہ، ہر کوئی اس کی تعظیم کرتا تھا اور سب اُسے قادری صاحب کہتے تھے۔ شاید میں ہی تھا جس کے ساتھ ابھی اُس کا تعارف نہیں ہوا تھا۔ ایک روز میں بیرک سے باہر بیٹھا اپنے خیالوں میں گم تھا۔

یہ سوچ مجھے پریشان کررہی تھی کہ کس غدار نے میری مخبری کر کے مجھے گرفتار کروایا ہے۔ مجھے گرفتاری کا افسوس نہیں تھا۔ میں اس حقیقت کو قبول کر کے جاسوس بنا تھا کہ ایک نہ ایک دن دشمن مجھے گرفتار کرے گا اور اس امکان کو بھی میں نے ذہن میں بٹھا رکھا تھا کہ میں دشمن کی گولی سے مارا بھی جاؤں گا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ جب میں پکڑا جاؤں گا تو مجھے ظالمانہ اذیتیں دی جائیں گی۔ مجھے افسوس اپنے مشن کا تھا جو ابھی مکمل نہیں ہوا تھا۔

کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مجھے چونکا دیا۔ میں نے دیکھا کہ یہ نابھہ جیل کا قادری صاحب تھا۔

”رات کو سونے سے پہلے ایک سو مرتبہ 'یارحیم یا کریم' کا ورد کرلیا کرو“۔ قادری صاحب نے کہا۔ ”میں تم سے یہ نہیں پوچھوں گا کہ تم نے کیا جرم کیا ہے اور تمہیں کتنی سزا ملی ہے۔ میں تمہاری صرف حالت دیکھ رہا ہوں۔ یہ اچھی نہیں۔ قیدی جب جیل میں آتا ہے تو مہینہ دو مہینے اس کی یہی حالت رہتی ہے۔ تم مسلمان ہو اسی لئے تمہیں یہ وظیفہ بتایا ہے۔ یہ ضرور کرنا خدا تمہیں سکون عطا کرے گا“۔

اُس کے انداز میں مجھے خلوص اور ہمدردی نظر آئی یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا تھا کہ بعض پیشہ ور فراڈیے کسی فراڈ میں پکڑے جاتے ہیں تو جیل میں آکر بھی کوئی نہ کوئی فراڈ چلا لیتے ہیں۔ میں نے جیل میں دو تین عادی مجرموں کو پیر اور عامل بنے ہوئے دیکھا ہے۔ جن قیدیوں کے کیس چل رہے تھے یا جن کی اپیلیں ابھی زیر سماعت تھیں وہ ان کو باقاعدہ نذر نیاز دیتے تھے۔ پہلے تو مجھے شک ہوا کہ قادری صاحب بھی ایسا ہی فراڈیا ہے لیکن چار پانچ دنوں میں مجھے یقین ہوگیا کہ یہ شخص کچھ اور ہے۔

پانچ چھ مہینے گزر گئے۔ اس عرصے میں جیل کے ایک وارڈن اور دس بارہ قیدیوں نے مجھے قادری صاحب کی زندگی کی کہانی سنائی۔ ان قیدیوں میں دو تین ایسے بھی تھے جو قادری صاحب کو باہر بڑی اچھی طرح جانتے تھے اور وہ ایسے تھے جو ان کی زندگی کی کہانی کے دوسرے کرداروں کو بھی جانتے تھے۔ میں نے اپنے طور پر مختلف ذرائع سے قادری صاحب کی کہانی کی انکوائری کی اور تصدیق بھی کروائی۔ میں آپ کو یہی کہانی سناؤں گا۔

پاکستان بننے سے بہت پہلے کا واقعہ ہے بھوپال شہر میں ایک مسلمان لڑکے کی بارات لڑکی والوں کے ہاں گئی۔ بینڈ باجا ساتھ تھا اور گولے بھی بہت چلائے جا

رہے تھے۔ بارات جب لڑکی والوں کے گھر کے قریب پہنچی تو دولہا کے ایک دوست نے دولہا کی گھوڑی سے پندرہ بیس قدم آگے جا کر تین گولے زمین پر رکھے اور انہیں باری باری آگ لگا دی۔ گولوں کے پھٹنے تک دولہا کی گھوڑی گولوں کے قریب چلی گئی۔ بینڈ باجے والے گھوڑی کے آگے تھے لیکن وہ سب پیچھے ہٹ آئے کیونکہ تین گولے پھٹنے والے تھے۔ دولہا کی گھوڑی گولوں سے دو تین قدم دور تھی کہ تین گولے پھٹے۔ گھوڑی ایسی بُری طرح بدکی کہ پیچھے کو مڑ کر دوڑ پڑی اور بے لگام ہوگئی۔ وہ بچے کچلے گئے اور دولہا جس نے کبھی گھوڑ سواری کا تصور بھی نہیں کیا تھا، کچھ اس طرح گرا کہ گھوڑی کے آگے جا پڑا اور گھوڑی کا اگلا پچھلا سم اس کے کولہے پر پڑا۔ وہاں سے دولہا کی ٹانگ بہت بُری طرح کچلی گئی۔

دولہا کو اٹھا کر ہسپتال لے گئے۔ وہ بے ہوش تھا۔ عین موقعہ پر یہ جو حادثہ ہوگیا تھا اس کا ہر کسی کو افسوس تھا لیکن شام کے وقت ڈاکٹر نے یہ بتا کر کہ دولہا کی ٹانگ کولہے کے قریب سے کاٹنی پڑی گی۔ لڑکے والوں کے ہاں صف ماتم بچھا دی۔ پتا چلا کہ ٹانگ پر جہاں گھوڑی کا پاؤں پڑا تھا، وہاں سے ہڈی اس طرح ٹوٹی ہے کہ جوڑی نہیں جا سکتی۔ ٹانگ کا گوشت اس طرح کچلا گیا تھا کہ ٹانکے لگنے کی گنجائش ہی باقی نہ بچی۔ ہوسکتا ہے کہ ڈاکٹر اناڑی ہو لیکن ہوا یہ کہ دولہا کی ٹانگ کولہے کے قریب سے کاٹ دی گئی۔ دولہا میاں کے جسم پر گوشت کی پہلے ہی کمی تھی وہ بیچارہ تو ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا۔

لڑکی والوں نے شادی ملتوی نہ کی بلکہ منسوخ کر دی۔ ایک ٹانگ کے آدمی کو کون اپنی اچھی بھلی لڑکی دیتا ہے۔ یہاں سے یہ کہانی چاردیواری کی دنیا کے اندر چلی جاتی ہے۔ جس دلہن کو لانے کے لئے یہ بارات جارہی تھی وہ اس دولہا کو پسند نہیں کرتی تھی۔ یہ راز کچھ عرصہ بعد کھلا تھا۔ لڑکی والے درمیانہ درجے کے شریف لوگ تھے۔ ایسے گھرانوں میں لڑکی کی پسند اور ناپسند نہیں دیکھی جاتی۔ لڑکے کو بھی اپنی پسند اور ناپسند کے اظہار کی اجازت نہیں ہوتی۔ اس لڑکی کا نام مجھے زرینہ بتایا گیا۔ راز یہ کھلا تھا کہ لڑکی کو ایک اور لڑکا اور اس کا گھرانہ بہت ہی پسند تھا۔ اس نے اس لڑکے کو جس کا نام مجھے فہیم بتایا گیا، دیکھا ہوا تھا اور اس کے متعلق وہ بڑی اچھی باتیں سنتی رہتی تھی۔

فہیم کا گھرانہ کشادہ ظرفی اور خلوص کے لحاظ سے مشہور تھا۔ زرینہ اور فہیم کا آپس میں کبھی آمنا سامنا بھی نہیں ہوا تھا۔ یہ دولہا جو گھوڑی سے گرا تھا کمزور اور چھوٹے سے قد کا لڑکا تھا۔ اس کا رنگ گہرا سانولا تھا۔ اس کے مقابلے میں زرینہ صحیح معنوں میں خوبصورت لڑکی تھی۔ چاردیواری کی دنیا میں کسی کا کوئی راز چھپا نہیں رہ سکتا۔ زرینہ کا رشتہ جب اس لڑکے کے ساتھ طے ہوگیا تو وہ سہیلیوں کے آگے روتی تھی۔ اُس نے یہاں تک کہا تھا کہ جی چاہتا تھا کہ کچھ کھا کر مر جاؤں۔

بھوپال شہر کے گرد و نواح میں ایک پہاڑی کے دامن میں چھوٹا سا ایک گاؤں تھا۔ وہاں ایک عامل رہتا تھا جس کے متعلق مشہور تھا کہ اُس کے پاس ایسا علم ہے کہ وہ ترنگ میں آ جائے تو سیاہ کو سفید کردے۔ ایسے بعض لوگ کالا علم کہتے اور کچھ لوگ کہتے تھے کہ اس کے قبضے میں جنات ہیں جو اس کا حکم مانتے ہیں۔ وہ جنات کا باقاعدہ دربار لگاتا ہے۔ انہی جنات کی مدد سے وہ ناممکن کو ممکن بنا دیتا ہے۔ زرینہ نے عورتوں کی زبانی اس عامل کی کرامات کے بہت قصے سن رکھے تھے۔ اسے محض اتفاق کہا جاسکتا ہے کہ زرینہ ان عاملوں کو نہیں مانتی تھی۔ اُسے دو سہیلیوں نے مشورہ دیا کہ اس عامل کے پاس جاؤ اور اُسے کہو کہ یہ رشتہ ٹوٹ جائے اور اُس کی شادی فہیم سے ہو جائے۔

ایک روز زرینہ ان دو سہیلیوں کے ساتھ اپنی ماں کو

بتائے بغیر عامل کے پاس چلی گئی۔ عامل نے اُس سے واجبی سے پیسے لئے اور کاغذ پر کچھ ہندسے سے لکھ کر اُسے دیئے اور کہا کہ اس کاغذ پر اپنا تھوک لگا کر اپنے باہر والے دروازے کے قریب کہیں زمین میں دبا دینا۔ عامل نے اُسے یہ بھی کہا تھا کہ وہ ایک خطرہ مول لے رہا ہے۔ خطرہ یہ تھا کہ اُس نے یہ کام اپنے ایک جن کے سپرد کیا تھا کہ اس دروازے سے میں صرف وہی شخص داخل ہو جسے زرینہ پسند کرتی ہے اور اگر اس کی ناپسند کا دولہا آ جائے تو اُس کو ایسا بھگاؤ کہ پھر کبھی ادھر آنے کا نام نہ لے۔ عامل نے زرینہ کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لیا اور اپنا چہرہ اُس کے بالکل قریب کر کے اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''تمہاری مراد پوری ہو جائے گی لیکن جنات کے اس دربار میں تمہیں جب وہ چاہیں حاضری دینا ہو گی اور وہ تمہاری خواہش پوری کر رہے ہیں۔ تمہیں اُن کی خواہش پوری کرنی پڑے گی''۔

عامل کا کہا ہوا ایک ایک لفظ پورا ہو گیا۔ زرینہ کا ناپسندیدہ دولہا آیا اور گھوڑی سے گر کر ایک ٹانگ سے محروم ہو گیا۔ زرینہ کے والدین نے اس خدشے کے پیش نظر کہ لڑکے کی ٹانگ کا زخم ملنے کے بعد اُس کے ماں باپ پیچھے نہ پڑ جائیں کہ اب شادی کرو، فوراً کسی اور جگہ زرینہ کی شادی کرنے کے لئے فہیم ہی کو منتخب کر لیا۔ اس سے پہلے فہیم کے ماں باپ نے بھی زرینہ کا رشتہ مانگا تھا لیکن زخمی ہونے والا دولہا ان کی برادری کا قریبی رشتہ دار تھا۔ اسی لئے اسے رشتہ دے دیا گیا، اب زرینہ کا رشتہ فہیم کو مل گیا۔ دس بارہ دنوں بعد فہیم کی بارات آئی اور زرینہ کو لے گئی۔

زرینہ پر عامل کی دھاک بیٹھ گئی لیکن معلوم نہیں کیا وجہ تھی کہ وہ دوبارہ عامل کے پاس نہ گئی۔ اس لڑکی سے زیادہ خوش قسمت اور کون ہو سکتا تھا کہ جو وہ چاہتی تھی بالکل ویسے ہی ہو گیا لیکن یہ خبر بڑی جلدی عورتوں میں پھیل گئی کہ زرینہ خوش نہیں اور اُس پر ہر وقت خاموشی طاری رہتی ہے۔ اُس کی سہیلیوں سے پتہ چلا کہ زرینہ اپنے آپ میں کوئی ایسا اثر محسوس کرتی ہے جو اُسے نہ ہنسنے مسکرانے دیتا ہے نہ بات کرنے دیتا ہے۔ بعض اوقات وہ رو بھی پڑتی تھی۔ اس کی ساس بہت پریشان ہوئی کہ لڑکی کو کیوں چپ لگی ہوئی ہے۔ زرینہ بڑی شوخ لڑکی ہوا کرتی تھی۔

زرینہ کا خاوند بھوپال سے کچھ دور کسی ضلع کے شہر میں ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں اپر ڈویژن کلرک تھا۔ اُس وقت بھوپال ایک مسلمان نواب کی ریاست تھی۔ اس کی حدود کے باہر انگریزوں کا قانون چلتا تھا۔ فہیم شادی کے دوسرے تیسرے مہینے زرینہ کو اپنے ساتھ لے گیا۔ مجھے یاد نہیں رہا کہ یہ کون سا شہر بتایا گیا تھا۔ بعض عورتیں کہتی تھیں کہ زرینہ ساس کے ساتھ خوش نہیں رہتی اور وہ فہیم کے ساتھ رہنا چاہتی ہے لیکن فہیم کے ساتھ گئی تو بھی اس کی حالت سدھر نہ سکی۔ فہیم اپنے خاندان کے مطابق بڑے اچھے ذہن اور کھلے دل کا آدمی تھا۔ اس نے زرینہ کو خوش رکھنے کا ہر طریقہ استعمال کیا لیکن وہ خوش ہونے کی بجائے رو پڑتی تھی۔ آخر فہیم ہار گیا۔ اُس نے زرینہ سے کہا کہ تمہاری دو سہیلیوں نے مجھے بتایا تھا کہ تم مجھے بہت پسند کرتی تھیں لیکن اب مجھ کو شک ہونے لگا ہے کہ تم کسی اور کو چاہتی ہو۔

فہیم کی زبانی یہ بات بھی معلوم ہوئی تھی کہ زرینہ میاں بیوی کے تعلقات میں برف کی مانند سرد رہتی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے اس کے اندر اس قسم کے جذبات ہیں ہی نہیں یا وہ فہیم کے معاملے میں ان جذبات کو سرد اور مُردہ رکھتی تھی۔ فہیم نے جب تنگ آ کر اُسے یہ کہہ دیا کہ وہ کسی اور کو چاہتی ہے تو زرینہ تڑپ اٹھی۔

''نہیں نہیں''۔ زرینہ نے روتے ہوئے کہا۔ ''خدا

کے لئے مجھ پر یہ الزام نہ لگائیں"۔

"پھر مجھے بتاؤ کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟" فہیم نے کہا۔ "اگر نہیں بتاؤ گی تو میں یہی سمجھوں گا کہ تمہیں میری روجیت پسند نہیں۔ اس کا یہی ایک علاج ہے کہ ہم علیحدہ ہو جائیں"۔

یہ ایسی چوٹ تھی جو زرینہ برداشت نہ کر سکی۔

"مجھ پر کوئی ایسا اثر ہے جس نے میرے خون کو سرد اور میری زبان کو بند کر رکھا ہے"۔ زرینہ نے کہا۔ "عورتیں کہا کرتی ہیں کہ دشمن کالے جادو کے تعویذ کرا دیتے ہیں۔ میں ڈرتی ہوں کہ میرے ساتھ بھی ایسا ہی نہ ہوا ہو"۔

"پھر میری امی کا شک صحیح معلوم ہوتا ہے"۔ فہیم نے کہا۔ "اگر یہی بات ہے تو یہ ان لوگوں کی کرتوت ہے جن کی بارات آ کر واپس چلی گئی تھی۔ انہوں نے یہ تو نہیں سوچا کہ ان کا لڑکا بیکار ہو گیا ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ انہیں لڑکی مل جائے۔ تم شاید یہ جانتی ہو گی کہ ہمارے شہر کے قریب ایک نقشبندی عامل ہے جو اس قسم کے کالے تعویذ بھی دیتا ہے اور ان کا توڑ بھی کرتا ہے۔ میں آج ہی ابو اور امی کو خط لکھتا ہوں کہ وہ اس عامل کے پاس جائیں اور وہ اس سے بات کریں"۔

اس عامل کا نام سن کر زرینہ گھبرا گئی۔ اُس نے فہیم سے کہا کہ اُس عامل کے پاس نہ جائیں۔ فہیم نے وجہ پوچھی تو زرینہ نے گول مول سی وجہ بتا کر ٹالنے کی کوشش کی فہیم عقلمند آدمی تھا۔ اُسے کچھ شک ہوا اور وہ زرینہ کے پیچھے پڑ گیا کہ اتنے مشہور اور قابل عامل سے وہ کیوں گھبراتی ہے۔

"یہی وہ راز ہے جو میں آپ سے چھپانے کی کوشش کرتی رہتی ہوں"۔ زرینہ نے کہا۔ "اور یہی راز مجھے اندر ہی اندر کھاتا رہا ہے۔ اب میں یہ راز آپ کے آگے رکھ دیتی ہوں اور میں اب محسوس کرنے لگی ہوں کہ مجھے یہ بات پہلے ہی بتا دینی چاہئے تھی...... میں پہلے دولہا کے ساتھ رشتہ طے ہو جانے پر اپنی دو سہیلیوں کے ساتھ اس نقشبندی عامل کے پاس گئی تھی اور اُسے کہا تھا کہ یہ رشتہ منسوخ ہو جائے اور میری شادی آپ کے ساتھ ہو جائے۔ اُس نے مجھے ایک تعویذ سادے کر کہا کہ یہ اپنے گھر کے باہر والے دروازے کے قریب زمین میں دبا دینا پھر تمہارے گھر میں تمہاری پسند کا آدمی بارات لے کر آئے گا۔ اگر کوئی اور دولہا بن کر آ گیا تو میرے جن اُسے ایسے طریقے سے واپس بھیجیں گے کہ وہ ساری عمر یاد رکھے گا......

"میں نے اُس کا تعویذ اپنے دروازے کے باہر دبا دیا۔ پھر آپ کو بھی معلوم ہے کہ جو آدمی مجھے اچھا نہیں لگتا تھا وہ بارات لے کر آیا تو اُس کے ساتھ کیا ہوا۔ اُس کی ایک ٹانگ ہی کٹ گئی۔ آپ کو میرے رشتے کا جواب مل چکا تھا لیکن میرے ماں باپ نے خود آپ کے ابو اور امی کو پیغام بھیجا کہ ہماری لڑکی کے ساتھ بات پکی کر لو۔ یہ ایک معجزہ تھا لیکن یہ معجزہ میرے لئے سزا بن گیا۔ وہ اس طرح کہ جب آپ کی بارات آئی تو میں بہت ہی خوش تھی لیکن مجھے جب آپ کے کمرے میں بٹھا کر لڑکیاں باہر نکل گئیں تو میرے دل کو کچھ ہو گیا۔ میں نے سنا تھا کہ پہلے روز ہر دلہن گھبرایا کرتی ہے۔ میں بھی یہ سمجھی کہ یہ پہلے روز والی گھبراہٹ ہے جو آپ کی ملاقات کے بعد ختم ہو جائے گی لیکن ایسا نہ ہوا......

"آپ کمرے میں آئے تو میرا دل اتنا بیٹھ گیا کہ رونے کو جی کرنے لگا۔ میں نے اپنے سارے وجود میں سردی محسوس کی۔ میرا خیال تھا کہ آپ جب میرے جسم کو ہاتھ لگائیں گے تو آپ مجھ سے پوچھیں گے کہ تمہارا جسم اتنا سرد کیوں ہے؟ میرے وہ جذبات جنہیں آپ جگانا چاہتے تھے وہ مر گئے۔ ایک خوف میرے دل پر بیٹھنے لگا۔ میں نہیں جان سکتی تھی کہ یہ کیسا خوف ہے۔ آپ شاید یہ

سمجھتے رہے ہو گے کہ میں نئے گھر اور نئی زندگی کی وجہ سے گھبرائی ہوئی ہوں......

"دن کو عورتیں مجھے دیکھنے آتی رہیں۔ اس رونق میں میرا دل ٹھیک رہا لیکن رات کو پھر وہی حالت ہو گئی۔ آپ نے مجھے کہا کہ تم بہت تھکی ہوئی ہو اور میں بھی تھک گیا ہوں، آج سو جاتے ہیں...... میں سو گئی۔ میں نے خواب دیکھا کہ میں اپنے پہلے دولہا کو دیکھنے ہسپتال جاتی ہوں۔ وہ لاش کی طرح بے ہوش پڑا ہے اور مجھے ایک آواز سنائی دی۔ 'اس شخص کو تم نے قتل کیا ہے'۔ میں ڈر جاتی ہوں۔ پھر میرے دل میں یہی خیال بیٹھ جاتا ہے کہ اس آدمی کو میں نے عامل کے تعویذ سے قتل کیا ہے......

"میری آنکھ کھلی تو دل کی گھبراہٹ سے میرا پسینہ نکل آیا۔ میں سمجھ گئی کہ یہ خوف کیسا ہے۔ بیشک اُس آدمی کو میں پسند نہیں کرتی تھی جو میرا دولہا بن کر آیا تھا لیکن میں نے اُسے ساری عمر کے لئے ایک ٹانگ سے محروم کر دیا ہے۔ وہ مجھے زبردستی اٹھا کر اپنے گھر لے جانے نہیں آیا تھا۔ اُس نے میرا رشتہ زبردستی نہیں لیا تھا"۔

مختصر یہ کہ زرینہ کے ضمیر پر اس جرم کا بوجھ آ پڑا کہ اُس نے عامل نقشبندی سے کالے جادو کا ایسا سخت تعویذ لے کر اپنے پہلے دولہا کے راستے میں دبایا تھا۔ وہ اپنے آپ کو مجرم سمجھنے لگی۔ فہیم نے مان لیا کہ عامل نقشبندی کے علم اور عمل میں طاقت ہے لیکن اُس کے لئے زرینہ نے مسئلہ کھڑا کر دیا۔ فہیم نے زرینہ کا وہم دور کرنے کی بہت کوشش کی لیکن زرینہ کی حالت بہتر نہ ہو سکی۔

"پھر ایک اثر اور بھی ہے"۔ زرینہ نے فہیم سے کہا۔ "میں یہ راز بھی آپ کو دے دوں تو بہتر ہو گا۔ آپ سے کچھ چھپا کر میں محسوس کرتی ہوں جیسے میں آپ کو اپنا نہیں سمجھتی...... بات یوں ہوئی تھی کہ عامل نے مجھے کہا تھا کہ اُس نے میرا کام کرنے کے لئے ایک جن مقرر کر دیا ہے۔ اُس نے مجھے بڑے عجیب طریقے سے کہا تھا کہ تمہیں کام ہو جانے کے بعد بھی یہاں آنا پڑے گا اور جو جن تمہاری خواہش پوری کرے گا وہ ہو سکتا ہے تم سے اپنی کوئی خواہش پوری کرنا چاہے۔ اگر تم نہ آئیں تو یہ جن تمہیں نقصان پہنچائے گا لیکن میں پھر بھی عامل کے پاس نہ گئی۔ اُس نے ایک عورت کی زبانی پیغام بھیجا کہ تم نے جنات کے دربار میں اپنا پھیرا پورا نہیں کیا۔ یہ فوراً پورا کرو"۔

فہیم نے زرینہ سے کہا کہ اُسے وہاں جانا چاہئے تھا۔ زرینہ نے اُسے بتایا کہ عورتوں سے پتہ چلا تھا کہ عورت کے معاملے میں اس عامل کی نیت ٹھیک نہیں ہوتی۔ زرینہ نے فہیم سے کہا کہ اُسے جس طریقے سے عامل نقشبندی نے کہا تھا کہ میں ایک بار اُس کے پاس آؤں، اس سے میں نے اُس کی نیت بھانپ لی تھی۔

"میں نے اس عورت سے کہا تھا کہ انہیں کہنا کہ میرا آنا اب مشکل ہو گیا ہے کیونکہ میری شادی ہو گئی ہے"۔ زرینہ نے فہیم کو بتایا۔ "میں نے کہلا بھیجا تھا کہ آپ جتنے پیسے کہیں گے وہ میں بھیج دوں گی۔ عامل نے اپنے جن کو سامنے رکھ کر اپنی خواہش ظاہر کر دی اور اسی عورت کی زبانی کہلا بھیجا کہ تم نہیں آؤ گی تو میں تمہارے پہلے دولہا کے باپ کو بتا دوں گا کہ تم نے مجھ سے اُن کے لڑکے کو جان سے مروانے کے لئے تعویذ کروائے تھے اور اس کے عوض تم نے مجھے اپنا جسم پیش کیا تھا۔ عامل نے یہ بھی کہا کہ میں تمہارے موجودہ سسرال تک بھی یہ بات پہنچا دوں گا اور میں یہ کام بھی کروں گا کہ جس جن نے تمہارا کام کیا ہے وہ تمہیں چین سے نہ بیٹھنے دے"۔

یہ دوسرا خوف یا وہم تھا جو زرینہ پر آسیب بن کر سوار ہو گیا۔ عامل نقشبندی نے اُسے یہ بھی کہا تھا کہ وہ ساری عمر ماں نہیں بن سکے گی۔ زرینہ نے فہیم کو بتایا کہ اُسے یقین ہے کہ عامل نے اُسے اس حالت میں لانے کے لئے کوئی عمل کیا ہے۔ زرینہ نے یہ بھی کہا کہ اُس کے

جذبات اتنے سرد ہو گئے ہیں کہ اُسے کبھی بچہ نہیں ہوگا۔

فہیم کے دل میں زرینہ کے خلاف جو غلط فہمی تھی وہ نکل گئی۔ اس کی جگہ ہمدردی پیدا ہوگئی لیکن فہیم بھی ڈر گیا کہ جس عامل نے ایک آدمی کو گھوڑی سے گرا کر بیکار کر دیا ہے اُس نے زرینہ پر بھی کوئی عمل کر دیا ہوگا۔ اس نے ارادہ کیا کہ عامل نقشبندی کے پاس جائے اور اُسے کچھ نذرانہ پیش کرے لیکن اُس نے اس خیال سے ارادہ توڑ دیا کہ عامل یہ مطالبہ نہ کر بیٹھے کہ اپنی بیوی کو بھیجو۔

فہیم بہت پریشان ہوا۔ اس کے دفتر کا سپرنٹنڈنٹ مسلمان تھا۔ فہیم نے اُس کے سامنے اپنا مسئلہ رکھا۔ ڈپٹی کمشنر کے دفتر کا یہ سپرنٹنڈنٹ جو کوئی رضوی صاحب تھا، ہنس پڑا۔ کہنے لگا کہ بیشتر عامل نوسرباز ہوتے ہیں اور یہ عامل زرینہ کو بلیک میل کر رہا ہے۔

"لیکن اُس نے زرینہ کے پہلے دولہا کو گھوڑی سے گرا دیا تھا"۔ فہیم نے کہا۔ "یہ اس کے تعویذ کا اثر تھا"۔

"کالے علم میں اس سے بھی زیادہ طاقت ہے"۔ بوڑھے رضوی نے کہا۔ "لیکن یہ نقشبندی جس طریقے سے تمہاری بیوی کے پیچھے پڑ گیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کالے علم کا عامل تو ہے لیکن شریف آدمی نہیں۔ کالا علم جاننے والے عموماً شریف نہیں ہوا کرتے"۔

فہیم نے اسے کہا کہ اُس کا مسئلہ باتوں سے حل نہیں ہوگا۔ وہ تو پوچھ رہا تھا کہ وہ کیا کرے ورنہ اُس کی اتنی اچھی بیوی کی ذہنی حالت بگڑتی چلی جائے گی اور وہ پاگل ہو جائے گی۔

ڈپٹی کمشنر کا دفتر ضلعے میں سب سے بڑا دفتر ہوتا ہے۔ پولیس بھی اس کے تحت ہوا کرتی تھی۔ اُس وقت ڈپٹی کمشنر انگریز ہوا کرتا تھا۔ وہ ضلعے کا بادشاہ ہوتا تھا۔ رضوی نے فہیم سے کہا کہ وہ کسی عقلمند آدمی سے معلوم کرائے گا کہ یہ عامل ہے کون۔

تیسرے چوتھے روز سپرنٹنڈنٹ نے فہیم کو بتایا کہ اُس نے ایک بڑا ذہین اور تجربہ کار مخبر نقشبندی کی اصلیت معلوم کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ یہ مخبر سائل کے بہروپ میں اپنا ایک مسئلہ لے کر عامل کے پاس گیا۔ مخبر نے آ کر بتایا کہ یہ نقشبندی کالا علم جانتا ہو گا لیکن وہ ٹھیک آدمی علوم نہیں ہوتا۔ مخبر نے عامل کے دو خاص مریدوں یا کارندوں میں ایک ایسے آدمی کو دیکھا جو عادی مجرم اور سزا یافتہ تھا۔ اس آدمی نے داڑھی مونچھیں اور سر کے بال بڑھا رکھے تھے اور سر کے بالوں پر سادھوؤں کی طرح راکھ اور مٹی ڈال رکھی تھی۔ عامل کے متعلق اُس نے بتایا کہ اپنی اصطلاحوں میں بات کرتا تھا جو اس مخبر نے اکثر عاملوں کی زبان سے سنی تھیں۔

سپرنٹنڈنٹ نے فہیم سے کہا کہ یہ عامل اگر ضلعے میں کسی جگہ ہوتا تو اُس کے متعلق مزید جاسوسی کرائے اگر اسے نہیں تو اس کے خاص کارندوں کو ہاتھ میں لے کر باقاعدہ تفتیش کرائی جا سکتی تھی مگر وہ ریاست کی حدود میں ہے۔ وہاں صرف اُس ملزم کو پکڑا جا سکتا ہے جس کے خلاف قابل یقین شہادت مل چکی ہو۔

اِدھر زرینہ کی حالت سدھرنے کی بجائے بگڑتی گئی۔ اسی سپرنٹنڈنٹ رضوی صاحب نے فہیم کو بہت ہی پریشان دیکھ کر کہا کہ اتنا مت ڈرو۔ اللہ کے کلام سے بڑھ کر اور کوئی تعویذ نہیں تم اپنے گھر میں ختم قرآن کروا دو لیکن سیپارے پڑھنے کے لئے مولویوں اور اُن کے شاگردوں کو نہ بلانا۔ وہ پیشہ ور لوگ ہوتے ہیں۔ اللہ کے کلام کی توہین کرتے ہیں۔ تم میاں بیوی خود قرآن کریم پڑھو۔ رضوی نے انہیں بتایا کہ رات کو سوتے وقت تم دونوں ''یا رحیم یا کریم'' ایک سو مرتبہ پڑھ لیا کرو۔

دونوں نے اگلے ہی روز قرآن مجید پڑھنا شروع کر دیا اور رات کو یہ وظیفہ بھی پڑھنے لگے۔ ابھی دس روز ہی گزرے تھے کہ رضوی نے فہیم کو اپنے دفتر میں بلا کر خوشخبری سنائی کہ عامل نقشبندی ایک آدمی کو قتل کر کے خود ہی ریوالور سمیت ہمارے ضلعے کے ایس پی صاحب کے پاس پہنچ گیا ہے۔

''میں اصل بات تو بعد میں سنوں گا''۔ فہیم نے کہا۔ ''وہ ریاست میں واردات کر کے ہمارے ضلعے میں کیوں آ گیا ہے؟''

''مجھے ابھی پوری بات کا پتہ نہیں چلا''۔ رضوی نے کہا۔ ''اتنا ہی پتہ چلا ہے کہ وہ جھانسی جیل کا پرانا مفرور تھا۔ شام تک پوری بات کا پتہ چل جائے گا۔ اپنی بیوی کو بتا دینا کہ جس عامل کا خوف اُس نے اپنے ذہن پر سوار کر رکھا تھا وہ مفرور قاتل تھا اور اب اُس نے قتل کی ایک اور واردات کی ہے اور خود ہی پولیس کے پاس آ گیا ہے۔ اپنی بیوی سے کہنا کہ اُس کے پاس اگر کوئی اتنا طاقت ور علم تھا تو وہ اس واردات کو ہضم کیوں نہ کر گیا اور یہ بھی سوچنے والی بات ہے کہ جو آدمی دعویٰ کرتا ہے کہ وہ اپنے کالے علم کے ذریعے جسے چاہے جان سے مار سکتا ہے، اس نے ریوالور سے کیوں قتل کیا؟''

فہیم نے رضوی سے پوچھا کہ پہلے دولہا کا گھوڑی سے گرنا اور اس کی جگہ میرا دولہا بن کر آنا اس عامل کا کرشمہ نہیں تھا؟ رضوی نے اُسے بتایا کہ یہ محض اتفاقات ہوتے ہیں اور بعض اتفاقات معجزے کی طرح لگتے ہیں۔ لوگ چونکہ سمجھ نہیں سکتے کہ ایسے کیوں ہوا اس لئے وہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ کسی نے اپنے علم کے زور سے معجزہ کر دکھایا ہے۔ ان پیروں کا عاملوں اور ہندوؤں کے سنیاسیوں اور سادھوؤں کا کاروبار ایسے ہی اتفاقات پر چلتا ہے۔

چار پانچ روز بعد عامل نقشبندی اور ایک جوان لڑکی کا اقبالی بیان رضوی کے سامنے آیا۔ فہیم اور زرینہ کے لئے یہ معجزہ اس طرح رُونما ہوا کہ جب زرینہ ایک وہم

اور ایک خوف کے شکنجے میں آئی ہوئی اندر ہی اندر گھلتی جا رہی تھی، اس وقت ایک روز اس عامل کے پاس ایک نوجوان لڑکی آئی۔ اس لڑکی کو دراصل عامل کے ایک خاص کارندے نے عامل کے سامنے پیش کیا تھا۔ اُس نے عامل سے کہا تھا کہ تمہارے لئے ایک ایسا تحفہ لایا ہوں جو تم نے پہلے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا ہوگا۔ کارندے نے یہ بھی کہا کہ میں نے اس تحفے کا ذائقہ چکھ لیا ہے اور اب تم بھی عیش موج کرلو۔

یہ تحفہ ایک نوجوان لڑکی تھی جس نے اس عامل کی شہرت اور اس کے کرشمے سن رکھے تھے۔ وہ دیہات کی دو تین عورتوں کے ساتھ آئی تھی۔ عامل کے کارندے نے اس لڑکی کو دیکھا تو اُسے الگ لے گیا۔ اس پر اپنی زبان کا جادو چلایا اور بتایا کہ عامل کسی کسی خوش قسمت کی مراد پوری کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ لڑکی کو اپنے جال میں پھانس کر اُس نے بے آبرو کیا اور اُسے یقین دلایا کہ اب تم جو چاہو گی وہ عامل نقشبندی کردے گا۔

عامل نے اپنے اقبالی بیان میں کہا کہ وہ جیل سے بھاگا ہوا قاتل ہے، اُس نے جھانسی جیل کا نام لیا۔ یہ پندرہ سولہ سال پہلے کا واقعہ تھا۔ اُسے عمر قید کی سزا ملی تھی۔ ایک روز وہ جیل کے دفتر میں جسے ڈیوڑھی کہتے ہیں کھڑا تھا۔ اُسے کسی سرکاری سلسلے میں بلایا گیا تھا۔ اتنے میں جیل کا بڑا گیٹ راشن والی دستی ریہڑی کے لئے پورے کا پورا کھول دیا گیا۔ عامل نے جو اُس وقت عامل نہیں تھا، دروازہ کھلا دیکھا تو جوں ہی ریہڑی اندر آئی تو وہ تیر کی طرح دروازے سے باہر نکلا اور اتنا تیز دوڑا کہ تعاقب سے پہلے ہی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ جھانسی کے قریب ہی سے گھنا جنگل شروع ہو جاتا تھا س۔ اس جنگل میں درختوں سے ڈھکی بیشمار چٹانیں تھیں جہاں کسی کا تعاقب بہت مشکل ہوتا تھا۔ رات کے وقت تو اس جنگل میں کوئی بھولے سے بھی نہیں پھٹکتا تھا کیونکہ وہاں دھاری دار شیر

اور بھیڑیے گھومتے پھرتے رہتے تھے۔

عامل جیل اور پولیس کے لئے چھلاوہ بن گیا پندرہ سولہ سال گزر گئے لیکن اس کا نام ونشان نہ ملا۔ اس نے اپنے اقبالی بیان میں بتایا کہ جیسا عامل وہ بن چکا تھا ویسا ہی ایک عامل اسے فرار کے تیسرے سال مل گیا۔ اُسے ایسے آدمیوں کی ضرورت رہتی تھی جو جرائم پیشہ یا مفرور ہوں اور اُس کی کرامات کا پروپیگنڈہ ایسے طریقے سے کریں کہ لوگ اُس کے جال میں پھنس جائیں۔ یہ مفرور قاتل اس کی شاگردی میں بیٹھ گیا اور نوسربازی کے ڈھنگ سیکھ لئے۔ اُس نے داڑھی مونچھیں اور سر کے بال بے تحاشہ بڑھا لئے اور عاملوں کی اصطلاحیں اور اداکاری بھی سیکھ لی تھی۔ اُس نے اس واقعہ کے سات آٹھ سال پہلے یہاں آن ڈیرہ جمایا اور اپنے استاد کی طرح دو چار جرائم پیشہ اپنے ساتھ ملا لئے۔

بھارت ہو یا پاکستان، لوگ اپنے مسائل اور حالات سے اس قدر مجبور ہوتے ہیں کہ غیبی سہاروں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ جہاں انہیں کسی نئے پیر فقیر یا کسی شاہ صاحب یا عامل کا پتہ ملتا ہے وہ اٹھ دوڑتے اور اُس کے قدموں میں جا گرتے ہیں۔ یہ بھٹکے ہوئے اور فریب خوردہ لوگ اس نئے عامل کے ڈیرے پر پہنچنے لگے۔ یہ ایک الگ داستان ہے کہ اس شخص کا فراڈ اور اس کی نوسربازی کن ذرائع سے اور کن طریقوں سے کامیاب ہوتی رہی۔ بعض لوگوں کی مرادیں اتفاقیہ پوری ہوگئیں تو اسے بھی انہوں نے اسی عامل کا کرشمہ سمجھا اور اُس کا خوب پرچار کیا۔ اس طرح ایک مفرور قاتل عامل نقشبندی بن گیا۔

اس شخص نے اپنے اقبالی بیان میں کہا کہ اُس کے ایک کارندے نے ایک جوان لڑکی جس کی عمر بائیس تئیس سال تھی اُس کے سامنے بٹھا دی۔ اس کے متعلق کارندے نے عامل کو پہلے کہا تھا کہ ایک تحفہ پیش کر رہا ہوں جس کا وہ ذائقہ چکھ چکا ہے۔ عامل اُس وقت تک ایسی کئی لڑکیوں اور جوان عورتوں کے ساتھ کھل کھیل چکا تھا لیکن یہ لڑکی اُسے اتنی پیاری لگی کہ اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اسے خواہ بیوی بنائے یا داشتہ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھے گا۔ لڑکی غیر شادی شدہ تھی۔

عامل نے اُس سے پوچھا کہ وہ اُس کے پاس کیوں آئی ہے؟

''میں اپنے باپ کی تلاش میں آئی ہوں''۔ لڑکی نے کہا۔

''کیا تمہارا باپ لاپتہ ہو گیا ہے؟''

''بات یہ ہے کہ میرا باپ قتل کے جرم میں گرفتار ہوا تھا''۔ لڑکی نے کہا۔ ''اُسے عمر قید سزا ہوئی تھی۔ ایک روز پولیس نے ہمارے گھر میں داخل ہو کر سارے گھر کی تلاشی لی اور میری ماں کو تھانے لے جا کر مارا پیٹا۔ ہمیں بتایا گیا کہ میرا باپ جھانسی جیل سے بھاگ گیا ہے''۔

''یہ کب کی بات ہے؟''

''میں اُس وقت بچی تھی''۔ لڑکی نے جواب دیا۔ ''میری عمر پانچ چھ سال تھی۔ مجھے قتل کا واقعہ اچھی طرح یاد ہے''۔

''تمہارے باپ نے کسے قتل کیا تھا؟''

''وہ جنگل کے محکمے کا ملازم تھا''۔

''اُس کا نام کیا تھا؟''

''کریم الدین''۔ لڑکی نے جواب دیا۔ ''اُسے 'کاما، کاما' کہتے تھے''۔

عامل کو بڑی زور کا دھچکا لگا۔ اُس نے لڑکی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پوچھا۔ ''وہ جنگل کے ڈاک بنگلے کا چوکیدار تھا؟''

''آپ کو کیسے پتہ چلا؟'' لڑکی نے حیران ہو کر پوچھا۔

''ہمیں کیا معلوم نہیں''۔ عامل نے کہا۔ ''کہو تو

تمہارے گھر کی ساری باتیں بتادوں"۔

"آپ کچھ بھی نہ بتائیں"۔ لڑکی نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا اور عامل کا ہاتھ چوم کر بولی۔ "آپ مجھے یہ بتادیں کہ میرا باپ زندہ ہے یا مر چکا ہے۔ اگر زندہ ہے تو بتادیں کہ وہ کہاں ہے۔ یہ بھی بتائیں کہ میں اور میری ماں اُس تک پہنچ سکتی ہیں یا نہیں۔ میں آپ کو یہ بھی بتادوں کہ آپ نے مجھ سے نقد نذرانہ مانگا تو شاید میں پوری رقم نہ دے سکوں۔ ہم ماں بیٹی بہت غریب ہیں۔ مجھے اپنی لونڈی سمجھ لیں، آپ کا ہر حکم بجالاؤں گی"۔

عامل نقشبندی جو دراصل کریم الدین عرف کاما تھا، تڑپ اٹھا۔ اُس نے اپنے اقبالی بیان میں کہا کہ اُسے یاد آ گیا کہ اُس کے ایک خاص کارندے نے کہا تھا کہ وہ اس تحفے کا ذائقہ چکھ چکا ہے۔

"مجھے سچ بتاؤ لڑکی!" کامے نے لڑکی سے پوچھا۔ "میرے جس آدمی نے تمہیں مجھ تک پہنچایا ہے، اُس نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟"

"اُس نے میرے ساتھ جو سلوک کیا ہے وہ میرے لئے کوئی نئی بات نہیں"۔ لڑکی نے کہا۔ "آپ نہیں جانتے کہ میں اور میری ماں کس طرح زندگی بسر کر رہی ہیں۔ میری ماں ایک بڑے گھر میں نوکرانی ہے۔ کبھی کبھی مجھے بھی اُس گھر سے بلاوہ آتا ہے اور مجھے اس گھر کے بڑے بیٹے کا حکم ماننا پڑتا ہے۔ اسی لئے میں اپنے باپ کی تلاش میں نکلی ہوں۔ وہ کہیں مل جائے تو ہماری عزت کا محافظ بنے۔ میرا باپ بدمعاش چور یا ڈاکو نہیں تھا۔ اُس نے جنگل کے ایک ہندوستانی افسر کو اس لئے قتل کیا تھا کہ اُس افسر نے جنگل کے ملازم کی جوان بیوی کو حکم دیا تھا کہ وہ ڈاک بنگلے میں اُس کے پاس آئے۔ اس کا خاوند نوکری سے جواب ملنے کے ڈر سے چپ رہا۔ میرے باپ کو یہ سب کچھ معلوم تھا۔ اُس ملازم کی بیوی رات کو ڈاک بنگلے میں گئی۔ میرا باپ وہاں ڈیوٹی پر تھا اُس نے اُس عورت سے کہا کہ وہ واپس چلی جائے۔ عورت رو پڑی اور بولی کہ صاحب کا حکم نہ مانا تو کہاں جائیں گے؟ وہ روتی ہوئی ڈاک بنگلے میں 'صاحب' کے کمرے میں چلی گئی۔ صاحب اپنے آپ کو جنگل کا بادشاہ سمجھتا تھا۔ اُس نے دروازہ اندر سے بند نہ کیا۔ اُس نے سب سے پہلے عورت کو شراب پلائی۔ جب صاحب نشے کی حالت میں اس عورت کے ساتھ بے ہودہ حرکتیں کرنے لگا تو میرا باپ اندر چلا گیا۔ اس کے پاس محکمے کی دی ہوئی رائفل تھی اُس نے صاحب کو گولی مار دی لیکن بھاگا نہیں وہیں بیٹھا رہا۔ آدھی رات کے بعد دوسرے ملازموں کی اطلاع پر پولیس آئی اور وہ پکڑا گیا۔ میرا باپ جتنا غیرت مند تھا، میں اور میری ماں اتنے ہی بے غیرت ہو گئے ہیں"۔

کریم الدین اچانک اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے اپنے کارندے کو آواز دی۔ کارندہ آیا تو کامے نے اُس سے پوچھا کہ یہ ہے وہ تحفہ جس کا تم نے ذائقہ چکھا ہے؟ اس جرائم پیشہ کارندے نے مستانہ سے لہجے میں جواب دیا کہ ہاں یہی وہ تحفہ ہے۔ کامے نے اپنے چغے کے اندر ہاتھ ڈالا اور ریوالور نکال کر اس کارندے کو کیے بعد دیگرے دو گولیاں مار دیں۔ لڑکی کی چیخ نکل گئی اور وہ خوفزدہ ہو کر باہر کو بھاگی۔ کامے نے لپک کر اسے پکڑ لیا، لڑکی نے چلانا شروع کر دیا۔

"ٹھہر جا لڑکی!" کریم الدین نے اُسے اپنے بازوؤں میں لے کر اپنے ساتھ لگا کر کہا۔ "میں ہوں تمہارا وہ باپ جسے تم ڈھونڈ رہی ہو"۔

اُس نے اپنی بیوی کا، اُس کے باپ کا اور اپنے گاؤں کا نام لیا۔

لڑکی کی حالت ایسی ہو گئی جیسے وہ غش کھا کر گر پڑے گی۔ کریم الدین عرف کامے نے اُسے اپنے

ساتھ لیا۔ ریوالور اپنے چغے میں ڈالا اور بھوپال شہر میں آ گیا۔ اسے کوئی پہچان نہیں سکتا تھا۔ بھوپال سے وہ گاڑی میں بیٹھا اور اس ضلع میں پہنچ گیا۔ اُس نے اپنے اقبالی بیان میں کہا کہ اُس نے غیرت کے جوش میں آ کر ایک ایسی عورت کی عزت کے پیچھے جو اُس کی کچھ بھی نہیں لگتی تھی اپنے محکمے کے ایک افسر کو مار ڈالا تھا۔ یہ تو اس کی اپنی بیٹی تھی۔ میں نے پہلے تو یہ ارادہ کیا تھا کہ اپنے آپ کو بھی گولی مار لوں کیونکہ اپنی بیوی اور جوان بیٹی کی ذلت اور رسوائی کا مجرم میں ہی تھا لیکن مجھے ایک خیال آ گیا گورنمنٹ نے میری گرفتاری کے لئے دس ہزار روپیہ انعام مقرر کیا تھا۔ میں یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے میری بیٹی نے گرفتار کروایا ہے۔ میں تو پھانسی کے تختے پر جا رہا ہوں۔ انہیں دس ہزار مل جاتے ہیں تو میری بیوی میری بیٹی کو کہیں بیاہ دے گی اور ان کا کچھ سہارا بن جائے گا"۔

اُس زمانے کا دس ہزار روپیہ آج کے سوا لاکھ کے برابر تھا۔ ایس پی انگریز تھا اسے کامے اور اس کی بیٹی پر ایسا ترس آیا کہ اُس نے کاغذوں میں کامے کی گرفتاری اس طرح لکھوائی جیسے کامے نے اپنے آدمی کو قتل کیا اور اپنے گاؤں چلا گیا اور اس کی بیٹی نے پولیس کو رپورٹ کر کے اسے گرفتار کروا دیا۔ اس طرح اس کی بیٹی کو دس ہزار روپے انعام کا حقدار قرار دے دیا۔

جب کامے کا کیس کورٹ میں چلا تو ایک پیشی پر رضوی نے فہیم سے کہا کہ وہ اپنی بیوی کو ساتھ لے آئے۔ فہیم بیوی کو ساتھ لے گیا۔ رضوی ڈی سی آفس کا سپرنٹنڈنٹ تھا۔ پولیس پر اُس کا حکم چلتا تھا۔ وہ فہیم اور زرینہ کو اپنے ساتھ کورٹ میں لے گیا۔ کریم الدین ہتھکڑیوں میں وہاں برآمدے میں دو کانسٹیبلوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ رضوی نے زرینہ کو اُس کے سامنے اکھڑا کیا۔

"اچھی طرح دیکھ لو بیٹی!" رضوی نے زرینہ سے کہا۔ "کیا یہی تھا وہ عامل؟"

زرینہ نے سر ہلا دیا کہ یہی تھا۔

"اسے کہو کہ اس کے ہاتھ میں کسی اُلٹے سیدھے علم کی طاقت ہے تو اس ہتھکڑی کو توڑ دے"۔ رضوی نے زرینہ سے کہا کہ کریم الدین عرف کاما ہنس پڑا اور بولا۔

"میرا کھیل ختم ہے"۔

رضوی زرینہ اور فہیم کو واپس لے آیا اور زرینہ کو بتایا کہ یہ کیا نوسر بازی تھی اور یہ بھی کہا کہ قرآن حکیم اور 'یارحیم یا کریم' کا کرشمہ تم نے دیکھ لیا ہے۔ اس روز سے زرینہ اپنی اصلی حالت میں واپس آنے لگی اور چند روز بعد وہ بالکل نارمل ہو گئی۔

مقدمے کی سماعت روز بروز ہوتی رہی اور بھوپال کے دیہاتیوں کے عامل نقشبندی کو سزائے موت کی بجائے عمر قید دی گئی لیکن اُسے پہلی عمر قید کی سزا جس سے وہ فرار ہوا تھا پہلے پوری کرنی تھی اس کے بعد دوسری عمر قید کی سزا کو شروع ہونا تھا۔ فرار کی سزا جو آٹھ سال تھی وہ الگ تھی۔ اس کے ساتھ زیادتی یہ ہوئی کہ فیصلے میں لکھا گیا کہ یہ سب سزائیں ایک دوسری کے بعد پوری کی جائیں گی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ اس شخص کو باقی عمر جیل میں گزارنی تھی۔

اور جب میں نابھہ جیل میں جاسوسی کے الزام میں بند تھا وہ عامل نقشبندی جس کا نام کریم الدین عرف کاما تھا، نابھہ جیل میں قادری صاحب کہلاتا تھا اور جیل کا تمام عملہ اور قیدی اُس کی بہت تعظیم کرتے تھے۔ میرے ساتھ پہلی ملاقات میں اُس نے مجھے کہا تھا کہ رات سونے سے پہلے 'یارحیم یا کریم' ایک سو مرتبہ پڑھ لیا کرو۔

✿✿✿

خوش تر اوصاف شخصیت

حاجی محمد رمضان چشتی نے عوام کے لئے صاف پانی کے دو پلانٹ لگوائے

☆ ---------------------------------- ابو خالد الحاج محمد رفیع ہاشمی ہجویری

ہر ذی شعور انسان کا یہ مکمل ایمان ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا بلکہ راقم کا تو یقین کامل ہے کہ اللہ ابد تک تو کیا بلکہ ہمیشہ رہے گا۔ ابد تک کہہ کر اس کا قائم رہنا تو محدود ہو جاتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کی پاک ذات تو لامحدود ہے اور وہ ہمیشہ قائم رہے گا۔ قرآن کریم میں ارشاد خداوندی ہے کہ اللہ کریم 6 یوم میں پوری کائنات کو بنا کر اپنے تخت پر جلوہ گر ہوا۔ قرآن کریم کی سورۃ البقرہ کی آیت نمبر 30 اور سورہ حجر کی آیت نمبر 29 سے ہمیں آگاہی ملتی ہے کہ جب اللہ کریم نے دنیا آباد کرنا چاہی تو فرشتوں کو اکٹھا کر کے فرمایا "انی جاعلٌ فی الارض خلیفة" کہ میں (یعنی اللہ پاک) زمین میں انسان کو اپنا نائب مقرر کرنا چاہتا ہوں۔

راقم تو خلیفہ کا ترجمہ نائب کی بجائے نمائندہ کرتا ہے کیونکہ نائب سے کچھ اور مطلب بھی نکل سکتا ہے۔ تو فرشتوں نے عرض کی کہ اے اللہ کیا ہم تیری پاکی بیان کرنے کے لئے کافی نہیں؟ انسان تو زمین میں فساد برپا کرے گا (آیت نمبر 30 سورۃ البقرہ)۔ اگر آج کل کی دہشت گردی، بم دھماکوں، خودکش حملوں، ٹارگٹ کلنگ میں خونریزی کے تناظر میں دیکھا جائے تو راقم کروڑہا بار اپنے رب سے معافی طلب کرتے ہوئے یہ کہنے کی جسارت کرتا ہے کہ فرشتوں کے تحفظات بھی غلط نہ تھے۔ اللہ پاک نے فرشتوں سے فرمایا انی اعلم مالا تعلمون کہ جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے (آیت نمبر 30 سورۃ البقرہ)۔ فرشتوں نے عرض کی کہ اے اللہ بیشک تو بہتر جانتا ہے ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں جتنا تو نے ہمیں علم عطا کیا ہے۔ (آیت نمبر 32 سورۃ البقرہ)

خدائے ذوالجلال نے آخر حضرت آدم علیہ السلام کو آب و خاک سے تخلیق فرمایا اور اس سے قبل اللہ پاک نے جنات کو آگ کی لو سے پیدا کیا۔ جیسا کہ سورۃ الرحمٰن کی آیت نمبر 15 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ و خلق الجان مین مارج من نار جب اللہ کریم نے حضرت آدم علیہ السلام کے پتلے میں روح پھونکی تو راقم کو یقین ہے کہ وہ لا الہ الا اللہ کہتے ہوئے حالت زیست میں آ گئے ہوں گے۔ جب اللہ کریم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا مگر ابلیس نے جس کا آسمانوں پر نام عزازیل تھا، حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔

یہاں ایک بات قابل غور ہے کہ ایک طرف تو فرمان الٰہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اس کے سوا کسی کو سجدہ روا نہیں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ کریم

خود ہی اپنے سوا کسی اور کو سجدہ کرنے کا حکم دے کیونکہ قرآن پاک ہمیں بتلاتا ہے کہ لا تبدیل لکلمت اللہ یعنی اللہ کریم کے احکامات تبدیل نہیں ہو سکتے (سورہ یونس آیت نمبر 64) بہت سے حضرات نے دیکھا ہوگا کہ جب سنار سونے کے زیور میں کچھ بہتری لانے کے لئے ایک موم بتی جلا کر ایک پھونکنی سے جس کا ایک سرا نہایت باریک اور دوسرا سرا قدرے بڑا منہ سے لگا کر باریک حصہ جلتی ہوئی موم بتی کے شعلے میں رکھ کر پھونک مارتا ہے تو اس شعلے سے آگ نکل کر سونے کے زیور پر پڑتی ہے تو وہ چمک اٹھتا ہے۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ اللہ کریم نور ہے۔ جب اللہ پاک نے اپنے نور مبارک سے حضرت آدم علیہ السلام کے پتلے میں رُوح پھونکی ہوگی تو اللہ کریم کا ذاتی نور مبارک حضرت آدم علیہ السلام کے پتلے میں داخل ہو گیا۔ جہاں تک راقم کی فہم و فراست کام کرتی ہے اللہ کریم کا حضرت آدم علیہ السلام کے مٹی سے بنے پتلے کو سجدہ کروانا مقصود نہ ہوگا بلکہ سجدہ تو اللہ تعالیٰ کے اس ذاتی نور مبارک کو کروانا تھا جو خدائے ذوالجلال کے نور پاک سے نکل کر حضرت آدم علیہ السلام کے پتلے میں داخل ہوا مگر مغرور ابلیس اس راز کو نہ سمجھ سکا اور اس نے تکبر کیا۔

اگر انسانوں اور جنات کے اجزائے ترکیبی کا تجزیہ کیا جائے تو انسانوں کو مٹی اور پانی سے تخلیق کیا گیا اور جنات کو آگ کے شعلے سے تو یہ بات عیاں ہوگئی کہ جب آگ جلائی جائے تو اس کا شعلہ اوپر کو سر اٹھاتا ہے جو غرور اور تکبر کی نشانی ہے لیکن مٹی جب بھی گرتی ہے تو وہ نیچے کی جانب آتی ہے جو کہ عاجزی اور انکساری کا مظہر ہے۔ مٹی کو خواہ اوپر کی جانب ہی کیوں نہ اچھالا جائے تو وہ پھر بھی نیچے کی طرف ہی گرے گی جیسے کہ مٹی سے بنا انسان اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہو کر اپنی عاجزی اور انکساری کا اظہار کرتا ہے۔

جب اللہ کریم نے ابلیس سے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کرکے اپنی حکم عدولی کی وجہ پوچھی تو اس نے جواب دیا کہ مجھے تُو نے آگ سے پیدا کیا جبکہ آدم کو مٹی، گارے سے۔ میں اس سے اعلیٰ ہوں میں اپنے سے کمتر کو سجدہ کیوں کروں۔ سورہ حجر آیت نمبر 33 جیسا کہ قرآن کریم کی سورہ طٰہٰ کی آیت نمبر 116 میں بیان ہے کہ اس پر اللہ کریم نے اسے ملعون قرار دیتے ہوئے حکم دیا کہ تم راندۂ درگاہ ہو اور نکل جاؤ عرش معلی سے۔ سورہ حجر آیت نمبر 34 میں اللہ کریم نے حضرت آدم علیہ السلام کو حکم دیا کہ اے آدم تم اور تمہاری زوجہ جنت میں رہو اور جو چاہو کھاؤ پیو مگر ایک درخت کے قریب جانے اور اس کا پھل کھانے سے منع فرمایا (القرآن آیت نمبر 35 البقرہ)۔ شیطان کو عرش معلی سے ملعون قرار دے کر نکالنا اور حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ کریم کی جانب سے جنت عطا کرنا شیطان کو کھٹکنے لگا اور یہی بات اس کی حضرت آدم علیہ السلام سے دشمنی کا سبب بنی۔ اسی حسد کی وجہ سے وہ اس کوشش میں لگا رہا کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے نکلوائے اور آخر کار (سورہ طٰہٰ آیات نمبر 116 تا 120) اس نے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنے بہکاوے میں پھنسا لیا تو ان سے شجر ممنوعہ کے قریب جانے اور اس کا پھل کھانے کا سہو ہو گیا جس کی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ کریم کے حکم کے تحت جنت سے نکلنا پڑا۔ انتظار بسیار کے بعد جب حضرت آدم علیہ السلام نے حضرت محمدؐ کا واسطہ دے کر اپنے سہو کی معافی چاہی تو اللہ کریم کو اپنے بندے پر رحم آ گیا اور اللہ تعالیٰ نے خود ہی اسے یہ دعا "ربنا ظلمنا انفسنا و ان لم تغفرلنا و ترحمنا و لنکونن من الخسرین" (القرآن) سکھا کر حضرت آدم علیہ السلام کو معاف فرما دیا (سورہ طٰہٰ آیت نمبر 122)۔

آغاز سے لے کر ابد تک راقم نے اللہ کریم کے انسان کو زمین میں اپنا خلیفہ بنانے کا ارادہ، فرشتوں سے

اس پر تحفظات کا اظہار، آدم علیہ السلام کی تخلیق، فرشتوں کو آدم کو سجدہ کرنے کا اللہ کا حکم، شیطان کی نافرمانی اور راندہ درگاہ ہو جانے کا تذکرہ کیا ہے اور اجزائے ترکیبی کے لحاظ سے انسانوں کا جنات سے خصائل کا موازنہ کیا ہے۔ بیشک اللہ کریم نے انسان کو بہترین شکل شباہت میں پیدا کیا اس کی روشنی میں دیکھا جائے تو اللہ کریم کی اس بہترین تخلیق کا کسی اور مخلوق سے موازنہ بنتا ہی نہیں۔ اللہ کریم نے انسانوں ہی میں سے انبیاء و رُسل مبعوث فرمائے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے "تلک الرسل فضلنا بعضھم علی بعض" یعنی انبیاء و رُسل میں بھی بعض کو کچھ معاملات میں بعض پر فضیلت عطا فرمائی۔

اسی طرح انسانوں میں بھی کچھ کو بہترین اوصاف عطا فرمائے جو کہ باوجود خوشحالی اور بہتر حالات کے اپنے رب کے احسانات نہیں بھولے اور وہ اپنے رب سے ڈرتے اور شکر گزار بندے بنے رہے۔ ان خوش اوصاف لوگوں میں سے ایک جن سے راقم کے تعلقات تقریباً دو دہائیوں پر محیط ہیں وہ نہایت ہی محترم شخصیت ہے۔ حاجی محمد رمضان چشتی جن کو اللہ کریم نے نہایت اعلیٰ اقدار سے نوازا ہے جو کہ سٹیل مل مالک، پوش علاقے میں ایک اچھے گھر اور دیگر سہولیات کے مالک ہونے کے باوجود نہایت مٹے ہوئے، انکساری کے پیکر اور درویش منش انسان ہیں۔ ان کو اللہ نے بہت سی خوبیوں سے نوازا ہے۔ یہ ایک نہایت خوش الحان نعت خواں اور ایک بہت ہی مشہور نعت گو اور نعت خواں جناب عبدالرشید چشتی صاحب کے فرزند ہیں۔ رواداری، صلہ رحمی، خلق خدا کی خدمت، ہمدردی اور غمخواری ان میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ شہر کے بیچ جو نہر گزرتی ہے اس میں کبھی کبھار کاریں وغیرہ گر جاتی تھیں جس سے جانی نقصان بھی ہو جاتا تھا، حاجی صاحب نے ان حادثات سے بچاؤ کے لئے نہر کے پشتوں پر آہنی

جھگڑے لگائے۔ پتنگ بازی کے باعث بچوں اور بڑوں کی ہلاکتیں ان کے لئے سوہانِ روح تھیں۔ انہوں نے آگے بڑھ کر پتنگ بازی اور کیمیکل ڈور کے خلاف آواز اٹھائی اور اس پر پابندی کے لئے تحریک چلائی جس کے لئے وہ ہائی کورٹ تک پہنچے۔ اس تحریک میں راقم نے بھی کچھ حد تک حصہ لیا۔ کچھ لوگ عوام الناس کے علاج معالجہ کے لئے ہسپتال بنا رہے تھے لیکن حاجی رمضان صاحب سوچتے اور چاہتے تھے کہ کچھ ایسا کام کیا جائے کہ لوگ بیمار ہی نہ ہوں۔

آلودہ پانی پینے سے لوگوں کا مہلک بیماریوں میں مبتلا ہونا جن میں خصوصاً ہیپاٹائٹس شامل ہے، ان کو بے چین کر دیتا جس کے تدارک کے لئے انہوں نے ٹھان لی۔ سب سے پہلے باوامی باغ میں فلٹرڈ منرل واٹر کا پلانٹ لگا کر لوگوں کے لئے فی سبیل اللہ پانی مہیا کرنا شروع کر دیا حتیٰ کہ جن لوگوں کے پاس کین نہ تھے انہیں کین بھی بلاقیمت فی سبیل اللہ مہیا کئے۔ حاجی صاحب کے ایک سٹاف ممبر قاری محمد سعید خان صاحب نے جوڑے پل کے قریب کی آبادیوں میں بھی آلودہ پانی کی وجہ سے لوگوں کی زبوں حالی کا رونا رویا تو حاجی صاحب نے وہاں پر بھی ایک فلٹرڈ منرل واٹر پلانٹ لگا دیا اور لوگوں کی بے حد دعائیں لے رہے ہیں۔

حاجی صاحب نعت خوانی کا کوئی نذرانہ وغیرہ نہیں لیتے نہ صرف تمام رفاہی کاموں میں کسی سے چندہ وغیرہ بھی اکٹھا نہیں کرتے بلکہ منرل واٹر پلانٹ بھی لاکھوں روپے اپنی جیب سے خرچ کر کے لگوائے ہیں۔ ابو بن ادھم کے بارے میں زمانہ طالب علمی میں پڑھی ہوئی انگریزی نظم کی یاد راقم کے ذہن میں مچل رہی ہے۔ حضرت ابو بن ادھم ایک اللہ والے بزرگ گزرے ہیں لیکن خلق خدا کی خدمت ان کا شعار تھا۔ ایک رات انہوں نے دیکھا کہ کوئی ان کے بیڈ روم میں بیٹھا کچھ لکھ رہا ہے۔ پوچھا تم کون ہو اور کیا کر رہے ہو۔ جواب دیا کہ میں فرشتہ ہوں اور فہرست بنا رہا ہوں۔ پوچھا کن لوگوں کی فہرست بنا رہے ہو۔ کہا کہ ان لوگوں کی جو اللہ سے محبت کرتے ہیں۔ پوچھا کیا میرا نام ہے تو فرشتے نے جواب دیا کہ نہیں اور چلا گیا۔ کچھ دن بعد پھر حضرت ابو بن ادھم نے ایسا ہی منظر دیکھا کہ کوئی ان کے کمرے میں موجود کچھ لکھ رہا ہے۔ پوچھا کون ہو جواب ملا کہ فرشتہ۔ پوچھا کیا کر رہے ہو۔ کہا کہ فہرست بنا رہا ہوں ان لوگوں کی جو اللہ کی مخلوق سے محبت کرتے ہیں اور ان کی خدمت کرتے ہیں تو اللہ ان سے محبت کرتا ہے۔ پوچھا کیا میرا نام ہے تو فرشتے نے جواب دیا کہ آپ کا نام سرفہرست ہے اور چلا گیا۔ تو ثابت ہوا کہ خلق خدا کی خدمت کر کے بندہ اللہ کی محبت حاصل کر لیتا ہے جو کہ کتنے اعزاز کی بات ہے اور یہ کتنا بڑا انعام ہے۔

راقم کوئی درباری قصیدہ گو یا چاپلوس انسان نہیں ہے۔ اگر اللہ کریم نے کسی انسان کو اوصافِ حسنہ سے نوازا ہو تو انہیں اجاگر کرنا اور بیان کرنا اور تعریف کرنا کوئی معیوب بات نہیں بلکہ یہ تو اوصافِ حسنہ عطا کرنے والے خالق اور مالک کی ہی تعریف ہے۔ اس تحریر سے راقم کی منشاء صرف یہی ہے کہ دیگر اہلِ ثروت صاحبان بھی حاجی رمضان صاحب کی تقلید کرتے ہوئے مخلوقِ خدا کی خدمت کے لئے میدان میں آئیں جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ میں اکیلا نکلا تھا لوگ ملتے گئے کارواں بن گیا۔ اس طرح مجبور اور ضرورت مند بندگانِ خدا کے آلام و مصائب ختم ہو جائیں تو ہمارا ملک جنتِ ارضی بن جائے گا۔ آمین!

درد دل کے واسطے پیدا کیا انساں کو
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

❀❀❀

''سیما! یقین کرو میں تمہارے ساتھ ضرور نکاح کر لیتا''۔ ایک دن زمان خان نے کہا۔ ''لیکن میری کچھ مجبوری ہے کہ میں ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ میری اولاد جوان ہے''۔

☆ ---------------- عبدالحفیظ بشر

عارف رضا پیشے کے لحاظ سے گورنمنٹ اے کلاس کا کنٹریکٹر تھا۔ وہ بڑا خوش لباس اور خوش خوراک تھا۔ ویسے کہنے کو تو وہ ٹھیکیدار تھا لیکن اپنی چال ڈھال بول چال اور عادات اور شکل وصورت سے بالکل نواب زادہ ہی لگتا تھا۔ وہ "آج" پر یقین رکھتا تھا۔ "کل" کو بالکل نہیں مانتا تھا۔ اس کی فضول خرچی کا یہ عالم تھا کہ اس نے گھر کی ضرورت کے لئے اگر بازار سے کوئی معمولی چیز بھی خریدنا ہوتی تو وہ بازار اپنی گاڑی پر ہی جاتا۔ اس کی شاہ خرچیوں کا یہ عالم تھا کہ وہ گھر سے اپنی جیب میں جتنے بھی پیسے لے کر نکلتا جب تک وہ ختم نہ کر لیتا واپس گھر نہ آتا۔ جب وہ گھر آتا تو اس کی جیب خالی ہوتی۔ اس کی بیوی اس سے اکثر بحث مباحثہ کرتی کہ انسان کو بُرے دنوں کے لئے کچھ نہ کچھ تو بچا کر رکھنا چاہئے۔ وہ جواب میں بڑے فخر اور غرور سے کہتا۔

"بابر بہ عیش کوش، عالم دوبارہ نیست"۔

بیوی جواباً ہنس کر کہتی۔

"یہ ضرب المثل بادشاہوں یا پھر بڑے بڑے امیر کبیر لوگوں پر تو صادق ہوسکتی ہے ایک عام شخص پر اس کا اطلاق ممکن نظر نہیں آتا"۔

عارف رضا اس صورت میں غصے سے جھڑک کر اپنی بیوی کو کہتا کہ تم مجھے اس قسم کی چھوٹی چھوٹی اور دقیانوسی قسم کی باتیں مت سنایا کرو۔ میرا حوصلہ بڑھانے کی بجائے پست کرتی ہو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ سکندر اعظم جب اس دنیا سے رخصت ہوا تو کیا وہ اپنی دولت اپنے ساتھ قبر میں لے کر اتر گیا؟ نہیں، وہ خالی ہاتھ قبر میں اترا۔ تمہاری سوچ فکر اور حرکات ایک عام سی گھریلو قسم کی عورت جیسی ہیں جس کو میں ہرگز نہیں مانتا۔ یہ بات جان لو کہ میں ہر وہ کام کروں گا جو میری مرضی ہوگی۔ انسان دنیا میں ایک بار آتا ہے تو پھر کیوں نہ وہ اپنی زندگی کا بھرپور مزا لے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ عورتوں میں دانائی نام کی کوئی چیز ہوتی ہی نہیں۔ آئندہ تم مجھے اس قسم کی فضول باتیں مت سنایا کرو"۔

"میرے سرتاج! ایک نہ ایک دن تم ضرور پچھتاؤ گے"۔ عارف رضا کی سعادت مند بیوی اپنے خاوند کی الٹی سیدھی اور بے تکی قسم کی باتیں سن کر کہتی۔ "اور اس وقت تمہیں میری باتیں ضرور یاد آئیں گی۔ یاد رکھو، وقت ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہتا۔ اگر آج اچھے دن ہیں تو کل کو بُرے دن بھی آسکتے ہیں۔ انسان کو اپنی زندگی میں میانہ روی اختیار کرنی چاہئے۔ ہمارے دین میں بھی فضول خرچی کی ممانعت ہے"۔

عارف رضا لاہور شہر کی ایک جدید قسم کی آبادی میں ایک عالی شان کوٹھی میں رہائش پذیر تھا۔ اس کا مختصر سا کنبہ تھا۔ بیوی جس کا نام سیما تھا۔ ان کی ایک لڑکی جس کی عمر تقریباً پانچ چھ سال ہوگی وہ ایک عرصے سے کالے یرقان کی مریضہ تھی اور دو لڑکے ایک کی عمر چار سال اور دوسرے کی عمر دو سال۔

عارف رضا کی ایک ادھیڑ عمر ماں تھی جو اوائل عمر میں ہی بیوہ بن بیٹھی تھی۔ اس کا خاوند اسے چھوڑ کر انگلینڈ چلا گیا تھا۔ اس کے بطن سے صرف ایک لڑکا عارف رضا تھا جو اپنی بیوہ ماں کے ساتھ رہتا۔ عارف کی معمر نانی ماں بھی ان کے ساتھ رہائش پذیر تھی۔ کچھ عرصہ آگے چل کر عارف کی ماں نے اپنے خاندان کے ایک شخص سے نکاح کرلیا۔ جس کو عارف رضا کے ماموں یعنی ماں کے سگے بھائی پسند نہ کرتے اور اپنا شریک سمجھتے تھے۔ وہ چال چلن کا بھی کچھ اچھا نہ تھا۔ عارف رضا اور اس کے ماموں کو یہ سخت ناگوار گزرا۔ عارف رضا کے دونوں ماموں عرصہ دراز سے بمعہ اہل و عیال امریکہ میں مقیم تھے۔ عارف کی ماں نکاح کے بعد اس کو چھوڑ کر اپنے خاوند کے گھر چلی گئی۔ پھر کچھ عرصہ بعد اس کی نانی ماں کا بھی انتقال ہو گیا۔

پھر وقت نے اپنی چال بدل لی اور اس چال کی زد میں عارف بھی آ گیا۔ اس کے حالات خراب ہونے لگے۔ آمدنی نہ ہونے کے برابر رہ گئی مگر اس کی شاہ خرچیاں جاری رہیں۔ اس طرح تو بادشاہوں کے خزانے بھی خالی ہو جاتے ہیں۔ یہی عارف کے ساتھ بھی ہوا۔ صبح و شام ماہ و سال گزرتے رہے دیکھتے ہی دیکھتے عارف رضا کی خوشحال زندگی نہایت ہی عسرت اور کسمپرسی میں بدل گئی اور اس کا زوال شروع ہو گیا۔ عارف کی مالی حالت دن بہ دن بدتر ہوتی چلی گئی۔ کوئی جمع پونجی تو اس کے پاس نہ تھی جو کچھ یا پھر جہاں کہیں سے بھی اسے روپیہ پیسہ آتا وہ بند ہو گیا۔ اسے بُرے دنوں کا وہم و گمان تک نہ تھا۔

کچھ عرصہ تک تو اچھا بُرا وقت گزرتا رہا پھر آگے چل کر اس نے اپنے گھر کا کچن چلانے کے لئے اپنی کار فروخت کر دی۔ کچھ وقت گزرا یہ پیسے بھی ختم ہو گئے۔ حالات نے اسے مزید مجبور کیا پھر اس نے آہستہ آہستہ گھر کا قیمتی سامان مثلاً فریج، اے سی فرنیچر تک بیچ دیا۔ وقت یوں ہی اچھا بُرا گزرتا رہا۔

عارف کو یہ امید بھی نہ تھی کہ اس پر بُرا وقت بھی آ سکتا ہے۔ وہ جو بھی اپنی بیوی کی باتوں پر غور کرتا تو پھر آنسو بہاتا کہ کاش وہ اس کی باتیں مان کر عمل کرتا تو پھر شاید اُسے یہ وقت دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ ویسے بھی گزرا ہوا وقت کبھی ہاتھ نہیں آتا اور انسان اپنے کئے پر شرمندہ اور نادم ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہی کچھ عارف کے ساتھ ہوا۔

یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات بڑی ہی رحیم و کریم ہے۔ وہ اپنے بندے کے لئے کوئی نہ کوئی سبب بنا ہی دیتی ہے۔ عارف رضا کا ایک بچپن کا دوست تھا جس کا نام زمان خان تھا۔ ایسے حالات میں دوست ہی دوست کے کام آتا ہے۔ بھائی بہن، رشتہ دار یہ سب رشتے ناطے کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جب زمان خان کو پتہ چلا کہ اس کے دوست کی مالی حالت خاصی کمزور ہو چکی ہے تو اسے پریشانی ہوئی لہٰذا اس نے اس کی مدد کے لئے ایک راہ نکالی۔ زمان خان کی بہن کا ایک پلاٹ تھا۔ زمان خان کا بہنوئی کویت میں ملازمت کرتا تھا۔ اس نے مکان تعمیر کروانا تھا لہٰذا اس نے زمان خان کو کہا تھا کہ کسی ٹھیکیدار کو تلاش کرو۔

اپنے بہنوئی اور بہن کا مکان تعمیر کرنے کے سلسلہ میں زمان خان نے سوچا کہ اس مکان کی تعمیر کا کام عارف رضا کے سپرد کرتے ہیں۔ اس طرح اس کی مالی مدد بھی ہو جائے گی۔ چنانچہ زمان خان نے عارف کو اپنے گھر بلایا اور اپنی بہن کے مکان کی تعمیر کا کام اس کے سپرد کر دیا اور ساتھ ہی اس کو پچاس ہزار کی رقم بھی ادا کر دی کہ وہ اس پیشگی رقم سے مکان کی تعمیر کا کام اس ہفتے کے اندر اندر شروع کر دے۔ ہاں اگر اسے اس سلسلے میں مزید رقم کی ضرورت پڑے تو وہ بھی فوراً ادا کر دی جائے گی۔ عارف رضا یہ سب کچھ جان کر بہت خوش ہوا اور اپنے دوست زمان خان کا شکر گزار بھی ہوا کہ اسے اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن نظر آئی ہے۔

دوسری طرف زمان خان کے دوستوں کو جب یہ پتہ چلا کہ اس نے اپنی ہمشیرہ کے مکان کی تعمیر کا کام عارف رضا کے سپرد کیا ہے تو وہ حیران رہ گئے اور چہ میگوئیاں کرنے لگے کہ زمان خان کا یہ فیصلہ کوئی دانشمندانہ فیصلہ نہیں، اللہ بہتر کرے۔ زمان خان عارف کے متعلق اس قسم کی باتیں سن کر قدرے پریشان ہو گیا کہ کہیں ان کی باتیں سچ نہ ہوں۔ وہ تو اپنے دوست کی ایک طرح کی مدد کرنا چاہتا تھا کہ کسی طرح اس کی مالی حالت سنور جائے اور وہ کسی کا محتاج نہ ہو بلکہ اپنے پاؤں پر پھر سے کھڑا ہو جانے کے قابل ہو جائے۔

زمان خان نے کسی کی پروا کئے بغیر عارف رضا کو

مکان کی تعمیر کا کام جاری رکھنے کو کہا۔ ہفتے کے اندر اندر مکان کی تعمیر عارف رضا نے شروع کرائی۔ دیکھتے ہی دیکھتے مکان کا ابتدائی کام عارف نے بڑی ذمہ داری اور لگن سے بروقت مکمل کرلیا۔ زمان خان بھی اس کے کام سے بہت خوش ہوا اور اس نے محسوس کیا کہ عارف کے متعلق اس کے دوست غلط بیانی کا مظاہرہ کرتے رہے ہیں۔

اب لوہے، سریے، سیمنٹ کی مزید ضرورت پڑی اور کچھ دیگر عمارتی سامان عارف اپنی ذمہ داری پر مارکیٹ سے خرید لایا کہ ادائیگی بعد میں کردی جائے گی جو تقریباً چالیس ہزار کے قریب تھی۔

زمان خان بھی وقت نکال کر دو چار دن بعد پلاٹ پر آتا جاتا اور ہلکی پھلکی نگرانی بھی کرتا۔ اس نے نیا خریدا ہوا سامان دیکھا، بہت خوش ہوا۔ تاہم بل عارف نے زمان کو دے دیا اور ادائیگی کے لئے کہا۔ زمان خان نے کہا۔ ٹھیک ہے دوسرے دن عارف رضا کو بل کی ادائیگی کردی گئی۔ بل ادا کرتے وقت زمان خان نے عارف سے سرسری طور سے کہا۔ یار سریا وزن میں کچھ کم لگتا ہے۔ یہ دو ٹن ہے یا ڈیڑھ ٹن، کیا تم نے اپنے سامنے وزن کروایا تھا؟

''نہیں دوست! ایسی کوئی بات نہیں''۔ عارف رضا پہلے تو قدرے گھبرایا پھر کہا۔ ''جس سٹور سے سریا لا ہوں ان کا تول پورا ہوتا ہے۔ مطمئن رہو کوئی فکر والی بات نہیں''۔ زمان خان نے بھی زیادہ بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور اپنے دوست کی بات پر یقین کرلیا۔

عارف رضا کے ہاتھ مزید نقد چالیس ہزار کی رقم آ گئی، وہ بہت خوش اور قدرے مطمئن تھا۔ اب وہ اپنی عادت کے مطابق کام پر پابندی سے نہ آتا اور گھومنے پھرنے چلا جاتا۔ زمان خان کو بھی خبر مل گئی کہ عارف اپنے کام پر اب کم توجہ دیتا ہے۔ جب زمان نے عارف رضا سے شکایت کی کہ وہ کام پر پابندی سے کیوں نہیں آتا تو عارف نے اپنی بچی کی بیماری کا بہانہ بنا کر کہا کہ وہ بچی کے ساتھ ہسپتال گیا تھا۔

''ایسی بات نہیں''۔ زمان نے کہا۔ ''تم جھوٹ بولتے ہو، یہ بہت بُری بات ہے میں نے تم پر اعتماد کر کے ہمشیرہ کے مکان کی تعمیر کا کام تمہارے سپرد کیا ہے کہیں تم مجھے شرمندہ نہ کروانا''۔

عارف یہ سن کر خاموش ہوگیا۔ حالات و واقعات کیسے بھی درپیش ہوں۔ انسان اپنی فطرت کے ہاتھوں مجبور ہے۔ وہ سب کچھ کر گزرتا ہے جو فطرت اسے کہتی ہے۔ آہستہ آہستہ عارف رضا نے کام پر آنا چھوڑ ہی دیا۔ اس بات کا علم زمان خان کو بھی ہوگیا۔ دوستی یاری کا معاملہ تھا وہ عارف کے ساتھ سخت رویہ بھی اختیار نہ سکتا تھا۔ زمان خان خاصا پریشان ہوگیا تاہم اس نے عافیت اسی میں سمجھی کہ جو ہوگیا سو ہوگیا۔ زمان خان نے دل ہی دل میں خیال کیا کہ عارف رضا کو ایسا ہرگز نہیں کرنا چاہئے تھا۔ وہ تو اس کی مدد کرنا چاہتا تھا لیکن نہ جانے عارف نے یہ سب کچھ کس مجبوری کے تحت کیا۔ اب یہ بھی خیال آتا کہ جب اس نے عارف کو مکان کی تعمیر کا کام سپرد کیا تھا تو اس کے دوستوں نے اسے ٹھیک ہی کہا تھا کہ زمان خان نے عارف پر اعتماد کر کے کوئی درست فیصلہ نہیں کیا۔ حالات کو سمجھتے ہوئے زمان خان اس نتیجے پر پہنچا کہ اب وہ خود مکان کی تعمیر کروائے گا۔ بصورت دیگر اگر اس کی ہمشیرہ کو یہ خبر ہوئی تو وہ ناراض ہوگی۔

ایک دن زمان خان مکان کی تعمیر کے سلسلے میں پلاٹ پر کام کاج میں مصروف تھا کہ ایک اجنبی شخص وہاں آیا اور زمان خان سے مخاطب ہوا کہ اس نے عارف رضا کو ملنا ہے۔ وہ مکان کی تعمیر کے سلسلہ میں اس کی دکان سے کچھ عمارتی سامان ادھار لایا تھا۔ زمان خان یہ سن کر پریشان ہوگیا اور اجنبی شخص سے جواباً کہا کہ وہ اب یہاں

نہیں آ رہا۔

''تو پھر اس صورت میں یہ بل کون ادا کرے گا؟'' اجنبی شخص نے زمان خان سے غصے کی حالت میں کہا۔

''کتنا بل ہے؟'' زمان خان نے پوچھا۔

''چالیس ہزار سات سو روپے کی رقم واجب الادا ہے''۔ اجنبی شخص نے زمان خان کے ہاتھ میں بل دیتے ہوئے کہا۔

''لیکن یہ رقم تو میں نے عارف رضا کو ادا کر دی ہے''۔ زمان خان نے حیرت زدہ ہوتے ہوئے اجنبی شخص سے کہا۔ ''کیا اس نے تمہیں نہیں دی؟''

''عارف رضا نے یہ بل کی رقم ہمیں بالکل ادا نہیں کی۔ اگر اس نے ادا کر دی ہوتی تو پھر میں یہاں کیوں آتا؟'' اجنبی شخص نے جواباً کہا۔

''تو بھائی میرے اس میں میرا کیا قصور ہے؟ جس شخص نے تمہاری دُکان سے سودا سلف خریدا ہے اس کو پکڑو ..... ویسے ایک بات تو بتاؤ''۔ زمان نے باتوں باتوں میں کہا۔ ''اس بل میں سریا دو ٹن لکھا ہے کیا واقعی سریا دو ٹن تھا۔ مجھے تو وزن میں کچھ کم لگتا ہے''۔

''نہیں صاحب! وزن میں سریا ڈیڑھ ٹن تھا''۔ اس آدمی نے کہا۔ ''لیکن عارف کے کہنے پر ہم نے بل دو ٹن کا بنا دیا۔ خرید و فروخت کے سلسلے میں ایسا ہوتا رہتا ہے۔ بل کا کم زیادہ کرنا بھی کاروبار کا حصہ ہوتا ہے''۔ اجنبی شخص نے اپنے حق میں صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر میرے کارندے عارف رضا نے بے ایمانی کا ارتکاب کیا ہے تو پھر آپ بھی اس جرم میں برابر کے حصہ دار ہیں''۔ زمان نے کہا۔

''لہٰذا بہتر یہی ہوگا کہ تم اسی وقت یہاں سے چلے جاؤ کیونکہ میں غلط قسم کے اور بے ایمان لوگوں سے بات چیت کرنا پسند نہیں کرتا۔ حرام کھانے والوں کی کبھی پوری نہیں پڑتی۔ جاؤ چلے جاؤ اور عارف رضا کو تلاش کرو اور

اسی سے اپنے پیسے وصول کرو"۔ زمان خان نے اپنی گفتگو ختم کرتے ہوئے کہا۔

اجنبی شخص جو بل کی وصولی کے لئے آیا تھا قدرے ڈرسا گیا کہ اس نے غلط بل کیوں بنایا۔

"صاحب! کم از کم اس کے گھر کا کوئی اتا پتہ بتا دیں"۔ اجنبی شخص نے عاجزانہ لہجے میں کہا۔

"مجھے کچھ معلوم نہیں کہ وہ کہاں رہتا ہے"۔ یہاں بھی زمان خان نے دوستی کا حق نبھایا کہ اگر وہ اس شخص کو اس کے گھر کا پتہ بتائے گا تو ہوسکتا ہے یہ شخص اس کے گھر جا کر کوئی لڑائی جھگڑا نہ کرے۔ ایسی صورت میں عارف رضا مزید مشکل میں پھنس جائے گا۔ وہ تو پہلے ہی زیرِ عتاب ہے اور مسئلے مسائل میں گھرا ہوا ہے۔ کافی دیر تک اجنبی شخص تکرار کرتا رہا لیکن زمان خان نے عارف کے گھر کا پتہ اسے نہ بتایا۔ آخر کار مایوسی کی حالت میں اجنبی شخص وہاں سے چلا گیا اور کہہ گیا کہ کبھی نہ کبھی تو عارف رضا سے آمنا سامنا ہوگا تو پھر اس صورت میں اس سے ڈبل پیسے وصول کروں گا۔

مکان کی تعمیر کا کام جاری رہا اور دو ڈھائی مہینوں میں مکان کی تعمیر مکمل ہوگئی۔ جو رقم زمان خان سے عارف رضا لے گیا تھا اس نے اپنی جیب سے ادا کر دیئے کیونکہ وہ اپنی ہمشیرہ کو یہ نہیں بتانا چاہتا تھا کہ یہ رقم اس کا دوست لے اڑا ہے۔

وقت گزرتا چلا گیا۔ اتفاق سے ایک دن زمان خان اپنے دفتر سے فارغ ہو کر گھر جا رہا تھا، جب وہ گلبرگ فوارہ نمبر ایک سے اپنی کار پر گزر رہا تھا کہ اس نے دیکھا کہ عارف رضا شکن آلود لباس میں ملبوس مردنی شکل بنائے لب سڑک بھیک مانگ رہا ہے اور ایک آدمی کار روک کر اپنی جیب سے ایک سو روپے کا نوٹ نکال کر اس کو دے رہا ہے۔ زمان خان نے جب یہ منظر دیکھا تو پریشان ہوگیا۔ اس کا دماغ چکرا سا گیا کہ یا اللہ یہ کیا ماجرہ ہے اور میں کیا دیکھ رہا ہوں کہ عارف بھیک مانگنے پہ مجبور ہوگیا ہے۔ زمان خان وہاں رکنا چاہتا تھا کہ وہ اپنے دوست سے پوچھے کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے اور کس مشکل سے دوچار ہے لیکن زمان خان کے ضمیر نے اسے ایسا نہ کرنے دیا کہ اس حالت میں اس کا دوست اسے دیکھ کر کہیں شرمندہ نہ ہو۔

زمان خان کو عارف کی یہ حالت دیکھ کر سخت دکھ ہوا کہ اس کے گھریلو حالات اتنے سخت خراب ہیں کہ اس کے گھر آٹا تک نہیں اور بھیک مانگ رہا ہے۔ تاہم زمان خان نے عارف کو اس حالت میں ملنا مناسب نہ سمجھا کہ اس وقت دیکھ کے وہ میرا سامنا کیسے کر سکے گا۔ لہٰذا زمان خان اسے ملے بغیر سیدھا گھر آیا اور دیر تک عارف رضا کے متعلق سوچتا رہا۔ پریشانی کی حالت میں پانچ ہزار کی رقم اپنی جیب میں ڈالی اور سیدھا عارف رضا کے گھر پہنچا۔ اس وقت تک عارف اپنے گھر پہنچ چکا تھا۔ اتنی غربت میں بھی وہ کوٹھی میں رہ رہا تھا۔ دراصل یہ کوٹھی اس کے ماموں کی تھی ورنہ وہ یہ کوٹھی بھی بیچ دیتا۔

زمان خان نے عارف کے گھر پہنچ کر دروازے پر دستک دی لیکن دروازہ نہ کھلا۔ تاہم دو چار منٹ بعد ڈرتے ڈرتے عارف رضا نے دروازہ کھولا۔ زمان خان کو اپنے سامنے دیکھ کر ہکا بکا سا ہو کر رہ گیا۔

"عارف! فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں"۔ زمان خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "گھبراؤ مت میں تمہارا دوست ہوں۔ تم کیا اندر بیٹھنے کے لئے نہیں کہو گے؟"

"کیوں نہیں، آؤ آؤ اندر بیٹھتے ہیں۔" عارف نے کہا۔ دونوں ایک ساتھ گھر میں داخل ہوئے اور بیٹھک میں جا بیٹھے۔

"میں، ابھی تمہارے لئے کولڈ ڈرنک لاتا ہوں"۔ عارف نے کہا۔

"نہیں..... نہیں دوست! رہنے دو"۔ زمان نے

کہا۔ "میں گھر سے پر باش ہو کر آیا ہوں۔ کسی قسم کا تکلف کرنے کی ضرورت نہیں"۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" عارف نے کہا۔

"اچھا، ٹھیک ہے"۔ زمان نے کہا۔ "اگر مناسب سمجھو تو ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس پلا دو"۔

عارف فوراً گھر سے پانی کا گلاس لینے چلا گیا۔ زمان خان نے بیٹھے بیٹھے۔ اس کے کمرے کا ایک نظر جائزہ لیا۔ صوفے، کرسیاں، میز وہاں کسی چیز کا نام ونشان تک نہیں تھا صرف اور صرف کمرے میں ایک پھٹی ہوئی چٹائی فرش پر پڑی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ سب کچھ بک چکا ہے۔ اس چٹائی پر عارف لیٹا ہوا تھا۔ عارف پانی کا گلاس لے آیا زمان خان نے پیا اور دوست کا شکریہ ادا کیا۔

"عارف! ذرا ایک آدھ گھنٹے کے لئے میرے ساتھ آؤ"۔ زمان نے کہا۔ "کینال پارک مارکیٹ تک جانا ہے۔ میری کار باہر کھڑی ہے۔ پھر واپس تمہیں گھر چھوڑ دوں گا"۔

عارف نے بیٹھے ہوئے دل سے کہا۔ "ٹھیک ہے میں چلتا ہوں"۔ دونوں کار میں سوار ہو کر پانچ سات منٹوں میں مارکیٹ پہنچ گئے۔ زمان خان نے پورے مہینے کا راشن خریدا اور بل ادا کیا پھر واپس عارف کے گھر پہنچے۔

"راشن اپنے گھر کے اندر لے جاؤ"۔ زمان نے کہا۔ "یہ تمہارے بیوی بچوں کے لئے ہے"۔

عارف یہ سن کر حیران ہو گیا۔ وہ ضرورت مند بھی تھا، راشن اٹھایا اور گھر کے اندر لے گیا۔ اس دوران اس کی بیوی بھی آ گئی۔ زمان خان کو اپنے گھر میں دیکھ کر حیران ہوئی۔ رسمی سلام دعا ہوئی۔ زمان نے دو ہزار نقد اس کی بیوی سیما کو دیا اور کہا کہ یہ رقم اس کی بچی کے علاج معالجے کے لئے ہے۔ پھر اپنے دوست عارف کو تاکید کی کہ وہ آئندہ سے ہر مہینے یکم تاریخ کو اس کے دفتر آ کر

ارشاد باری تعالیٰ

☆ رات کے وقت جب کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دے تو اللہ کی پناہ مانگا کرو کیونکہ وہ ایسی مخلوق دیکھتے ہیں جو ہم نہیں دیکھ سکتے اور جب رات کو ضروری کام نہ ہو باہر کم ہی نکلا کرو کیونکہ رات کے وقت اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سے جسے چاہے زمین پر پھیلا دیتا ہے۔ بسم اللہ پڑھ کر دروازے بند کیا کرو کیونکہ شیطان وہ دروازے نہیں کھول سکتا جنہیں بسم اللہ پڑھ کر بند کیا گیا ہو۔ پانی کے برتن، خاص طور پر پینے کے پانی کے برتن رات کو ڈھانپ کر رکھا کرو۔ اچھی اور پُرسکون نیند کے لئے درود پاک پڑھ کر سویا کرو۔ (ثنا گوندل)

پانچ ہزار کی رقم لے جایا کرے تاکہ اس کے بیوی بچوں کی گزر اوقات باعزت ہوتی رہے۔ اس نے عارف کو یہ بھی محسوس نہیں ہونے دیا تھا کہ اس نے اسے بھیک مانگتے دیکھا ہے۔ زمان خان کسی بھی حالت میں اپنے دوست کو بھیک مانگتے دیکھنا نہیں چاہتا تھا اور نہ ہی اسے یہ احساس ہونے دیا کہ وہ بھیک مانگتا ہے اور آج کل ایک بھکاری کا روپ دھارے ہوئے ہے۔ زمان خان نے وہاں سے اجازت لی، میاں بیوی نے شکریہ ادا کرتے ہوئے اسے رخصت کیا۔

دو تین مہینے اسی طرح گزر گئے کہ عارف زمان خان کے دفتر پر مہینے کی پہلی تاریخ کو چلا جاتا اور وہ اسے وعدے کے مطابق تقریباً تین ہزار کا راشن اور دو ہزار نقد ادا کر دیتا۔

ایک دن زمان خان اپنے دفتر سے گھر پہنچا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ زمان خان نے فون جلدی جلدی اٹھایا۔ دوسری طرف سے فون پر عارف رضا کی بیوی سیما نے

رونے کی آواز سنائی دی۔ روتے روتے کہا۔

"بھائی جان! آپ کے دوست کا انتقال ہوگیا ہے۔ میں بچوں سمیت بے آسرا ہوگئی میرا اب کون پُرسان حال ہوگا"۔

زمان خان نے جب عارف کے انتقال کی خبر سنی تو اسے سخت صدمہ پہنچا۔ ایک طرح کا وہ سکتے میں چلا گیا اس کے ہاتھ میں پکڑا نوالہ ہاتھ میں ہی رہ گیا۔ اس نے مزید وقت ضائع کئے بغیر اپنی بیوی کو عارف کے انتقال کی خبر سنائی۔ دونوں میاں بیوی فوراً عارف کے گھر پہنچ گئے۔ وہاں رونا دھونا مچا ہوا تھا۔ اردگرد کے ہمسائے اور رشتہ دار آچکے تھے۔

زمان خان نے سب سے پہلے اپنے مرحوم دوست عارف رضا کی تجہیز و تکفین کے انتظامات مکمل کئے اور مرحوم کی نماز جنازہ پڑھائی۔ اس کو قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ دوسرے دن رسم قل پر زمان خان نے اپنی بیوی کے ذریعہ عارف مرحوم کی بیوہ کو پیغام بھیجا کہ اس کا خاوند اب اس دنیا میں نہیں رہا لیکن اسے کسی قسم کا فکر کرنے کی ضرورت نہیں پہلے اپنی عدت پوری کرو، تمہارے بچوں کے لئے راشن خرچہ وغیرہ گھر پر تمہیں ہر ماہ پابندی سے ملتا رہے گا۔ اس کے علاوہ بھی تمہیں کسی قسم کا کوئی مسئلہ درپیش ہو تو مطلع کرنا۔ ان شاء اللہ تمہاری ہر ممکن مدد کی جائے گی۔ اپنے آپ کو بے سہارا مت سمجھنا۔

اسی طرح کچھ وقت گزرا سیما جو اب بیوہ تھی اس کی عدت کا وقت ختم ہوا۔ اب زمان خان اپنی بیوی کے ساتھ سیما کے گھر ہفتہ میں ایک آدھ مرتبہ جاتا اور اس کی اور اس کے بچوں کی خیر و عافیت پوچھتا۔

زمان خان کو بڑا تجسس تھا اور وہ یہ جاننا چاہتا تھا عارف رضا کی زندگی جو بڑی خوشحال تھی دیکھتے ہی دیکھتے کیسے معاشی بدحالی کا شکار ہوئی۔ نہ تو وہ جوا کھیلتا، نہ شراب پیتا اور نہ ہی بظاہر اس میں دیگر کسی قسم کی برائی نظر آتی تھی آخر وہ کون سی وجہ یا پھر کیا محرکات تھے جو عارف بھیک مانگنے پر مجبور ہوا اور یہ سب کچھ عارف کی بیوہ سیما سے بہتر کوئی نہیں جانتا تھا۔ چنانچہ ایک دن باتوں باتوں میں اس نے عارف کی بیوہ سے پوچھ ہی لیا کہ وہ آج اسے وجہ بتائے کہ اچانک ان کے گھریلو حالات کیوں بگڑے حالانکہ کچھ عرصہ پہلے وہ ایک آرام دہ اور خوشحال زندگی بسر کر رہے تھے۔

"اس کی وجہ صرف ایک ہے"۔ سیما نے کہا۔ "اور وہ یہ ہے کہ ہم لوگ یہاں جس کوٹھی میں رہائش پذیر ہیں یہ دراصل میرے مرحوم شوہر عارف کے ماموں کی ملکیت ہے۔ وہ لوگ ایک عرصہ سے امریکہ میں مقیم ہیں، پاکستان سے روانگی پر وہ لوگ یہ کوٹھی اپنی بہن کے سپرد کر گئے جو عارف کی ماں تھی۔ اس کے بطن سے صرف ایک لڑکا تھا عارف اور ایک مرحوم عارف کی نانی۔ وہ لوگ اپنی کوٹھی کرائے پر دینے کے حق میں نہ تھے۔ ازراہ ہمدردی انہوں نے اپنی بیوہ بہن کو وہاں رہنے کی اجازت دی اور ساتھ ہر ماہ وہ مبلغ پچاس ہزار روپے کی رقم بھی اپنی بیوہ بہن اور نانی ماں کو بھیجتے تھے۔ آپ اس کو مدد یا خیرات کہہ لیں۔ عارف کی ماں ساری کی ساری رقم اپنے اکلوتے اور لاڈلے بیٹے عارف کو دے دیتی۔ عارف دل کھول کر ساری کی ساری رقم مہینے کے آخر تک اڑا دیتا۔ جیسے مثال ہے "مال مفت دل بے رحم" ٹھیکیداری بھی اس نے ایک قسم کی چھوڑ رکھی تھی اور نہ ہی وہ اس کام میں کوئی زیادہ دلچسپی لیتا تھا۔ اس طرح وقت گزرتا رہا اور ہم لوگ ایک خوشحال زندگی گزار رہے تھے۔ پھر کچھ آگے چل کر عارف کی ماں نے اپنی برادری میں ایک آدمی سے دوسرا نکاح پڑھوا لیا۔ جس کا اس کے بھائیوں نے جو امریکہ میں مقیم تھے، بہت سخت بُرا منایا اور اپنی بیوہ بہن سے ناطہ توڑ دیا۔ دوسرا عارف کی ماں بھی عارف کو چھوڑ کر اپنے خاوند کے گھر جا کر رہنے لگی۔ اب عارف کے پاس نانی ماں رہ گئی تھی جو اکثر بیمار رہتی یا

پھر عارف کے بچے تھے۔ عارف کے ماموں پھر بھی پچاس ہزار کی رقم عارف کو بھیجتے رہے کیونکہ عارف کی نانی امریکہ میں جو دو ماموں تھے ان کی ماں تھی۔ پھر تھوڑا آگے چل کر نانی ماں کا بھی انتقال ہو گیا اور ساتھ ہی امریکہ سے پیسے آنا بھی بند ہو گئے۔ عارف کے ماموں اب یہ سوچنے لگے کہ ان کی ماں بھی انتقال کر گئی اور ان کی بہن نے بھی دوسرا نکاح کر لیا اور اپنے گھر چلی گئی عارف سے اب رشتہ بس نام کا ہے۔ دوسرے وہ لوگ عارف کے خیالات اور حرکات سے بھی کچھ زیادہ مطمئن نہ تھے لہٰذا انھوں نے ماہوار خرچہ بند کر دیا۔ کوئی جمع پونجی وہ رکھتا نہ تھا میرا مرحوم خاوند بس یہی سمجھتا رہا کہ اس طرح پابندی سے پیسے آتے رہیں گے اور اس طرح وقت گزرتا رہے گا۔

بس یہی ایک وجہ ہماری معاشی بدحالی کا سبب بنی۔ میرے مرحوم شوہر کے انتقال کے بعد ان کے جو ماموں ہیں انھیں یہ گمان گزرا کہ کہیں میں بھی کسی سے دوسری شادی نہ کر لوں تو پھر اس صورت میں وہ لوگ کوٹھی پر قابض ہو جائیں پھر ان سے کوٹھی خالی کروانا مشکل ہو جائے گا۔ اب ایک ماموں ہم سے کوٹھی خالی کروانے آ رہا ہے"۔

چنانچہ اگلے ماہ ہی عارف کا ایک ماموں پاکستان آیا اور سیما سے کہا کہ وہ ایک ماہ کے اندر اندر یہ کوٹھی خالی کر دے اور اپنی رہائش کا بندوبست کسی اور جگہ کر لے۔ انھیں ہر حالت میں کوٹھی خالی چاہئے۔

یہ صورت حال عارف کی بیوہ کے لئے پریشان کن تھی۔ عارف مرحوم کے ماموں اب سارے رشتے ناطے بھول گئے تھے اور ٹھیک ایک ماہ گزرنے کے بعد عارف کی بیوہ کے گھر کا سامان باہر گلی میں پھینک دیا۔ اور کہا کہ ہمارا تمہارا کوئی رشتہ نہیں جس کے ساتھ رشتہ تھا وہ مر گیا۔ جہاں تجھے پناہ ملے چلی جاؤ۔

جب اس صورت حال کا علم زمان خان کو ہوا تو اس کو مرحوم دوست عارف یاد آیا۔ فوراً عارف کی بیوہ کے

پاس پہنچا اور عارف کی بیوہ اور اس کے بچوں کو حوصلہ دیا کہ فکر نہ کریں ایک در بند ہوتا ہے تو سو در اوپر والا کھول دیتا ہے۔ زمان خان کا اس کے گھر کے قریب ایک سرونٹ کوارٹر تھا جو اس نے اپنے یار دوستوں اور مہمانوں کے لئے خالی رکھا ہوا تھا فوراً عارف کی بیوہ کا سارا سامان اس میں رکھ کر بمعہ اس کے بچوں کو اپنے کوارٹر میں لے آیا اور بیوہ سے کہا کہ اب آپ لوگ بے فکر ہو کر اس جگہ قیام کریں۔ اب تمہیں کسی قسم کا کرایہ ادا کرنے کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی اور حسب توفیق تمہیں بچوں کی پرورش کے لئے ماہوار خرچہ بھی ملتا رہے گا۔ تمہیں یہاں ہر قسم کا تحفظ ملے گا۔

"سیما! یقین کرو میں تمہارے ساتھ ضرور نکاح کر لیتا"۔ ایک دن زمان خان نے کہا۔ "لیکن میری کچھ مجبوری ہے کہ میں ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ میری اولاد جوان ہے۔ بے شک تم ایک بلند کردار باوفا اور کفایت شعار عورت ہو، میرے ہوتے ہوئے تمہیں کسی قسم کا فکر کرنے کی ضرورت نہیں"۔

عارف کی بیوہ کو یہ سب کچھ جان کر قدرے حوصلہ ملا۔ اس دوران عارف مرحوم کی بیٹی جو کالے یرقان کی مریضہ تھی اس کا بھی انتقال ہو گیا۔ عارف کی بیوہ کے لئے یہ غم بھی کچھ کم نہ تھا۔ تاہم اس نے اللہ کی رضا سمجھ کر برداشت کیا۔ زمان خان نے عارف کی بیوہ کو گھر میں مصروف رکھنے کے لئے بازار سے ایک نئی سلائی مشین خرید کر لا دی اور کہا کہ وہ گلی محلے میں لوگوں کے کپڑوں کی سلائی وغیرہ کیا کرے اس طرح اس کا وقت بھی مصروفیت میں گزرے گا۔ دوسرے آمدن بھی کچھ ذریعہ ہو گی۔

اس کے دونوں بچوں کو بھی زمان خان نے محلے کے ایک دوست جو پرائمری کا سکول ماسٹر تھا، اس کے پاس ٹیوشن رکھوا دی تا کہ بچے گلی محلے میں آوارہ نہ پھرتے رہیں۔ بچوں کی ٹیوشن فیس زمان خود اپنی جیب سے ادا کرتا رہا۔ سکول ماسٹر ایک ادھیڑ عمر شخص تھا، اس کی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ اس کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ صرف ایک لڑکی تھی جس کی عمر پانچ سال تھی اور وہ ماسٹر جی کے والدین کے پاس رہتی تھی۔ زمان خان نے یہاں بھی دوستی کا حق نبھایا۔ اپنے دوست سکول ماسٹر کو عارف کی بیوہ سیما کے ساتھ نکاح کرنے کے لئے رضامند کر لیا۔ ماسٹر جی سے نکاح کر لینے کے بعد سیما ماسٹر زبیر کے نام سے منسوب ہو گئی۔ سیما اپنے لئے بلکہ اپنے بچوں کے لئے جینا چاہتی تھی۔

ماسٹر زبیر نے بھی نہایت پیار محبت اور شفقت سے سیما کو اپنے گھر میں رکھا۔ سیما وقتی طور پر اپنے پچھلے سارے غم بھول گئی اسے اب ایک پیار کرنے والا شوہر مل گیا جو اس کی اور اس کے بچوں کی ہر ضرورت پوری کرتا۔ بچے بھی بہت خوش تھے۔ ماسٹر زبیر ان کی تعلیم و تربیت پر پوری پوری توجہ دیتا۔

اس طرح شب و روز گزرتے رہے پھر تھوڑا آگے چل کر سیما کے بطن سے ایک لڑکا تولد ہوا۔ ماسٹر زبیر کی خوشیاں مزید بڑھتی چلی گئیں۔ اب اس کے گھر اداسی کی جگہ خوشیاں اور بہاریں ہی بہاریں تھیں۔ سیما نے اپنے خاوند کی جو پہلی بیوی کے بطن سے لڑکی تھی اس کو بھی اپنے پاس بلا لیا۔ زمان خان بھی گاہے بگاہے ان کی خبر رکھتا اور گھر میں ان کو ایک خوش و خرم زندگی گزارتے ہوئے دیکھ کر بہت خوش ہوتا۔ سیما زمان خان کی بہت ممنون تھی کہ اس نے ہر موڑ پر اس کی مدد کی بلکہ اس کا ماسٹر زبیر سے نکاح کروا کر اسے ہمیشہ کے لئے تحفظ فراہم کیا۔ وہ زمان خان کو کہتی کہ جو نیکی اس نے کی ہے اس کی جزا وہ تو نہیں اللہ تعالیٰ اسے ضرور دے گا۔ جواب میں زمان خان کہتا اس نے کسی پر کوئی احسان نہیں کیا، اس نے فقط دوستی نبھائی ہے۔

§ § §

اپنی جوانی کیوں برباد کرتے ہو میں تمہیں ایک ایسا طریقہ بتاتا ہوں
کہ جس سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی بچ جائے۔

جب بیٹی ماں کی بہو بنی

☆ .... محمد نذیر ملک

کہتے ہیں ساس اگر ماں بھی ہو تب بھی بیٹی کے حق میں اچھی نہیں ہوتی اور بہو اگر بیٹی بھی ہو تو ماں کو ساس ہی سمجھتی ہے۔

یہ ضرب المثل اس وقت حقیقت کا روپ دھار گئی جب ایک سگی بیٹی اپنی ماں کی بہو بن گئی۔

نام تو اس کا ارشاد بی بی تھا لیکن سب اُسے شاداں کہتے تھے۔ شاداں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہونے کے ناطے بڑے ناز و نعم کے ساتھ پلی تھی۔ وہ بچپن سے ہی نہایت خوبصورت تھی۔ اوپر سے جب اس نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو غضب ڈھانے لگی۔ گاؤں کے نوجوان شاداں کے حسن کے گن گاتے اور اس سے عشق و محبت کے من گھڑت قصے سننے سنانے لگے۔ ہر کوئی اس کا سچا عاشق ہونے کا دعویدار تھا اس کی خوبصورتی کی وجہ سے اکثر اسے ہیر کہتے۔

شاداں کسی کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی تھی۔ نظر التفات تو دور کی بات تھی۔

ایک روز شاداں کے ان نام نہاد عاشقوں پر یہ خبر بجلی بن کر گری کہ شاداں کی اپنے ماموں زاد سے منگنی ہو گئی ہے۔ سبھی کو اس بات سے بڑا قلق ہوا اور حیرانی بھی کہ مخمل کو کوناٹ کا پیوند کیسے لگ گیا۔ کیونکہ شاداں کا منگیتر کسی طور بھی شاداں کے قابل نہ تھا۔ وہ پستہ قد، نحیف و نزار اور نہایت سادہ سا لڑکا تھا جبکہ ان نام نہاد متوقع امیدواروں میں سے ہر کوئی اپنے آپ کو رانجھا ہی گردانتا تھا۔ ان میں سے ہر کوئی اسے اپنی حق تلفی جاننے لگا لیکن چونکہ یہ شاداں کے ماں باپ کا فیصلہ تھا لہٰذا کوئی کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ان میں سے کسی کو اس بات کا علم نہ ہو سکا کہ آیا اس فیصلہ میں شاداں کی اپنی مرضی بھی شامل ہے یا نہیں۔ وہ ایسا وقت تھا جب والدین کی اکثریت شادی کے بارے میں اپنی بیٹیوں کی مرضی معلوم کرنے کی روادار نہ تھی۔ اس ڈر سے کہ بیٹی اگر خدانخواستہ "نہ" کر گئی

تو یہ ان کے لئے ڈوب مرنے کا مقام ہوتا اور لوگ طرح طرح کی باتیں بناتے کہ دیکھو فلاں کی بیٹی بول پڑی ہے۔ بیٹی کا یہ بول پڑنا شرم اور بے عزتی خیال کیا جاتا۔ ادھر بیٹیاں بھی اپنے ماں باپ کی عزت کا اپنی پسند ناپسند سے بڑھ کر خیال کرتی تھیں کہ ایسا نہ ہو کہ کہیں ان کی عزت پر حرف آئے۔ ایک روز شاداں بھی ایسے ہی روتی رلاتی ڈولی میں بیٹھ گئی اور اپنے دولہا کے گھر میں جا اتری۔

شاداں کی شادی ہو گئی۔ شاداں سے عاشقی کا دعویٰ کرنے والوں نے صبر کا گھونٹ پی تو لیا لیکن ساتھ ہی وہ اس ٹوہ میں لگ گئے کہ کیا وہ اپنے خاوند کو پسند کرتی ہے یا نہیں اور کیا یہ شادی اس کی مرضی سے ہوئی ہے۔ انہوں نے دیواروں کے ساتھ کان لگانے شروع کر دیئے۔ ادھر شاداں کے خاوند کو پریشان کرنا شروع کر دیا۔ راہ چلتے میں اس پر طرح طرح کے آوازے کستے لیکن شاداں کا خاوند نہایت دھیمے مزاج کا صابر شاکر انسان تھا وہ ان کی چھیڑ چھاڑ کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ وہ فاتح تھا اور جانتا تھا کہ کھسیانی بلی ضرور کھمبا نوچے گی۔ بہرحال بات زیادہ دیر چھپی نہ رہی۔ کہتے ہیں دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں اور وہاں تو لوگوں کے گھروں کی چھتیں بھی آپس میں مشترکہ اور نیچی ہوتی تھیں۔ گھر کے اندر کہی جانے والی باتیں سفر کرتے کرتے دور تک پہنچ جاتی تھیں۔ بات وہی نکلی کہ شاداں نے کبھی بھی اپنے خاوند کو پسند نہیں کیا تھا اور نہ ہی شادی کے بعد اسے قبول کیا ہے۔

معلوم یہ ہوا کہ شاداں کے مراسم خفیہ طور پر ایک نوجوان کے ساتھ تھے جس کا نام شفاعت تھا۔ وہ ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے اور دونوں آپس میں پڑوسی تھے۔ وہ چوری چھپے ملتے بھی تھے۔ ان کی محبت پاک صاف تھی۔ شفاعت کے کہنے پر اس کے گھر والے شاداں کے گھر رشتہ مانگنے آئے تو شاداں کے والدین نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ ان کے اپنے عزیزوں میں لڑکا موجود ہے اور یہ کہ بچوں کی نسبت بچپن سے ہی طے ہو چکی ہے۔ ان کا جواب سن کر شفاعت کے گھر والے مایوس لوٹ آئے لیکن عشق کی جو آگ دونوں نے اپنے دلوں میں جلائی تھی اسے شاداں کی شادی کا بندھن بھی نہ بجھا سکا۔ کہتے ہیں نفرت اگر دل میں ہو تو اس کا اظہار کبھی نہ کبھی ہو ہی جاتا ہے۔

آخر اسی دوران ایک روز شاداں نے اپنے خاوند سے طلاق کا مطالبہ کر دیا۔ شوہر شاداں کے منہ سے نکلی یہ بات سن کر ہکا بکا رہ گیا اور وہ اپنا منہ کھول کر شاداں کا منہ دیکھنے لگا کہ وہ کیا کہہ رہی تھی۔ وہ تو کسی طور بھی شاداں کو طلاق دینے اور اُسے کھونے پر آمادہ نہ تھا۔ بات لوگوں تک پہنچی تو کہرام مچ گیا لیکن شاداں اب چپ کا روزہ توڑ چکی تھی وہ سر عام کہنے لگی کہ اس کا اپنے خاوند کے ساتھ گزارہ نہیں ہو سکتا اور یہ کہ وہ اسے طلاق دے دے۔ شاداں کا باپ یہ رسوائی اور جگ ہنسائی سہہ نہ سکا اور ایک روز سوتے میں ہی اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔

آخر عشق کی آگ جوالہ بن کر پھٹنے لگی اور شاداں نے کسی بھی طور سے اپنے خاوند سے چھٹکارہ حاصل کرنے کی ٹھان لی اور اپنے عاشق کو راز دار بنا لیا۔ پھر ایک روز لوگوں نے سنا کہ شاداں کے شوہر کو رات کو سوتے میں سانپ نے ڈس لیا ہے اور صبح وہ اور سانپ دونوں بستر پر مرے ہوئے پائے گئے۔

امر واقع یہ تھا کہ شاداں کے گاؤں کے قریب ایک میدان میں جھگی نشین آباد تھے جن میں ایک سنیاسی بابا بھی تھا۔ شفاعت اس سے جا کر ملا اور اس سے زہر طلب کیا۔ سنیاسی بابا سمجھ گیا کہ جوان کے ارادے خطرناک ہیں سنیاسی نے کہا کہ زہر تو وہ دے سکتا ہے لیکن اکثر یہی ہوتا ہے کہ زہر دینے والے خود بھی بچ نہیں پاتے اور پکڑے جاتے ہیں۔ اپنی جوانی کیوں برباد کرتے ہو میں تمہیں

ایک ایسا طریقہ بتاتا ہوں کہ جس سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی بچ جائے۔ تم مجھ سے زہر کی بجائے زہریلا سانپ لے لو اور اپنے شکار کو سانپ سے ڈسوا دو۔

شفاعت حیران ہو کر سنیاسی بابا کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ کہا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ سانپ کا ڈسا بچ بھی تو جاتا ہے اور تمہارے جیسے سنیاسی بھی سانپ کے ڈسے کو بچا لیتے ہیں۔ سنیاسی نے کہا کہ میرے پاس ایک ایسا سانپ ہے۔ جس کے ڈسے کو میں بھی نہیں بچا سکتا اور پھر مارگزیدہ مجھ تک پہنچے گا تو میں اس کا علاج کروں گا ناں میرے اس سانپ کا ڈسا تو پانی نہیں مانگتا۔ لیکن اس کے پیسے بہت لگیں گے۔

پیسوں کی فکر نہ کرو تم ڈسوانے کا طریقہ بتاؤ۔

سنیاسی نے کہا کہ وہ سانپ کو اس ڈولی میں ڈال کر ڈولی کے منہ پر کپڑا رکھ کر اسے رسی سے باندھ دے گا۔ تم رات جا کر جس کسی کو بھی ڈسوانا ہے رات کو جب وہ شخص سو جائے تو احتیاط سے ڈولی کے کپڑے کی رسی کھول کر سانپ اس کے پہلو کے ساتھ کے بستر پر ڈال دینا۔ سانپ زہر کے نشے میں نرم نرم بستر پر پڑا رہے گا جونہی اس شخص نے ذرا سی بھی حرکت کی تو سانپ اس کو ڈس لے گا۔ اس بات کا خیال رہے کہ مطلوبہ شخص کے جوتے بھی اس جانب پڑے ہوں جس جانب سانپ ہو تا کہ وہ شخص بستر پر سے اُس طرف سے اترے جہاں سانپ پڑا ہوگا اور اترتے وقت لامحالہ وہ سانپ کے اوپر سے ہو کر اٹھے گا لہٰذا سانپ اسے فوراً ڈس لے گا۔ بہرحال یہ ترکیب کامیاب رہی اس کے بعد سنیاسی بابا کے کہنے کے مطابق سانپ، کو بستر پر ہی مار دیا گیا اور وہ پڑا رہا۔ صبح لوگوں نے دیکھا کہ شاداں کا شوہر مرا پڑا ہے اس کا جسم نیلا پڑ گیا اور منہ سے جھاگ ابل رہا تھا۔ پاس ہی سانپ مرا پڑا تھا۔ مکانوں کی چھتیں کچی تھیں یہی باور کیا گیا کہ سانپ چھت سے بستر پر گرا ہے اور اس نے شاداں کے

شوہر کو ڈس لیا ہے۔

یہ سب باتیں بعد میں معلوم ہوئی تھیں۔

چنانچہ شاداں طلاق لینے سے پہلے ہی بیوہ ہو گئی۔
اب شاداں اور اس کے محبوب کے راستے کی رکاوٹ ختم ہو گئی۔ عدت گزرنے کے بعد شاداں شفاعت کی بیوی بن گئی۔ ادھر شفاعت کی ماں کو مرے 6 ماہ گزر چکے تھے اور اس کا باپ رنڈوا تھا چند مہینوں میں اس نے شاداں کی ماں کے ساتھ نکاح کر لیا۔ یوں دونوں ماں بیٹی کا رشتہ ساس اور بہو کے رشتہ میں بدل گیا۔ شاداں کا نیا خاوند دل و جان سے اس پر فدا تھا۔ ادھر شاداں بھی اس کی بے پناہ محبت میں گرفتار تھی۔

ادھر جب ان ماں بیٹی کا رشتہ ساس اور بہو میں تبدیل ہوا تو ماں ماں نہ رہی اور بیٹی بیٹی نہ رہی۔ وہ روایتی ساس بہو بن گئیں۔ اس وقت جوائنٹ فیملی سسٹم تھا۔ ایک ہی جگہ کھانا پکتا اور سب اکٹھے بیٹھ کر کھایا کرتے۔ ان باپ بیٹوں کا زمیندارہ تھا۔ باپ بیٹے دونوں ہل چلاتے اور مویشی پالتے۔ کبھی کھانا لے کر کھیتوں میں ماں جاتی کبھی بیٹی۔ وہ اپنے اپنے خاوندوں کی بظاہر خدمت گار تھیں۔ وہ گھر بار کا کام بخوبی انجام دے رہی تھیں کہ اچانک ایک واقع ہو گیا۔

شفاعت کے باپ نے دیگر مویشیوں کے علاوہ ایک بہت ہی خوبصورت بیل پال رکھا تھا اس وقت اکثر زمیندار لوگوں نے اس طرح کا ایک آدھ بیل شوقیہ طور پر پال رکھا ہوتا تھا۔ بیل شفاعت کے باپ سے بے حد مانوس تھا۔ دونوں کے درمیان دوستی ہی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے بغیر رہ نہیں سکتے تھے۔ کیا ہوا کہ ایک دن دونوں باپ بیٹا علی الصبح ہل چلانے کے لئے نکلے تو اس بیل کو بھی ساتھ لے گئے۔ بیل صبح دن چڑھتے ہی رسی توڑ کر گھر آ گیا۔ شاداں کی ماں نے بیل کو جو اس حالت میں دیکھا کہ اس کے ناک اور گلے میں ڈالی ہوئی آدھی رسی ٹوٹی ہوئی بیل کے ساتھ لٹک رہی ہے اور بیل مالک کو چھوڑ کر گھر آ گیا ہے تو یہ منظر دیکھ کر شاداں کی ماں نے فوراً کہا کہ آج اس کا خاوند مارا گیا ہے۔ ورنہ بیل کبھی یوں اکیلا گھر واپس نہ آتا۔

فی الواقع یہ بات اس وقت سچ ثابت ہو گئی جب لوگوں نے کھیتوں میں جا کر دیکھا تو شفاعت کا باپ وہاں مرا پڑا تھا اور شفاعت وہاں موجود نہ تھا۔ پتہ چلا کہ وہ ایک پہاڑی چڑھ کر اس کی دوسری جانب سے اتر کر گدھالہ (جگہ کا نام) چلا گیا ہے۔ اسے پیغام بھیجا گیا کہ اس کا باپ مر گیا ہے۔ متوفی کو اٹھایا گیا۔ عینی شاہدین کا کہنا تھا کہ متوفی کے سر پر گہرے زخم دیکھے گئے تھے۔ بیٹا بھی راستے بھر میں روتا پیٹتا گھر آ گیا۔ سب نے مل کر متوفی کو اندروتھے (اندر والے کمرے) میں لے جا کر غسل دیا اور جلدی جلدی میں اسے دفنا بھی دیا گیا۔ کسی نے پولیس کو خبر کر دی کہ متوفی کو قتل کیا گیا ہے۔ تھانیدار آ گیا اور ساتھ اپنا عملہ بھی لایا۔ متوفی کی قبر کشائی کی گئی۔ لاش پوسٹ مارٹم کے لئے بھجوائی گئی۔ اگلے روز رپورٹ آئی تو متوفی کی موت سر پر لاٹھی یا کسی وزنی چیز کی شدید ضربوں کی وجہ سے واقع ہوئی ہے۔ لہٰذا پولیس نے اپنے طریقے سے قتل کے اس کیس کی تفتیش شروع کر دی۔
تفتیش کی ابتدا مقتول کے بیٹے شفاعت سے کی گئی کہ جب باپ بیٹا دونوں اکٹھے کھیتوں کو گئے تھے پھر کیا ہوا؟ بیٹے نے کہا کہ وہ راستہ سے ہی باپ سے الگ ہو گیا اور لکڑیاں لانے کے لئے گدھالہ چلا گیا تھا۔ وہیں پر اسے اطلاع ملی کہ اس کا باپ فوت ہو گیا ہے۔ موقع کا عینی شاہد کوئی نہیں تھا ماسوائے بے زبان بیل کے۔

بیل نے گواہی دے دی

تھانیدار کوئی سیانا شخص تھا اس نے کہا کہ اسے وہ بیل دکھایا جائے جو رسی توڑ کر کھیتوں میں سے گھر آ گیا

تھا۔ چنانچہ تھانیدار کو اپنے استھان پر بندھے بیل کے پاس لے جایا گیا۔ جب تک بیل کے گلے سے ٹوٹی ہوئی رسی نکال کر دوسری رسی ڈال دی گئی تھی۔ تھانیدار بیل کے گرد گھوم گیا۔ جب اس کی نظر بیل کے سینگوں پر پڑی تو اس نے دیکھا کہ ایک سینگ کی نوک پر ہلکا سا خون لگا ہے۔ بیل نے کسی کو زخمی کیا یا یہ خون مقتول کے جسم کا ہے۔ تھانیدار گہری سوچ میں پڑ گیا۔

اسی دوران شفاعت کو جو تھانیدار کے قریب بیٹھا ہوا تھا کسی نے آواز دی وہ اٹھا اور لنگڑاتا ہوا چلنے لگا۔ اچانک تھانیدار کی نظر شفاعت پر پڑی تو اسے جھٹکا سا لگا۔ وہ شفاعت کو لنگڑا کر جاتے آتے تھوڑی دیر دیکھتا رہا۔ تھانیدار نے اس سے پوچھا کہ تم لنگڑا کر کیوں چل رہے ہو تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ شفاعت کا رنگ بدلا۔ فوراً سنبھل کر بولا کہ اسے جب باپ کے مرنے کی خبر ملی تو وہ گھر کی طرف دوڑ پڑا تھا۔ راستے میں اچانک ایک بڑے پتھر سے ٹکرا کر گر پڑا وہیں سے کولہے پر چوٹ آئی ہے۔ تھانیدار نے اسے کہا کہ وہ اُسے چوٹ یا زخم دکھائے۔ اس نے پس و پیش کی لیکن سرکار کا حکم تھا اسے چادر ہٹا کر زخم دکھانا پڑا۔ وہ عجیب طرح کا زخم تھا۔ تھانیدار نے اب تک کئی چوٹیں اور زخم دیکھے تھے کئی پھٹی لاشیں بھی دیکھیں تھیں لیکن اس جیسا زخم نہیں دیکھا تھا۔ زخم ایسی جگہ تھا کہ اس کی چادر پر بھی خون لگا ہوا تھا۔

تھانیدار شفاعت کو تھانے لے گیا۔ زیادہ تفصیل تو سامنے نہ آئی کہ کس طرح شفاعت نے راتوں رات اقبال جرم کر لیا کہ باپ کو اس نے قتل کیا ہے اور یہ کہ بیوی کے کہنے پر کیا ہے۔ البتہ اس نے بتایا کہ اس نے کھیتوں میں لے جا کر باپ کو قتل کیا۔ ہم علی الصبح باپ بیٹا ڈبہ (بیل) اور ہل والے دیگر بیل لے کر کھیتوں میں پہنچے۔ ڈبہ کو باپ نے ایک چھوٹی سی بیری کے ساتھ باندھا اور ہل جوتنے کی تیاری کرنے لگا۔ میں نے اچانک لاٹھی سے باپ پر حملہ کر دیا۔ باپ کے منہ سے اتنے الفاظ نکلے کہ بیٹے یہ کیا کرنے لگے ہو۔ پھر دوسرے تیسرے وار پر وہ خاموش ہو گیا۔ وہ گر گیا اور مرنے لگا۔ میں اسے مرتا دیکھ ہی رہا تھا کہ دیکھا تو بیل رسی توڑ کر ہماری طرف بھاگا آ رہا ہے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ مجھے ہی نشانہ بنائے گا۔ اس نے نزدیک آ کر مجھ پر حملہ کر دیا۔ مجھے اس

جگمگاتی باتیں

ہم اسلام میں داخل ہوتے ہیں تو سمجھو امن مل گیا اور جب اسلام ہمارے اندر داخل ہو جاتا ہے تو ہم جنت میں داخل ہو جاتے ہیں۔

☆ حسد کرنے والے کے لئے یہی سزا کافی ہے کہ جب تم خوش ہوتے ہو تو وہ اداس ہو جاتا ہے۔ (حضرت علیؓ)

☆ آپ کی زندگی میں آپ کا خیال رکھنے والی شخصیت ایسے ہی ہے جیسے دل کی دھڑکن۔ جو نظر نہیں آتی لیکن خاموشی سے آپ کی زندگی کو تحفظ دیتی ہے۔ (ثنا گوندل)

☆ ہمیشہ چھوٹی چھوٹی غلطیوں سے بچنے کی کوشش کرو کیونکہ انسان پہاڑوں سے نہیں، پتھروں سے ٹھوکر کھاتا ہے۔ (نسیم سکینہ صدف)

☆ تعلیم سے زیادہ ہمارا رویہ اہم ہوتا ہے کیونکہ بعض اوقات ہماری تعلیم ناکام ہو جاتی ہے اور رویے ہی معاملات سدھارتے ہیں۔

☆ محبت زندگی بدل دیتی ہے جناب! اگر مل جائے تب بھی اور نہ ملے تب بھی۔ (حکیم محمود۔ساہیوال)

☆ اللہ کے خوف سے گرنے والا آنسو بے شک چھوٹا کیوں نہ ہو، اس میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ وہ سمندر کے برابر گناہ دھو دیتا ہے۔ (نبیلہ نازش۔اوکاڑہ)

زور سے کولہے پر ٹکر ماری کہ میں دور جا گرا۔ اس کا نوکیلا سینگ میرے کولہے میں اتر گیا تھا اور مجھے زخمی کر گیا۔ بیل پھر میری طرف دوڑا۔ میں اپنی پوری قوت مجتمع کر کے اٹھ کھڑا ہوا اگر میں نہ اٹھتا تو بیل مجھے مار ڈالتا۔ میں دوڑا پڑا۔ میں مرنا نہیں چاہتا تھا، میں نے باپ کو مرتے دیکھا تھا۔ وہ بہت اذیت ناک موت مرا تھا۔ میں دوڑنے کے قابل نہیں تھا لیکن موت کے ڈر سے دوڑ پڑا۔ بیل بھی میرے پیچھے بھاگا لیکن تھوڑی دور بھاگنے کے بعد رک گیا اور واپس میرے مرے ہوئے باپ کی طرف چلا گیا اور اسے جا کر چاٹنے لگا۔ میں بھاگ آیا اور گدحالہ چلا گیا۔ وہاں پر گھر سے بھیجے ہوئے شخص نے مجھے کہا کہ تمہارا باپ مر گیا ہے۔ میں روتا پیٹتا گھر کو دوڑا دیکھا کہ لوگ باپ کی میت گھر لے آئے تھے۔

اس کا سارا سر زخمی تھا۔ اس پر خون جما ہوا تھا اور رس بھی رہا تھا۔ لوگ چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ میں نے کہا جلدی کرو اسے دفن کر دیں۔ میت کو اندر وطے (اندر والے کمرے) میں لے جا کر غسل دیا اور جلدی جلدی میں میت دفنا دی۔

جب قاتل سے پوچھا گیا کہ اس نے باپ کا قتل کیوں کیا؟ تو اس نے بتایا کہ اس نے یہ قتل اپنی بیوی شاداں کے کہنے پر کیا ہے جس کی کہانی کچھ یوں تھی کہ جب ماں بیٹی ساس بہو بن کر اس گھر میں آئیں تو ان کے مابین روایتی رقابت کا جذبہ جاگ اٹھا۔ برتن سے برتن ٹکرانے لگے۔ وہی آٹا گوندھتے ہلتی کیوں ہو والی بات۔ منہ ماری شروع ہو گئی۔ ایک روز باتوں باتوں میں بیٹی نے ماں کو طعنہ دیا کہ تم تو وہ ہو جو میرا باپ کھا گئی تھی۔ میرے باپ کو تم نے مارا تھا، وہ اپنی موت نہیں مرا تھا اور وہ بھی اپنے اس یار کے پیچھے جو اب تمہارا خاوند ہے لیکن تم دیکھنا میں تمہارا یہ مان بھی توڑ کر رکھ دوں گی۔ میرا نام بھی شاداں ہے۔ اسی روز سے شاداں نے شفاعت کو اپنے باپ کے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا کہ اس کا باپ اس پر بری نظر رکھتا ہے اور اشاروں کنایوں سے اسے ورغلاتا ہے انہیں یہ بات سچ ثابت کرانے کے لئے اس نے ایک دو بار شفاعت کے سامنے اس کے باپ سے جھگڑا مول لیا۔ اس پر تہمت لگائی اور اسے برا بھلا کہا۔ نتیجتاً ماں بیٹی کی منہ ماری ہوئی۔ ماں نے لامحالہ اپنے خاوند کی طرف داری کی اور بیٹی کو برا بھلا کہا۔ ادھر شاداں برابر باپ کے خلاف شفاعت کے کان بھرتی رہی اور اسے بھڑکاتی رہی۔

یہ کہ اس کے باپ کی نظر اس کے بارے میں صاف نہیں اور وہ بہت تنگ ہے اس گھر میں۔ یہاں تک کہ شاداں نے باپ بیٹے کو آپس میں ٹکرا دیا۔ بیٹے نے باپ پر کھلم کھلا بدکاری کا الزام لگا دیا۔ باپ بھی طیش میں آ گیا اس نے کہا کہ تو نے بدچلن عورت گھر میں رکھی ہوئی ہے جو خود خراب ہے اور مجھ پر جھوٹا الزام لگاتی ہے۔ اس عورت سے شادی سے پہلے تمہارے ساتھ تعلقات تھے۔ باپ بیٹے کی تو تکار بڑھ کر ہاتھا پائی میں بدل گئی۔ عورتوں کے شور مچانے پر محلہ دار اکٹھے ہو گئے جنہوں نے باپ بیٹے کو چھڑا لیا۔ ادھر شفاعت جوان تھا اور باپ ادھیڑ عمر کا بوڑھا۔ شفاعت نے فیصلہ کر لیا کہ وہ باپ کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔

آخر موقع ملنے پر شفاعت نے اسے کھیتوں میں لے جا کر لاٹھی کی ضربوں سے مار ڈالا۔ شفاعت کو عمر قید ہو گئی۔ یہ قید بحال رہی اور اسے کاٹنی پڑی۔ پیچھے کچھ عرصہ کے بعد شاداں کی ماں مر گئی اور شفاعت کے گھر آنے تک شاداں کی قابل رشک جوانی بھی بڑھاپے میں تبدیل ہو گئی۔ کچھ عرصہ ہوا شفاعت بھی اس دنیا فانی سے کوچ کر گیا۔ شاداں ابھی بقید حیات ہے۔ جوانی میں ہیر کہلانے والی شاداں کا حسن بڑھاپے میں بھی ماند نہیں پڑا ہے۔

❁❁❁

اسرائیلی خفیہ ایجنسی موساد کی اندرونی کہانی

انتقام

"میں حماس کے شیطانی بچوں کو نیست و نابود کر دوں گا" نیتن یاہو نے گرج کر کہا۔ "یہ انتقامی کارروائی ایسے کی جائے کہ اخبارات یہ نہ کہیں کہ اسرائیل نے بدلہ چکایا ہے..... یہ انصاف اور کئے کی سزا نظر آنا چاہیے"۔

قسط: 6 ☆ ---------- 00447424014120 ---------- میاں محمد ابراہیم طاہر
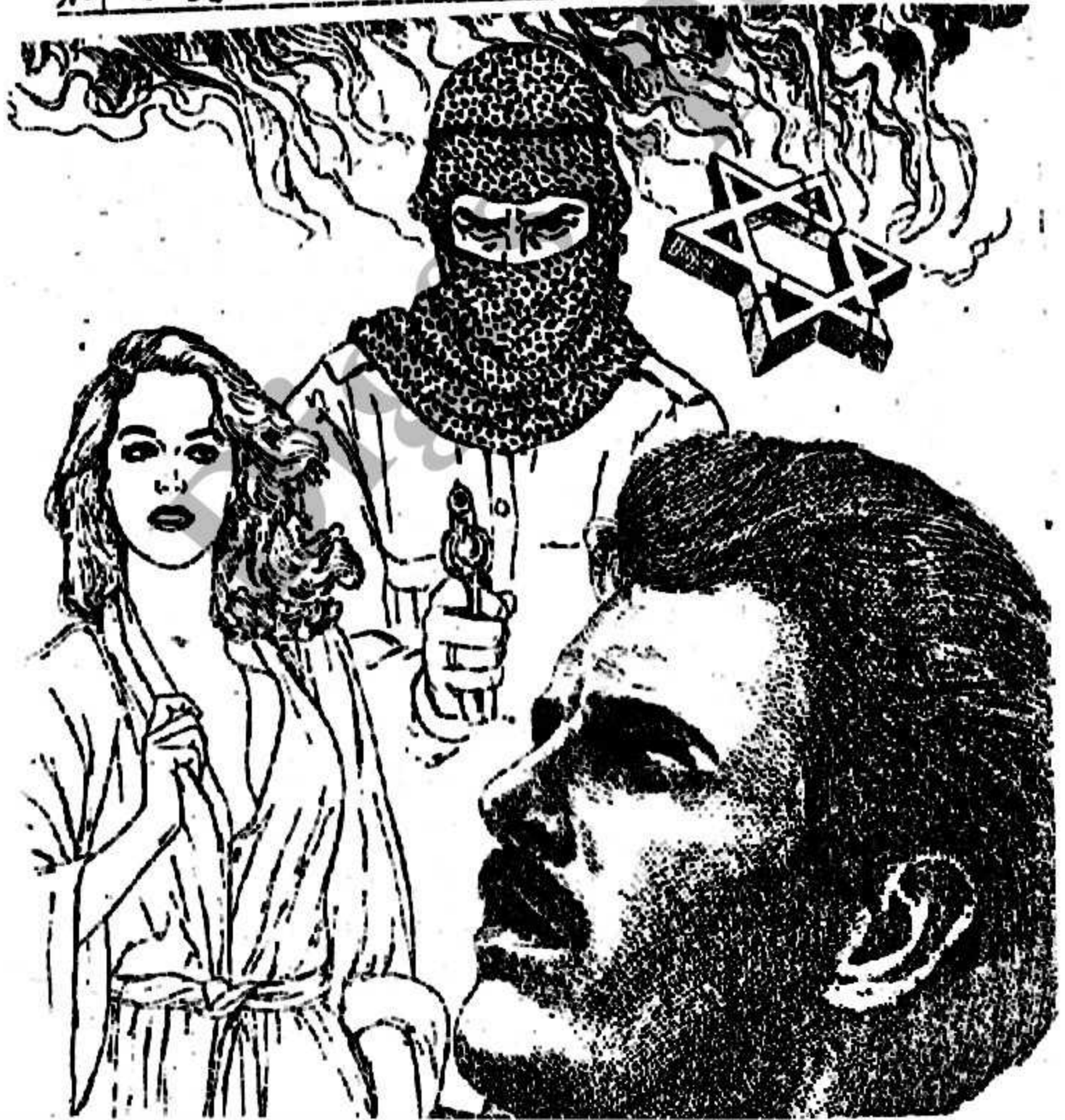
"ابو جہاد" کا قتل

اکتوبر 1995ء کے وسط کی بات ہے، موساد انٹرنل سیکورٹی کا ایک ٹیکنیشن دستی سکینر کے ذریعے تل ابیب کے نواح میں پنسکر سٹریٹ (Pinsker St.) پر واقع ایک اپارٹمنٹ کا جائزہ لے رہا تھا جہاں وہ اندر کی گفتگو اور بات چیت سننے کے لئے "بگنگ ڈیوائس" لگانا چاہتا تھا۔ یہ اپارٹمنٹ ان بے شمار عمارتوں میں سے ایک تھا جو موساد نے شہر بھر میں اپنی خفیہ سرگرمیوں کے لئے بطور محفوظ ٹھکانے، حاصل کر رکھی تھیں۔ بگنگ ڈیوائس لگانے کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ وہاں کچھ ہی دیر بعد موساد کے بڑوں کی انتہائی اہم میٹنگ ہونے والی تھی۔

اپارٹمنٹ میں موجود فرنیچر معمولی قسم کا تھا۔ کچھ معمولی قسم کی اسرائیلی سیاحوں کی تصویریں سستے قسم کے فریموں میں لگی دیواروں پر لٹک رہی تھیں۔ ہر کمرے میں الگ ٹیلیفون موجود تھا جس کا کسی ڈائریکٹری میں اندراج نہ تھا۔ باورچی خانے میں گھریلو استعمال کے برتنوں کی جگہ کمپیوٹر موڈیم، کاغذات کترنے والی مشین، فیکس مشین اور چولہے کی جگہ پر ایک سیف نصب تھی۔

ایسے اپارٹمنٹ یا محفوظ ٹھکانے موساد کے زیر تربیت جاسوسوں کی رہائش، ٹریننگ عملی تربیت، دوسروں کا شہر میں پیچھا کرنے، اپنے آپ کو دوسروں کی نظروں سے چھپانے، ہلاکت خیز لیٹر بکس تیار کرنے، نظر نہ آنے والی سیاسی رپورٹ لکھنے اور اشاروں کنائیوں میں ایک دوسرے کو اطلاعات پہنچانے کی تربیت دی جاتی تھی اور زیر تربیت جاسوس چوبیس گھنٹے اپنے اساتذہ کی نظروں میں رہتے تھے۔ عام لوگوں سے دوستی اور پیار محبت کے تعلقات پیدا کرنے اور انہیں اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنے کے گُر سکھائے جاتے تھے۔ انہیں ذہن نشین کرایا جاتا تھا کہ "وہ کام جو موساد اور اسرائیل کے مفاد میں ہو غلط یا صحیح کر گزرو"۔

1991ء میں موساد کے ایک جونیئر افسر وکٹر اوسٹرو وسکی کے انکشاف کے مطابق دنیا بھر میں موساد کے تربیت یافتہ جاسوسوں کی تعداد 35000 ہزار تھی۔ ان میں سے عربوں کو بلیک ایجنٹ اور باقیوں کو وائٹ ایجنٹ کہا جاتا تھا۔ ان میں سے 20 ہزار ہمہ وقت اپنی خفیہ کارروائیوں میں مصروف رہتے تھے اور 15 ہزار ایسے تھے جو اشارے کے منتظر رہتے تھے، انہیں سلیپر کہا جاتا تھا۔

اسی روز بعد دوپہر متذکرہ اپارٹمنٹ یا محفوظ ٹھکانے پر اسرائیلی انٹیلی جنس ایجنسیوں کے سینئر حکام کا اجلاس ہوا جس میں "ایک شخص" کے قتل کی منظوری دی گئی اور اس کا طریق کار طے کیا گیا۔ وزیراعظم یزہاک رابن (Yitzhak Rabin) کی طرف سے پہلے ہی اس شخص کے قتل کا منصوبہ منظور کیا جا چکا تھا۔

تین سال قبل، جب سے رابن وزیراعظم بنا تھا، وہ فلسطینی دہشت گردوں کے ہاتھوں اسرائیلی فوجیوں، جاسوسوں اور شہریوں کے جنازوں کو کندھا دیتے دیتے تھک چکا تھا۔ اس قتل کی نگرانی اُس نے اپنے ذمہ لے لی تھی جبکہ وہ 1988ء میں وزیر دفاع تھا۔

یاسر عرفات کا نائب خلیل الوزیر جو عرب دنیا اور اسرائیلی انٹیلی جنس موساد کے حلقوں میں ابوجہاد کے نام سے مشہور تھا۔ اسرائیلی جاسوسوں، مخبروں، فوجیوں اور شہریوں کو نشانہ بنانے میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ تل ابیب کی پنسکر سٹریٹ کے اسی اپارٹمنٹ میں ابوجہاد کی ہلاکت کا فیصلہ ہوا تھا۔ ابوجہاد کا معنی تھا "مقدس جنگ کی آواز"۔

خلیل الوزیر معروف بہ ابوجہاد 1988ء میں تیونس (Tunisia) میں رہتا تھا۔ اُس کا رہائشی بنگلہ تیونس کے نواح میں سدی بوسعید کے علاقے میں تھا۔ دو مہینے تک

موساد کے خفیہ ایجنٹ اور جاسوس ابوجہاد کی نگرانی کرتے رہے۔ جن راستوں سے وہ گھر سے نکلتا تھا، جن سڑکوں سے گزرتا تھا، اس کے بنگلے کے اردگرد لگے شیشے کی مضبوطی، اونچائی، دروازوں، کھڑکیوں، تالوں کی قسم، حفاظتی حصار، محافظوں کی تعداد، اس کی گھر میں آمدورفت کے اوقات، غرضیکہ موساد کے خفیہ ایجنٹوں نے ہر چیز نہایت احتیاط، باریک بینی سے بار بار چیک کی۔ انہوں نے ابوجہاد کی بیوی کو اپنے گھر میں اپنے بچے کے ساتھ کھیلتے ہوئے بھی دیکھا اور جب وہ شاپنگ کے لئے بازار گئی اور بال کٹوانے ہیئر ڈریسر کی دکان میں داخل ہوئی تو انتہائی قریب سے اس کا جائزہ لیا۔ انہوں نے اس کے خاوند کی ٹیلیفون کالیں بھی سنیں اور اس کی خواب گاہ میں خفیہ بات چیت سننے کے آلات (بگنگ ڈیوائسز) بھی لگا دیں اور میاں بیوی کے ہم بستر ہونے کی آوازیں بھی ریکارڈ کیں۔ جاسوسوں نے ابوجہاد کے گھر کے کمروں کا فاصلہ بھی نوٹ کر لیا اور ان کے ہمسایوں کی سرگرمیوں پر نظر رکھی اور ان تمام گاڑیوں کی رجسٹریشن نمبر، میک اور ماڈل بھی نوٹ کئے جو اس کے گھر میں آیا جایا کرتی تھیں۔

اپنے کام سے مطمئن ہو کر موساد کے ایجنٹوں کی ٹیم واپس تل ابیب چلی گئی۔ اگلا مہینہ انہوں نے اس ہلاکت خیز مشن کی عملی تکمیل کے لئے حیفہ کے نواح میں ابوجہاد جیسے بنگلے میں بار بار پریکٹس کی۔ قاتل ٹیم کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی گئی کہ ابوجہاد کے بنگلے میں داخلے کے بعد 22 سیکنڈ کے اندر اسے قتل کر کے ٹیم کو بنگلے سے نکل آنا ہے۔

16 اپریل 1988ء کو مشن کی تکمیل کا حکم صادر کر دیا گیا۔

اس رات اسرائیلی ائرفورس کے بوئنگ 707، کئی جہازوں نے تل ابیب کی جنوبی ائربیس سے اڑان بھری۔ ایک جہاز میں وزیر دفاع یزہاک رابن اور دوسرے اعلیٰ ملٹری افسر تھے۔ ان کا جہاز مسلسل محفوظ ریڈیو کے ذریعے قاتل ٹیم سے رابطے میں تھا جو موقع واردات پر پہنچ چکی تھی۔ اس قاتل ٹیم کے نگران کو "تلوار" کا کوڈ نام دیا گیا تھا۔ دوسرے جہاز میں جیمنگ اور نگرانی کے آلات لگے ہوئے تھے۔ دوسرے دو بوئنگ 707 فیول ٹینکر کے طور پر اڑ رہے تھے۔ ابوجہاد کے بنگلے کے اوپر، انتہائی بلندی پر اب یہ جہاز چکر لگا رہے تھے اور اپنے محفوظ ریڈیو کے ذریعے زمین پر ہونے والی ہر حرکت کی نگرانی کر رہے تھے اور ابوجہاد کے بنگلے میں پہلے سے نصب کئے گئے آلات سماعت کے ذریعے بنگلے کی ہر آواز انہیں صاف اور واضح سنائی دے رہی تھی۔ 17 اپریل کو، آدھی رات کے کچھ ہی دیر بعد انہوں نے اپنے آلات کے ذریعے سنا کہ ابوجہاد اپنی مرسڈیز کار کے ذریعے بنگلے میں آیا ہے۔ یہ مرسڈیز کار اسے یاسر عرفات نے شادی کے تحفے کے طور پر دی تھی۔ اب قاتل ٹیم بھی بنگلے کے اندر ہونے والی ہر حرکت اور آواز کو سن رہی تھی۔ ٹیم کے لیڈر تلوار نے اپنے لبوں کے ساتھ لگے مائیکروفون میں سرگوشی کی کہ وہ ابوجہاد کو سیڑھیاں چڑھتے ہوئے سن رہا ہے۔ اپنی بیوی سے کھسر پھسر کرتے ہوئے ساتھ والے کمرے میں اپنے سوئے ہوئے بیٹے کا بوسہ لے رہا ہے۔ اپنی خواب گاہ کی طرف جا رہا ہے۔ آخر میں وہ اپنے مطالعے کے کمرے میں، جو نچلی منزل پر تھا چلا گیا ہے۔ یہ تمام لمحہ بہ لمحہ تفصیل الیکٹرانک آلات سے مزین جہاز کے ذریعے رابن کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ صبح 12:17 بجے رابن نے حکم دیا۔ "گو"

بنگلے کے صحن میں ابوجہاد کا ڈرائیور مرسڈیز کے اندر ہی سو رہا تھا۔ تلوار کی ٹیم کے ایک رکن نے اپنے سائلنسر لگے بریٹا پستول کی ایک گولی اس کے کان کے اندر فائر کر کے فرنٹ سیٹ پر موت کی نیند سلا دیا۔ تلوار

اور قاتل ٹیم کے ایک دوسرے ممبر نے رہائش گاہ کا لوہے کا بھاری گیٹ ایک ایسے پلاسٹک دھماکہ خیز مواد سے اڑا دیا جو آواز بالکل پیدا نہیں کرتا۔ گیٹ کے اندر ابو جہاد کے دو محافظ گیٹ کے اچانک گرنے سے ششدر کھڑے تھے کہ سلنسر لگے پستول کی دو گولیاں دونوں کے دماغ سے آر پار ہو گئیں۔ مطالعے کے کمرے کی طرف بھاگتے ہوئے تلوار نے دیکھا کہ ابو جہاد تحریک آزادیٔ فلسطین کی ایک ویڈیو دیکھ رہا ہے۔ دشمن کو سامنے دیکھ کر جیسے ہی اس نے اٹھنے کی سعی کی تلوار نے اپنے خاموش پستول کی دو گولیاں اُس کے سینے میں اتار دیں اور جیسے ہی وہ فرش پر گرا تلوار نے دو مزید گولیاں اُس کے دماغ کے آر پار کر دیں۔ تلوار جیسے ہی کمرے سے باہر نکلا ابو جہاد کی بیوی اپنا بچہ گود میں اٹھائے سامنے آ گئی۔ تلوار نے اُسے عربی زبان میں حکم دیا۔ "واپس اپنے کمرے میں چلی جاؤ"۔

پھر قاتل ٹیم رات کی تاریکی میں غائب ہو گئی۔ بنگلے میں داخل ہونے سے لے کر اپنا مشن مکمل کر کے باہر نکلنے تک انہیں صرف 13 سیکنڈ لگے۔ اُس سے تو سیکنڈ کم جس کا انہوں نے اپنی پریکٹس اور ٹریننگ کے دوران اندازہ لگایا تھا۔

اس قتل کے بعد پہلی دفعہ اسرائیل میں ردعمل سامنے آیا۔ کابینہ کے وزیر ایزر وائزمین (Ezer Weizman) نے کہا۔ "اس طرح کے انفرادی قتلوں سے امن بحال نہیں ہوسکتا"۔

لیکن موساد کی طرف سے قتل و غارت گری کا عمل پھر بھی جاری رہا۔

دو ماہ بعد ساؤتھ افریقہ کی پولیس بھی زبان کھولنے پر مجبور ہو گئی جسے اسرائیل نے خاموشی اختیار کرنے کے لئے دباؤ ڈالا تھا کہ جوہانسبرگ کے ایک معروف تاجر الان کدگر (Allan Kidger) کو جو ایران اور عراق کو انتہائی جدید ترین تکنیکی ساز و سامان سپلائی کر رہا تھا جس کی مدد سے بائیو کیمیکل ہتھیار بنائے جا سکتے تھے۔ موساد کی طرف سے کدگر کو اس طرح قتل کیا گیا تھا کہ اُس کے دونوں بازو اور ٹانگیں دھڑ سے الگ کر دی گئی تھیں۔

جوہانسبرگ پولیس کے چیف تحقیقاتی افسر کرنل چارلس لینڈ مین نے بتایا کہ اس قتل کا صاف مقصد اسرائیل کی طرف سے موساد کے ذریعے ایک پیغام دینا تھا کہ اسرائیل دشمنوں کی خفیہ مدد کرنے والے "مساد" کی پہنچ سے دور نہیں ہیں۔

ابو جہاد کی ہلاکت سے چھ ہفتے قبل موساد نے ایک اور متنازعہ قتل میں حصہ لیا تھا جبکہ جبل الطارق میں آئرش ری پبلک آرمی (IRA) کے تین غیر مسلح ممبران کو برطانیہ کی اسپیشل ائر سروسز کی وردیوں میں ملبوس افراد نے اتوار کی سہ پہر کو گولی مار کر قتل کر دیا تھا۔ برطانوی انٹیلی جنس کے ممبران کو ایسے قتلوں کی تربیت گزشتہ سالوں میں تل ابیب میں دی گئی تھی اور انہیں دکھایا گیا تھا کہ موساد کے خفیہ ایجنٹ بیروت شہر کی گلیوں اور لبنان کی بقاع ویلی میں کس مہارت اور چابک دستی سے عرب دہشت گردوں کا شکار کرتے ہیں۔

آئی آر اے کے ان تین ممبران کے قتل سے چار ماہ پہلے موساد کے ایجنٹوں نے ان تینوں مائی ریڈ فاریل زبان ساویج اور ڈینیل میک کان کی نگرانی شروع کر دی تھی کیونکہ موساد کو شبہ تھا کہ وہ آئی آر اے (IRA) کے لئے عربوں سے اسلحہ خرید کر بلفاسٹ پہنچا رہے ہیں۔

موساد اور برطانوی انٹیلی جنس ایجنسیوں کے درمیان تعاون اور رابطوں کا آغاز اُس وقت تھیچر کی وزارت عظمیٰ کے دور میں ہوا تھا جب انتہائی خفیہ طور پر موساد کے سربراہ رافی ایتان کو بلفاسٹ بلایا گیا تھا تاکہ وہ سکیورٹی اداروں کو آئی آر اے اور حزب اللہ کے درمیان بڑھتے ہوئے رابطوں اور تعاون بارے ثبوت اور معلومات مہیا کر سکیں۔ ایتان کے اپنے الفاظ میں:

''میں جب آئرلینڈ پہنچا تو بارش برس رہی تھی۔ وہاں ہر روز ہی بارش ہوتی رہتی تھی۔ میں نے برطانویوں کو وہ سب کچھ بتا دیا جو ہمارے علم میں تھا۔ پھر میں نے صوبے کا دورہ کیا اور ریپبلک کی سرحد تک چلا گیا۔ میں محتاط تھا کہ کہیں سرحد پار نہ کر جاؤں۔ اگر ریپبلک والے مجھے پکڑ لیتے آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ اُن کا کیا ردعمل ہوتا''۔

''واپسی سے قبل میں نے سپیشل آرمی سروس (SAS) سے کہا کہ وہ اسرائیل آئیں تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں کہ ہم دہشت گردوں سے کس طریقے سے نمٹتے ہیں۔''

چنانچہ انہی ابتدائی دنوں سے ایس اے ایس اور موساد کے درمیان قریبی تعاون کے تعلقات پیدا ہو گئے۔ موساد کے سینئر افسر ایس اے ایس کے ہیرفورڈ میں واقع ہیڈ کوارٹر کے دورے کر کے موساد کی طرف سے مڈل ایسٹ میں کئے جانے والے آپریشنوں بارے سپیشل فورسز کو آگاہ کیا کرتے تھے کم از کم ایک دفعہ موساد اور ایس اے ایس نے باہمی اشتراک سے آئی آر اے کے سینئر رہنماؤں کی بلفاسٹ سے بیروت تک نگرانی کی اور حزب اللہ کے رہنماؤں سے ملاقات کرتے ہوئے ان کی تصویریں بھی اتاریں۔

اکتوبر 1987ء میں بیروت میں موساد کے ایجنٹوں نے ایک بحری کشتی ایکسونڈ (Eksund) کا سراغ لگایا جو میڈی ٹیرین سمندر میں محو سفر تھی۔ اس کشتی پر 120 ٹن ہتھیار لدے ہوئے تھے جس میں زمین سے فضا میں مار کرنے والے میزائل، راکٹ پروپیلڈ گرینیڈ لانچرز، مشین گنیں، دھماکہ خیز مواد اور ڈیٹونیٹر وغیرہ شامل تھے اور یہ تمام اسلحہ آئی آر اے کے آدمیوں نے بیروت میں اپنے رابطوں کے ذریعے خرید کیا تھا۔ اس بحری کشتی کو فرانسیسی حکام نے پکڑ لیا۔ اسی طرح کی اسلحے کی اور بھی بہت سی کھیپیں موساد نے مخبری کر کے بلفاسٹ کو جاتے ہوئے رستے میں پکڑوادیں۔

اکتوبر 1995ء کے جس اجلاس کا ذکر اس باب کے شروع میں کیا ہے اس میں ایک اور عرب مجاہد اور مذہبی رہنما اسلامک جہاد کے قائد فتحی شکا کی (Fathi Shakaki) کے قتل کا فیصلہ کیا جانا تھا۔ موساد نے یہ بات ثابت کر دی تھی کہ اسی سال جنوری میں بیت لد (Beit Lid) کے مقام پر دو خودکش حملہ آوروں کے ذریعے اسرائیلی بس پر حملے کی منصوبہ بندی اس کی تنظیم نے کی تھی جس میں 20 سے زائد مسافر ہلاک اور بہت سے زخمی ہوئے تھے اور بس بالکل تباہ ہو گئی تھی۔

دہشت گردی کے اس حملے نے چوتھائی صدی کے دوران ایسے حملوں کی تعداد دس ہزار سے اوپر پہنچا دی تھی۔ اس میں چار صد اسرائیلی مارے گئے اور ہزار سے زائد اپاہج بن گئے تھے۔

اس بے رحم دنیا میں شکا کی (Shkaki) کو اس کے لوگ ''شیر'' بنا کر پیش کرتے تھے۔ یعنی انتہائی نڈر، بہادر اور جی دار۔ اس نے خودکش بمبار لڑکوں کو، قرآن کی خودکشی بارے پابندی کے خلاف، مغفرت کی دعا دیتے ہوئے دہشت گردی کی اجازت دی تھی۔ اس نے جواز یہ پیش کیا تھا کہ مظلوموں کے حق کے لئے جان قربان کرنا جائز ہے۔

اس طرح مذہب کی غلط تعبیر سے، مذہبی جوش و جذبے کے تحت دو نوجوان دوسروں کے ساتھ اپنے انجام کو پہنچ گئے۔

بعدازاں شکا کی نے نہ صرف جہادی اخبارات میں ان کے تعزیت نامے چھپوائے بلکہ نماز جمعہ کے بعد دعائیں بھی، ان کی قربانی کی تعریف کی اور ان کے والدین کو یقین دلایا کہ ان کے بچے سیدھے جنت میں گئے ہیں۔

چنانچہ جس علاقے اور گلی محلوں میں شکا کی کا اثر و رسوخ تھا وہاں کے والدین بڑے فخر کے ساتھ اپنے نوعمر بچے جہاد کے لئے اُسے پیش کرنے لگے۔ اب تک جو قربان ہو چکے تھے ان کے حق میں ہر اذان کے بعد لاؤڈ اسپیکر پر دعائیں کی جاتی تھیں اور جنوبی لبنان کے معتدل موسموں والے علاقوں میں مسجدوں میں شہدا کو یاد کیا جاتا تھا۔

شکا کی نے اپنے نئے مجاہد تیار کر لئے۔ ان کا ہدف مقرر کر لیا گیا اور شکا کی نے انہیں بم سازوں کے سپرد کر دیا۔ یہ وہ ماہرین تھے جو اپنے ہدف کی تصویر دیکھ کر یہ فیصلہ کرتے تھے کہ اس کی تباہی کے لئے کتنا دھماکہ خیز بارود چاہئے۔ وہ اپنے تجربے اور جبلت کے تحت کام کرتے تھے۔ کام کے دوران ان کی زبان پر ہمیشہ الحمدللہ، استغفراللہ، انشاء اللہ، ماشاء اللہ جیسے کلمات جاری رہتے تھے کیونکہ وہ شکا کی کے معتقد تھے۔ وہ انہیں بتاتا تھا کہ ”ہم اسی لئے زندہ ہیں کہ ہم اپنے دشمن اسرائیل کا مقابلہ کر رہے ہیں“۔

اکتوبر کی اس سہ پہر کو جب کہ تل ابیب کے ایک حفاظتی مرکز میں اُس کی قسمت کا فیصلہ ہو رہا تھا۔ شکا کی اپنی بیوی فاطمہ کے ساتھ، اپنے گھر دمشق (شام) میں موجود تھا۔ مہاجر کیمپ کے عام گندے ماحول کی نسبت اس کا اپارٹمنٹ بڑا صاف ستھرا اور خوبصورت تھا اور اس کی عزت اور احترام تھا۔ اس کے گھر میں قیمتی قالین اور دیواری سجاوٹیں ایران کے آیت اللہ سے ملے ہوئے تحائف تھے۔ سونے کے فریم میں لگی ہوئی شکا کی اور معمر قذافی کی تصویر لیبیا کے رہنما کا تحفہ تھا۔ چاندی کا بنا ہوا ایک کافی سیٹ شام کے صدر کا عنایت کردہ انعام تھا۔ اس کے کپڑے اس سادہ سے گون سے بہت اعلیٰ قیمتی تھے جو وہ اپنے جنوبی لبنان کے غریب عوام کے درمیان نماز کے خطبات کے دوران پہنا کرتا تھا۔ گھر کے اندر اُس کا لباس لندن کے ساول دو سٹور کے بہترین کپڑے سے بنا ہوا چغہ اور پاؤں میں روم سے خریدے ہوئے مہنگے ترین جوتے ہوتے تھے۔ وہ عام چپل نہیں جو وہ لوگوں کے سامنے آتے وقت پہنا کرتا تھا۔

اپنے پسندیدہ کھانے کی میز پر بیٹھا وہ اپنی اہلیہ کو یقین دہانی کرا رہا تھا کہ اُس کا آئندہ کا لیبیا کا سفر انتہائی محفوظ اور ہر لحاظ سے کامیاب رہے گا اور وہ لیبیا کے انقلابی لیڈر معمر قذافی سے دس لاکھ ڈالر کی امداد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا جس کی اُس نے اپنے فیکس پیغام کے ذریعے لیبیا کی انقلابی کونسل کے ہیڈ کوارٹر سے درخواست کر رکھی تھی۔ معمول کے مطابق یہ رقم لیبیا کے سرکاری بنک کے ذریعے ترپولی سے مالٹا کے ذریعے ولیتا بنک کی برانچ میں منتقل کر دی جائے گی۔ شکا کی ایک دن کے لئے طیارے پر جائے گا اور رقم نکلوا کر اگلی فلائٹ سے واپس گھر آ جائے گا۔

اُس کے دو کمسن بیٹوں کو جب اپنے ابا کے مالٹا جانے کی بھنک پڑی تو انہوں نے بھی اپنے تحائف کی فہرست اُسے تھما دی جس میں آدھی درجن شرٹس بھی شامل تھیں جو مالٹا کے اس سٹور کی بنی ہوئی تھیں جہاں سے وہ پہلے بھی خریداری کیا کرتا تھا۔

فاطمہ کو یاد آتا ہے کہ ”اس کے میاں کا خیال تھا کہ اگر اسرائیلیوں نے اُس کے خلاف کوئی کارروائی کرنی ہوتی تو اب تک کر چکے ہوتے کیونکہ یہودی انتقام لینے میں دیر نہیں لگاتے“۔

فاطمہ شکا کی مزید کہتی ہے کہ ”میرے خاوند کو یقین تھا کہ اسرائیلی اُس کے خلاف کوئی ایکشن لے کر شام کی ناراضگی کا خطرہ مول نہیں لیں گے“۔ (شام اور اسرائیل کے درمیان امن کا معاہدہ ہو چکا تھا)

تین مہینے پہلے تک تل ابیب کا رویہ وہی تھا جس کا شکا کی نے اندازہ لگایا تھا۔ 1995ء کی گرمیوں کے

شروع میں رابن (وزیراعظم) نے موساد کا یہ منصوبہ رد کر دیا تھا کہ دمشق کے نواح میں شاکی کے اپارٹمنٹ کو آتش گیر مادے سے تباہ کر دیا جائے۔ یوری ساوئی (Uri Saguy) جو اس وقت اسرائیلی ملٹری انٹیلی جنس کا سربراہ اور تمام خفیہ ایجنسیوں کا نگران تھا اور موساد بھی جس کی ماتحتی میں آتی تھی نے رابن کو بتایا تھا کہ اُس نے دمشق کے رویے میں بہت بڑی تبدیلی محسوس کی ہے اور (صدر حافظ) اسد (شام) اب بھی ہمیں سب سے بڑا دشمن سمجھتا ہے۔ اس کی تسلی کے لئے ہمیں کوئی غیر متوقع اقدام کرنا چاہئے ہمیں گولان ہائٹ (Golan Heights) کو مکمل طور پر خالی کر کے وہاں سے اپنے ہر آدمی کو نکلنے کا حکم دینا چاہئے۔ اگر چہ یہ بہت بڑی قیمت ہے لیکن دیرپا امن کے لئے ہمیں یہ قیمت ادا کر دینی چاہئے"۔

وزیراعظم نے اُس کی بات توجہ سے سنی۔ اُسے معلوم تھا کہ گولان کے دفاع کے لئے یوری گوئی نے کس قدر قربانیاں دی ہیں اس کے ملٹری کیریئر کا بیشتر حصہ گولان کی پہاڑی چٹانوں کے دفاع میں لڑتے ہوئے گزرا ہے۔ اس دوران وہ چار مرتبہ زخمی بھی ہوا تھا۔ اس کے باوجود وہ سب کچھ بھلا کر اسرائیل کے لئے طویل المدت پائیدار امن حاصل کرنا چاہتا تھا۔

وزیراعظم نے شاکی کو نیست و نابود کرنے کے منصوبے کو اُس وقت تک کے لئے معرض التوا میں ڈال دیا تھا، جب تک یوری ساگوئی امن کی کوششوں میں لگا ہوا تھا۔

لیکن اس ریجن کے گرمائی موسم میں ان کی امن کی امیدیں مرجھا چکی تھیں اور وزیراعظم رابن نے، جواب امن کا نوبل انعام (یاسر عرفات کے ساتھ مشترکہ) بھی حاصل کر چکا تھا، شاکی کے قتل کی منظوری دے دی۔

موساد سربراہ شبتائی شاوت (Shaetal Shavit) جس کا یہ آخری آپریشن تھا، نے دمشق میں موجود اپنے بلیک ایجنٹ کو حکم دیا کہ وہ شاکی کے اپارٹمنٹ کی الیکٹرانک نگرانی شروع کر دے۔ اسرائیلی ایجنٹ کے پاس سرویلنس اور نگرانی کے امریکن ساختہ جدید ترین الیکٹرانک آلات موجود تھے جبکہ شاکی کے اپارٹمنٹ میں لگے ہوئے روسی ساختہ حفاظتی اور وارننگ دینے والے آلات کم معیار اور گھٹیا قسم کے تھے جنہیں ناکام اور بیکار بنانا اسرائیلی ایجنٹ کے لئے مشکل کام نہ تھا۔

شاکی نے اپنے دورۂ لیبیا اور مالٹا کی جو منصوبہ بندی کر رکھی تھی اُس کی تمام تفصیل موساد کے ایجنٹ نے تل ابیب پہنچا دی کیونکہ ہگنگ ڈیوائسز کے ذریعے گھر کے اندر ہونے والی ہر بات اُسے سنائی دے رہی تھی۔

اب اکتوبر 1995ء کی سہ پہر کو اسرائیل کی تین نہایت طاقتور انٹیلی جنس ایجنسیوں کے سربراہ پلنسکر سٹریٹ کی پُر ہجوم ٹریفک میں سے راستہ بناتے ہوئے اپنے محفوظ ٹھکانے پر جمع ہوئے تھے۔ ہر ایک نے اسرائیل کے خود ساختہ دشمن کی ہلاکت کے فیصلے کی تائید و توثیق کر دی۔ میئر امیت (Meir Amit) جب موساد کا ڈائریکٹر جنرل تھا (68-1963) تو اُس نے ایسی ہلاکتوں کے سلسلے میں ایک طریق کار اور رہنما اصول وضع کیا تھا جس میں کہا گیا تھا۔

"سیاسی رہنماؤں کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ اُن سے سیاسی طریقے سے ہی نمٹا جائے گا۔ دہشت گردوں کے اہل خاندان کو ہلاک نہیں کیا جائے گا۔ ہاں اگر کسی دشمن سے نمٹتے وقت اس کے خاندان کا کوئی فرد بیچ میں آ جائے تو یہ ہمارا مسئلہ نہیں ہوگا۔ ہر قتل کی منظوری اُس وقت کا موجودہ وزیراعظم (اسرائیل) دے گا اور ہر اقدام قواعد و ضوابط کے تحت اٹھایا جائے گا۔ قتل کے فیصلوں کو تحریر کیا جائے گا۔ کام انتہائی صفائی اور عمدگی سے انجام پانا چاہئے۔ ہمارے اقدامات کو ریاستی سرپرستی میں قتل کی نظر

سے نہیں دیکھا جانا چاہئے بلکہ عدالتی فیصلوں پر حکومتی عمل درآمد کا نتیجہ دکھائی دینا چاہئے۔ ہمیں قانون و قواعد پر عمل درآمد کنندگان کے طور پر نظر آنا چاہئے"۔

جب سے 1972ء میں اولمپک گیمز کی اسرائیلی ٹیم کے قاتلوں کو انتہائی کامیابی کے ساتھ تلاش کر کے ہلاک کیا گیا تھا بعد میں قتل کئے جانے والوں کے سلسلے میں عموماً ان ہدایات کو مدنظر رکھا جاتا رہا تھا، میئر امیت کی موساد کی سربراہی سے رخصت ہونے کے 23 سال بعد تک اس کی ہدایات پر عمل ہوتا آیا تھا۔ آج کی میٹنگ میں پہنچنے والا پہلا شخص موساد کا ڈائریکٹر جنرل شبتائی شاوت تھا جس کے بارے میں اس کے ساتھیوں کا خیال تھا کہ وہ لباس اور شکل و شباہت سے تل ابیب کے کسی ادنیٰ درجے کے ہوٹل کا استقبالیہ کلرک لگتا ہے۔ اکڑے ہوئے احتیاط سے استری شدہ کپڑے اور ہاتھ ملاتے وقت مخالف کے ہاتھ کو صرف چھوتا تھا۔ وہ تین سال سے اس عہدے پر کام کر رہا تھا اور ہمیشہ تاثر یہی دیتا تھا کہ پتہ نہیں وہ کب یہ عہدہ چھوڑ کر بھاگ جائے گا۔

میٹنگ میں آنے والا دوسرا شخص اسرائیلی دفاعی افواج کا چیف انٹیلی جنس افسر بریگیڈیئر جنرل دوران تامیر تھا۔ تیز طرار، اپنے کیریئر کے انتہائی عروج پر اور اس کی چال ڈھال سے لگتا تھا کہ اس کی پوری زندگی دوسروں پر حکم چلانے میں ہی گزری ہے۔

اور آخر میں پہنچنے والا ملٹری انٹیلی جنس کے شعبہ امان کا ڈائریکٹر یوری ساگوئی تھا کسی ہیرو کی طرح نپے تلے قدم اٹھاتا۔ نرم خو لیکن خود پسند۔ وہ اپنے ہمراہیوں کو اب بھی اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا، عام خیال کے برعکس اور ظاہری پھوں پھاں کے باوجود شام اب بھی امن کی بات چیت کرنے پر آمادہ ہے۔

تینوں انٹیلی جنس سربراہوں کے آپس کے تعلقات، شاوت کے الفاظ میں محتاط لیکن پُر جوش تھے۔

یوری ساگوئی کہنے لگا۔ "ہم شاید ہی کبھی ایک دوسرے کا مقابل کرتے ہیں۔ میں امان کے سربراہ کی حیثیت سے آپ دونوں پر نظر رکھتا ہوں۔ ہمارے درمیان کام کا مقابلہ رہتا ہے لیکن ہمارے مختلف طریقوں سے کام کرنے کا مقصد وحید وہی ہوتا ہے، اسرائیل کی حفاظت لہٰذا سب ٹھیک رہتا ہے"۔

وہ تینوں دو گھنٹے تک رہائشی کمرے کی میز کے گرد بیٹھے فاتحی شقاکی کے قتل کے منصوبے پر غور کرتے رہے۔ اس کی ہلاکت محض انتقام ہوگا۔ جیسا کہ اسرائیل کا بائبل پر ایمان ہے۔ "آنکھ کے بدلے آنکھ" لہٰذا ایسے قتلوں کو اسرائیلی جائز اور برحق سمجھتے ہیں لیکن موساد کے ایجنٹ بعض اوقات ایسے ضدی اور خودسر افراد کو بھی قتل کر دیتے تھے جو اپنا ہنر، تجربہ اور علم اسرائیلی خواہشات کی تکمیل کے لئے استعمال کرنے سے انکار کر دیتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس سے قبل کہ اُس کا ہنر، تجربہ اور علم دشمن کے ہاتھ لگے، اُسے ختم ہو جانا چاہئے۔

کینیڈا کا ایک سائنسدان ڈاکٹر گریرالڈل دنیا کا عظیم بیرل بلسکلس (Dr. Gerald Bull Barrel Ballistics) کا ماہر تھا۔ اسرائیل اس کی مہارت اور تجربے کو خریدنے کی کئی کوششیں کر چکا تھا۔ ہر دفعہ ہی ڈاکٹر بل نے یہودی ریاست سے فاصلہ رکھنے کی کوشش کی۔

اس کے برعکس اس نے اپنی خدمات صدام حسین کو ایک ایسی سپر گن بنانے کے لئے پیش کر دیں جو ایٹمی، کیمیاوی اور جراثیمی مواد والے گولے عراق سے براہ راست اسرائیل کے اندر تک فائر کرنے کے قابل تھی۔ اس سپر گن کی بیرل کی لمبائی 487 فٹ اور 32 ٹن وزنی ایسے خصوصی سٹیل سے بنائی گئی تھی جو ایک برطانوی فرم نے سپلائی کیا تھا۔ 1989ء کے آخر میں شمالی عراق کے شہر موصل کے توپ خانے میں اسے ٹسٹ کیا گیا تھا۔

صدام حسن نے 20 ملین ڈالر کی لاگت سے ایسی تین توپیں بنانے کا حکم دیا تھا۔ بل کو بطور مشیر اور صلاح کار ایک ملین ڈالر کی تنخواہ پر اس پروجیکٹ پر رکھا گیا تھا۔ اس منصوبے کا کوڈ نام "بے بی لون" (Babylon) رکھا گیا تھا۔

ڈاکٹر بل کی کمپنی، سپیس ریسرچ کارپوریشن برسل (بلجیم) میں رجسٹر تھی اور اسے بطور عمارات اور اپارٹمنٹ کی ڈیزائن کمپنی کے طور پر رجسٹر کرایا گیا تھا۔ وہاں سے کمپنی نے یورپ کے مختلف اداروں اور فیکٹریوں کو اپنی ضروریات کا انتہائی پیچیدہ اور حساس ترین ساز و سامان، کمپنی کی مہیا کردہ تفصیلات کے مطابق آرڈر کیا تھا۔ ان سپلائرز میں برطانیہ کی 20 کمپنیاں اور تیار کنندگان فیکٹریاں بھی شامل تھیں۔

17 فروری 1990ء کو موساد کا برسل میں تعینات ایک ایجنٹ بے بی لون سے متعلقہ دستاویزات اور تفصیلات کی ایک نقل حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ سپر گن دراصل میڈیم رینج بیلسٹک میزائل دور تک مار کرنے والی انتہائی خطرناک جدید ترین اور دنیا کی سب سے بڑی توپ تھی۔ اس میں آٹھ قسم کے سکڈ میزائل 1500 میل تک مار کرنے کی صلاحیت تھی۔ یہ نہ صرف اسرائیل کے ہر شہر کو نشانہ بنا سکتی تھی بلکہ اس کی پہنچ میں یورپ کے کئی شہر بھی آتے تھے۔ بل کو اس بات کا بھی یقین تھا کہ وہ ایک ایسی سپر گن بھی بنانے کے قابل ہو جائے گا جو براہ راست بغداد سے لندن تک مار کر سکے۔

موساد کے ڈائریکٹر جنرل ناہوم ادمونی (Nahumn Admoni) نے فوری طور پر وزیراعظم یزہاک شامیر (Yitzak Shamir) ملاقات کی درخواست کی۔ اسرائیل کی آزادی کے لئے برطانوی افواج کے خلاف بے جگری سے گوریلا جنگ لڑنے کی شہرت رکھنے والا شامیر ایک ایسا سیاسی لیڈر تھا جسے موساد کے ہر طبقہ خیال کے لوگ قدر، پسندیدگی اور احترام کی نظر سے دیکھتے تھے اور اس کے اشارۂ ابرو پر اسرائیل کے دشمنوں کو نیست و نابود کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ 1960ء کی دہائی میں، جب جرمنی کے نازی سائنسدان، مصر کے ساتھ مل کر لمبی رینج کے ایسے راکٹ بنانے میں تعاون کر رہے تھے جنہیں صحرائے سینائی سے اسرائیل کے اندر تک فائر کیا جا سکے تو موساد نے ان جرمن سائنسدانوں کے قتل کی منصوبہ بندی کے لئے شامیر سے رہنمائی اور تجربہ حاصل کیا تھا۔ آزادی کی جنگ کے دوران برطانوی فوجیوں کو ہلاک کرنے میں اسے خصوصی ماہر مانا جاتا تھا۔ شامیر نے اپنے زیر زمین کام کرنے والی خفیہ تنظیم کے گوریلوں کو جرمن سائنسدانوں کی ہلاکت کے مشن پر بھجوایا تھا۔ بعدازاں قاتل مشن کے یہی ارکان اسرائیل کی اوّلیں خفیہ تنظیم موساد کے بنیادی ممبر بنائے گئے تھے۔

شامیر نے ڈاکٹر بل کے بارے میں تیار کی موساد کی فائل پر سرسری نظر ڈالی۔ فائل میں ڈاکٹر بل کی ابتدائی زندگی کا خاکہ اس طرح بیان کیا گیا تھا کہ ڈاکٹر بل کو 22 سال کی عمر میں فزکس میں ڈگری دی گئی تھی۔ پھر اس نے کینیڈا کی حکومت میں آرمامنٹ اینڈ ریسرچ ڈویلپمنٹ اسٹیبلشمنٹ میں نوکری کر لی۔ وہاں اس کی اپنے سینئر افسران سے ان بن ہو گئی جس نے اس کے دل میں بیوروکریسی کے خلاف زندگی بھر کے لئے نفرت پیدا کر دی۔ چنانچہ اس نے اپنا ذاتی مشاورتی ادارہ قائم کر لیا جسے موساد کی فائل میں ''کرائے کی توپیں'' کہہ کر طنز کی گئی تھی۔

توپوں کی ساخت اور ایجاد میں اس کی شہرت 1976ء میں عروج پر پہنچ گئی جب اس نے 45. کیلیبر کی گن تیار کی جو 25 میل کے فاصلے پر اپنے ہدف کو نشانہ بنا سکتی تھی اس وقت تک نیٹو کے پاس جو گن تھی اُس کی

زیادہ سے زیادہ رینج صرف 17 میل تھی۔ لیکن ایک دفعہ پھر ڈاکٹر بل کو حکومتی رویے نے انتہائی مایوس کیا۔ یورپ کے اسلحہ سازوں کی لابی نے نیٹو کو اس جدید اور موثر توپ کی خریداری روک دیا۔ آخر کار ڈاکٹر بل نے اپنی توپ جنوبی افریقہ کو فروخت کر دی۔

ڈاکٹر بل پھر چین پہنچا اور پیپلز ریپبلک آرمی کی میزائلوں کی صلاحیت بڑھانے میں مدد کی۔ اس کے علاوہ موجودہ "سلک ورم" (Sillkworm) راکٹ کی رینج کو بڑھانے اور زیادہ سے زیادہ دھماکہ خیز مادہ اٹھا لے جانے کی طاقت میں اضافہ کیا۔ ان میں سے بیشتر راکٹ چین نے صدام حسین کو فروخت کر دیئے۔ عراق نے یہ راکٹ اپنے ہمسائے ایران کے خلاف اپنی طویل المدت جنگ میں استعمال کئے۔ ایران، عراق جنگ بندی کے بعد بھی عراق کے پاس لاتعداد "سلک ورم" راکٹ موجود تھے اور موساد کو یقین تھا کہ یہ اسرائیل کے خلاف استعمال کئے جائیں گے۔

اس دوران پروجیکٹ بے بی لون میں کافی تیزی آ چکی تھی۔ اس لمبی نالی والی توپ کی آزمائش بھی کی جا چکی تھی۔ صدام حکومت کے مخالفین جنہیں موساد نے اپنے مخبروں اور جاسوسوں کے طور پر بھرتی کر رکھا تھا، نے یہ اطلاع دی تھی کہ اس توپ سے فائر کئے جانے والے راکٹوں کی ایسی ناک (نوز) تیار کی جا رہی ہے۔ جس کے ذریعے کیمیکل اور جراثیمی ہتھیار فائر کئے جا سکیں۔

20 مارچ 1990ء کی سہ پہر کو وزیراعظم یزہاک شامیر نے اپنے دفتر میں ناہوم ادمونی کو منظوری دے دی کہ ڈاکٹر گرالڈ بل کو مرنا چاہئے۔

اس فیصلے کے دو روز بعد دو افراد پر مشتمل قاتل ٹیم برسل پہنچ گئی۔ ٹیم کے استعمال کے لئے برسل میں موساد کا وہ ایجنٹ موجود تھا جو ڈاکٹر بل کے روزمرہ معمولات اور آمدورفت پر گہری نظر رکھے ہوئے تھا۔

22 مارچ 1990ء کو بوقت 6.45 بجے شام تین افراد ایک کرائے کی کار میں اس اپارٹمنٹ بلڈنگ کی طرف روانہ ہوئے جہاں بل کی رہائش تھی۔ تینوں کی جیکٹوں کے نیچے ہولسٹر میں پستول تھے۔

20 منٹ بعد دروازے کی گھنٹی کے جواب میں 61 سالہ بل نے اپنے پرتعیش اپارٹمنٹ کا دروازہ کھولا۔ بیک وقت 7.65 ایم ایم پستول کی پانچ گولیاں اس کے دماغ اور گردن کے آر پار ہو گئیں۔ بل اپنے دروازے پر مردہ پڑا تھا۔ بعدازاں بل کے بیٹے مائیکل نے دعویٰ کیا کہ بل کو وارننگ مل چکی تھی کہ موساد اسے قتل کر دے گی۔ وہ یہ وضاحت نہ کر سکا کہ وارننگ کس نے دی تھی اور اس کے باپ نے اس کی پروا کیوں نہ کی؟

جیسے ہی موساد کی قاتل ٹیم مشن کی کامیاب تکمیل کے بعد پہنچ گئی۔ موساد کے نفسیاتی جنگ کے شعبے کے ڈپٹی ڈائریکٹر نے اخبارات، ٹی وی، ریڈیو اور دیگر ذرائع ابلاغ پر دروغ گوئی کی یہ کہانی پھیلانی شروع کر دی کہ گیرالڈ بل اس لئے ہلاک ہوا کہ وہ صدام حسین کے ساتھ کئے گئے اپنے معاہدوں سے منحرف ہو رہا تھا۔ جس طرح پانچ سال پہلے گیرالڈ بل کو جو کہ ایک سائنسدان تھا اور جسے اسرائیل نے اپنے خلاف ایک دہشت گرد قرار دے کر قتل کرا دیا تھا۔ بالکل اسی طرح گجی شکا کی کو دہشت گرد قرار دے کر ایک نئے وزیراعظم یزہاک رابن کے حکم سے ہلاک کرنے کی حکمت عملی بنائی جا رہی تھی۔

24 اکتوبر 1995ء کو دو افراد جن کے کوڈ نام گل (Gil) اور ران (Ran) تھے اور جن کی عمر 28، 29 سال تھیں، دو مختلف فلائٹوں سے تل ابیب سے روانہ ہوئے۔ ران کی منزل ایتھنز (Athens) اور گل کی روم (Rome) تھی۔ دونوں ائرپورٹوں پر انہیں مقامی ایجنٹوں کی طرف سے نئے برٹش پاسپورٹ دیئے گئے۔ وہ شام گئے پہنچنے والی فلائٹوں سے مالٹا پہنچے اور ڈپلومیٹ

ہوٹل میں ٹھہرے، جہاں سے ولیٹا (Valletta) کی بندرگاہ کا واضح نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ اسی شام کو ایک موٹر سائیکل ران کے حوالے کی گئی اس نے ہوٹل کے سٹاف کو بتایا کہ وہ اس پر جزیرے کی سیر کرنا چاہتا ہے۔

ہوٹل کے سٹاف میں سے کسی کو یاد نہیں کہ دونوں نے کسی سے کوئی رابطہ قائم کیا ہو۔ انہوں نے اپنا زیادہ تر وقت اپنے ہوٹل کے کمرے ہی میں گزارا۔ جب کمرے کی گھنٹی سننے والے ایک لڑکے نے کہا کہ گل کا سوٹ کیس بہت بھاری ہے تو اس نے آنکھ مار کر کہا کہ اس میں سونا بھرا ہوا ہے۔

اسی شام کو ایک مال بردار جہاز نے جو گزشتہ روز حیفہ کی بندرگاہ سے اٹلی جانے کے لئے چلا تھا، بندرگاہ کے حکام کو ریڈیو پیام بھیجا کہ ان کے جہاز کے انجن میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہے لہذا وہ خرابی دور ہونے تک جزیرے کے قریب ہی ٹھہرے گا۔ اس سرائیلی مال بردار جہاز کے اوپر خود موساد کا ڈائریکٹر جنرل شبتائی شاوت اور اس کے مواصلات کے ماہر ٹیکنیشن کی ایک چھوٹی سی ٹیم سوار تھی۔ انہوں نے گل کے ساتھ مواصلاتی رابطہ قائم کیا جس کے سوٹ کیس میں ایک چھوٹا طاقتور ریڈیو موجود تھا۔ اس رات گل کو بحری جہاز سے کئی پیغامات موصول ہوئے۔

اسی روز فتحی شکاکی ترپولی سے ولیٹا آنے والی بحری کشتی میں مالٹا پہنچ چکا تھا۔ شکاکی کی اس کشتی پر حفاظت کے لئے لیبیا کی سکیورٹی کے مسلح افراد موجود تھے اور ان کی ذمہ داری شکاکی کو بحفاظت مالٹا کی بندرگاہ ولیٹا تک پہنچانا تھا۔ شکاکی لیبیا کی کشتی سے اکیلا ہی ساحل پر اترا۔ اترنے سے پہلے کشتی پر اس نے اپنی داڑھی استرے سے شیو کر کے صاف کر لی تھی۔ اس نے مالٹا کے امیگریشن حکام کو اپنے آپ کو ابراہیم دانش کے نام سے متعارف کرایا اور اسی نام کا لیبیا کا جاری کردہ پاسپورٹ پیش کیا۔ بندرگاہ سے باہر آنے کے بعد اس نے ڈپلومیٹ ہوٹل میں کمرہ لے لیا اور اگلے چند گھنٹے سمندر کنارے واقع چائے خانوں اور ساحلی ریسٹورانوں سے لطف اندوز ہوتے گزارے۔ اس نے جی بھر کر کافی پی اور انتہائی میٹھے عربی کیک کھائے۔ اس نے بہت سی ٹیلیفون کالیں بھی کیں۔

اگلے دن شکاکی اپنے بچوں سے کئے گئے وعدے کے مطابق ان کے لئے شرٹیں خرید کر ساحل سمندر پر چہل قدمی کرتا ہوا اپنے ہوٹل کی طرف چلا آ رہا تھا کہ ایک موٹر سائیکل جس پر دو افراد سوار تھے، اس کے قریب آ کر آہستہ ہوئی اور موٹر سائیکل سواروں میں سے ایک نے شکاکی کے سر کا نشانہ لے کر چھ گولیاں دماغ کے آر پار کر دیں۔ جہادی رہنما فوراً ہی جنت کو سدھار گیا۔ موٹر سائیکل سوار لمحوں میں غائب ہو گئے۔ کسی کا کبھی بھی کوئی پتہ نہ چل سکا لیکن اس واقعے کے ایک گھنٹہ بعد ایک مچھلیاں پکڑنے والی شکاری کشتی ولیٹا کی بندرگاہ سے نکلی اور زیر مرمت اسرائیلی مال بردار جہاز کے نیچے جا کر رک گئی۔ اس کے فوراً بعد جہاز کے کپتان نے بندرگاہ کے حکام کو بتایا کہ جہاز کے انجن کی خرابی وقتی طور پر درست کر دی گئی ہے اور مزید مرمت کے لئے جہاز حیفہ کی بندرگاہ واپس جا رہا ہے۔

ایران میں جو شکاکی کا روحانی مرکز تھا، ملاؤں نے ایک روز کے سوگ کا اعلان کیا۔ وزیر اعظم اسرائیل، یزہاک رابن سے تل ابیب میں اس قتل بارے سوال پوچھا گیا تو اس کا جواب تھا۔ ”مجھے یقیناً کوئی افسوس نہیں ہے“۔

اس کے چند ہی روز بعد اسی محفوظ ٹھکانے کے قریب جہاں رابن نے شکاکی کے قتل کا حکم دیا تھا۔ ایک امن ریلی کی قیادت کرتے ہوئے تل ابیب میں 4 نومبر 1995ء کو یزہاک رابن کو بھی قتل کر دیا گیا۔ رابن کو قتل

ایک انتہا پسند جنونی یہودی یگال امیر کے ہاتھوں سے ہوا جو رابن جیسا ہی بے رحم اور جلاد صفت انسان تھا، ایسے جنونیوں اور جلادوں کی موساد میں بڑی قدر و منزلت تھی۔

بزہاک رابن، جو شکرے سے فاختہ بن گیا تھا (اس نے یاسر عرفات کے ساتھ امن کا نوبل انعام مشترکہ طور پر حاصل کیا تھا)، نے اپنی پسندیدہ کتاب بائبل کا حوالہ دیتے ہوئے کہا تھا۔

''آؤ، امن کی خاطر اپنی تلواروں کا رُخ اپنے عرب ہمسایوں کے ساتھ مل کر زراعت اور کھیتی باڑی کی طرف موڑ دیں''۔

بزہاک رابن کو اس کے اپنے لوگوں میں سے ایک نے قتل کر دیا کیونکہ اس کے مخالفین کو اس کی مڈل ایسٹ میں امن کی کوششیں ایک آنکھ نہیں بھاتی تھیں۔

1998ء میں موساد کی قاتل ٹیم کے ممبران کی تعداد 48 تھی، جن میں چھ خواتین بھی شامل تھیں۔ ان سب کی عمریں 20 سال کے لگ بھگ اور تمام انتہائی فٹ تھے۔ یہ تل ابیب میں موساد کے ہیڈ کوارٹر کے باہر نیگیو صحرا میں ایک ملٹی چھاؤنی میں رہتے تھے اور وہیں انہیں قتل اور ہلاک کرنے کے نئے اور جدید طریقے سکھائے جاتے تھے۔

30 جولائی 1997ء کو یروشلم کے ایک خریداری مرکز میں حماس کے دو خودکش حملہ آوروں نے 15 افراد کو ہلاک اور 157 کو زخمی کر دیا۔ اگلے روز موساد کے ڈائریکٹر دانی یاطوم نے وزیراعظم بنیامین نیتن یاہو (Benyamin Netanyahu) کی صدارت میں ہونے والے اجلاس میں شرکت کی جس میں وزیراعظم نے واضح لفظوں میں کہا کہ حماس ہمارے انتقام سے نہیں بچ سکے گی۔

گلف وار کے دوران صدام حسین کے بارے میں سی این این (CNN) پر نیتن یاہو کی طرف سے جو تبصرے اور تجزیے نشر ہوتے رہے تھے اور صدام حسین کی اسرائیل کے بارے آئندہ کے لئے منصوبہ بندی کا نقشہ پیش کیا تھا۔ اس کی وجہ سے اسرائیل میں نیتن یاہو کو ''بی بی'' (Bi Bi) کہا جانے لگا تھا۔ اسی روز اپنے دفتر کے ساتھ والے کمرے میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے بی بی جس قدر پُرسکون، غیر جذباتی اور سنجیدہ نظر آ رہا تھا اب اپنے مشیروں، سینئر افسروں، انٹیلی جنس اداروں کے سربراہوں بشمول موساد کے چیف یاطوم انتہائی مشتعل، جذباتی اور غصے سے بھرا ہوا، چیخ چلا رہا تھا۔

''میں حماس کے شیطانی بچوں کو نیست و نابود کر دوں گا۔'' اجلاس میں شامل ایک معتبر شخص کے مطابق بی بی نے اپنے سامنے اور دائیں بائیں بیٹھے ہوئے سینئر افسران سے کہا۔

''تم مجھے بتاؤ کہ یہ انتقامی کارروائی کیسے کی جائے گی؟ میں اخبارات میں یہ نہیں پڑھنا چاہتا کہ بی بی نے اپنا بدلہ چکایا ہے۔ یہ انصاف اور کئے کی سزا نظر آنا چاہئے''۔

جیسے جیسے اجلاس میں بی بی کی گھن گرج جاری تھی موساد کا سربراہ یاطوم کانفرنس ٹیبل پر خاموش بیٹھا سن رہا تھا کیونکہ وہ وزیراعظم کے پارے کی طرح چڑھتے اترتے موڈ سے اچھی طرح واقف تھا۔

''مجھے اُن کے سر چاہئیں، میں انہیں مردہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے کچھ پروا نہیں کہ یہ کام کس طرح ہوگا۔ میں چاہتا ہوں یہ کام ہر صورت میں ہونا چاہئے اور میں جلد از جلد اس کام کی تکمیل چاہتا ہوں''۔

اجلاس میں اس وقت اور بھی گرما گرمی پیدا ہو گئی جب نیتن یاہو نے یاطوم سے مطالبہ کیا کہ وہ بی بی کو حماس کے رہنماؤں کے نام اور موجودہ پتے مہیا کرے۔ آج تک کسی بھی وزیراعظم نے ایسی خفیہ اور حساس معلومات کا

کسی مشن کی ابتدائی سٹیج پر اور یوں کھلے اجلاس میں مطالبہ نہیں کیا تھا۔

اجلاس میں شامل ایک سے زائد افراد نے محسوس کیا کہ نیتن یاہو اس مشن کی تکمیل اپنی ذاتی نگرانی اور خواہش کے مطابق کرانا چاہتا ہے اور اس کا واضح پیغام دینا چاہتا ہے۔

اس سے موساد کے سینئر افسروں میں بے چینی اور تشویش پیدا ہونا شروع ہو گئی کہ نیتن یاہو اپنے انتقامی جذبے کی تسکین کے لئے موساد کو اپنے انگوٹھے کے نیچے دبا کے رکھنا چاہتا ہے۔ اس بات کو محسوس کرتے ہوئے یاطوم نے وزیراعظم سے کہا کہ بعد میں کسی وقت حماس کے رہنماؤں کی فہرست اسے مہیا کر دے گا۔ اس کے علاوہ موساد کے سربراہ نے تجویز پیش کی کہ ہمیں مشن کی تکمیل کے عملی پہلوؤں کو بھی زیر غور لانا ہوگا۔ حماس کے لیڈروں کی تلاش کا کام ایسے ہی ہے جیسے بیروت شہر کے گٹروں کے اندر ایک چوہے کو ڈھونڈنا۔

ایک دفعہ نیتن یاہو نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”وہ کوئی بہانے بازی سننا نہیں چاہتا، وہ صرف ایکشن چاہتا ہے جو ابھی اور اسی وقت شروع ہو جانا چاہئے“۔

میٹنگ کے ختم ہونے پر انٹیلی جنس افسروں کی اکثریت نے محسوس کیا کہ بی بی نیتن یاہو نے وہ حساس لائن پار کر لی ہے جہاں سیاسی مصالحت ختم اور عملی اقدامات کا آغاز ہوتا ہے۔ میٹنگ کے کمرے میں کوئی ایسا بندہ نہ تھا جس نے محسوس نہ کیا ہو کہ نیتن یاہو دہشت گردی ختم کر کے اپنے جن دعوؤں کے ساتھ برسراقتدار آیا تھا اب اگر اس نے سخت قسم کے اقدامات نہ اٹھائے تو عوام میں اس کے خلاف بغاوت ہو جائے گی۔ پھر ہر روز منظر عام پر آنے والے سکینڈلوں نے، جس کا الزام وہ ہمیشہ دوسروں پر دھرا کرتا تھا، عوام میں اس کی مقبولیت کا گراف انتہائی نچلی سطح پر پہنچ چکا تھا۔ اس کی ذاتی زندگی کی

جمعہ کی فضیلت

☆ جمعہ کے دن جہنم کی آگ نہیں جلائی جاتی۔

☆ جمعہ کی رات دوزخ کے دروازے نہیں کھلتے۔

☆ جمعہ کے دن مرنے والے خوش نصیب مسلمان کو شہید کا رتبہ دیا جاتا ہے۔

☆ جمعہ کے دن حج ہو تو اس کا ثواب 70 حج کے برابر ہوتا ہے۔

☆ جمعہ کے دن ایک نیکی کا ثواب 70 نیکیوں کے برابر ہے۔

☆ جمعہ کے دن نبی پاکؐ خود اپنے کانوں سے درود پاک سنتے ہیں۔

☆ جمعہ کے دن درود پاک پڑھنے کی 30 حاجتیں دنیا میں پوری ہوتی ہیں۔

(جواد حیدر۔ تلہ گنگ)

کہانیوں سے اخبارات بھرے پڑے تھے۔ اس کے لئے اس وقت انتہائی ضروری تھا کہ اپنی اہلیت و قابلیت کا ثبوت دے۔ حماس کے کسی لیڈر کی کٹی ہوئی گردن اس کی مقبولیت کو بلندیوں تک پہنچا سکتی تھی۔

ایک سینئر انٹیلی جنس افسر نے سب کی طرف سے بولتے ہوئے کہا۔

”ہم سب اس بات پر متفق ہیں کہ سانپ کا سر کاٹنے سے اس کی موت واقع ہو جاتی ہے، یہ وقت کا انتخاب ہے جو ہماری پریشانی کا سبب ہے۔ بی بی کی طرف سے بار بار ”ابھی ایکشن“ کی تکرار بے معنی چیز ہے۔ اس قسم کے ایکشن کے لئے انتہائی محتاط منصوبہ بندی اور رازداری شرط ہے۔ بی بی کو فوری نتیجہ چاہئے جیسے کہ یہ کوئی کمپیوٹر گیم ہے یا کوئی ایکشن فلم کا منظر ہے جس کے ہیرو کے ایکشن بی بی کو پسند آتے ہیں لیکن حقیقی

اور عملی زندگی میں ایسا نہیں ہوتا"۔

موساد کے سربراہ یاطوم نے تمام عرب ممالک، غزاء اور مغربی کنارے میں موجود اپنے جاسوسوں اور مخبروں کو حکم جاری کر دیا کہ حماس کو کنٹرول کرنے والی نادیدہ قوتوں اور افراد کا پتہ چلائیں اور ان کی جائے قیام در ہائش بارے معلومات مہیا کریں۔ اگست 1997ء کے پورے مہینے میں یاطوم کو بار بار وزیر اعظم کے دفتر میں بلایا گیا اور اس سے پروگریس رپورٹ مانگی گئی۔ ابھی تک کوئی کامیابی نہیں ہوئی تھی انٹیلی جنس اداروں میں یہ تاثر عام ہو رہا تھا کہ وزیر اعظم یاطوم پر دباؤ ڈال رہا ہے کہ اس کام پر جاسوسوں اور مخبروں کی نفری روانہ کرے، جلد نتائج نہ ملنے کی صورت میں وزیر اعظم موساد کے سربراہ کے خلاف کوئی اور ایکشن لینے پر مجبور ہو گا۔ وزیر اعظم کی طرف سے اگر یہ ڈھکے چھپے الفاظ میں دھمکی تھی تو اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ یاطوم نے صرف اتنا جواب دیا۔ "وہ اپنی ہر ممکن کوشش کر رہا ہے"۔ اس میں خاموش اشارہ یہ تھا کہ اگر وزیر اعظم اسے ہٹانا چاہتا ہے تو یہ اس کا استحقاق تھا لیکن اس سے پریس اور عوام میں بحث شروع ہو جائے گی اور نیتن یاہو کی اپنی کارگزاری بارے سوالات اٹھائے جائیں گے لیکن وزیر اعظم نے اپنا دباؤ جاری رکھا کہ اسے حماس کے کسی ایک لیڈر کا سر چاہئے اور جلد از جلد۔

ستمبر 1997ء کے شروع سے نیتن یاہو نے یاطوم سے رات کے کسی بھی وقت پروگریس رپورٹ مانگنی شروع کر دی۔ آخر موساد کے سربراہ کو وزیر اعظم کے دباؤ کے سامنے سر جھکانا پڑا۔ اس نے دوسرے مراکز اور سٹیشنوں سے اپنے جاسوس اور مخبر بلانے شروع کر دیئے اور بی بی کی خواہش کے مطابق نئے سرے سے ایکشن پلان ترتیب دینا شروع کر دیا۔ یاطوم ایک سخت جان فرد ہے لیکن فوری اور برق رفتاری سے ایکشن لینے میں وہ بی بی کا پاسنگ بھی نہیں ہے اور بی بی نے اپنی انٹی بے ریڈ کی بابت باتیں شروع کر دی تھیں کہ کتنی تیزی اور پھرتی سے اس نے اپنے بھائی کی مدد سے مشن مکمل کیا تھا۔ حالانکہ دونوں مشنوں کا کوئی تقابل ہی نہیں تھا۔

9 ستمبر (1997) کو تل ابیب میں خبر پہنچی کہ حماس نے پھر حملہ کیا ہے۔ اس مرتبہ انہوں نے اردن کے دارالحکومت امان میں نئے کھولے گئے اسرائیلی سفارتخانے کے کلچرل اتاشی کے دو سکیورٹی گارڈ کو شدید زخمی کیا ہے۔

اس واقعہ کے تین دن بعد جمعہ کے روز شبات کی نماز شروع ہونے سے قبل نیتن یاہو نے یاطوم سے درخواست کی کہ وہ یروشلم میں دوپہر کے کھانے میں اس کے ساتھ شریک ہو۔ دونوں آدمیوں کے کھانے میں سوپ، سلاد اور مچھلی شامل تھی جو انہوں نے بیئر بوتل کے پانی کے ساتھ اپنے شکم میں اتاری۔ وزیر اعظم نے فوراً ہی امان کے حملے بارے بات شروع کر دی۔ "فائرنگ کرنے کے لئے حماس کے دہشت گرد سفارتخانے کے اتنے قریب کیسے آ گئے؟ پہلے سے حملے کا پتہ کیوں نہ چلایا جا سکا؟ اس بارے میں موساد کا امان میں سٹیشن کیا کر رہا تھا؟"

یاطوم نے نیتن یاہو کو یہیں روک دیا اور بتایا۔

"امان میں حماس کے سیاسی ونگ کا کرتا دھرتا خالد مشعل نامی شخص ہے جس نے شہر میں اپنا دفتر بنا رکھا ہے۔ کئی ہفتوں تک مشعل مختلف عرب ملکوں کے سفر پر رہا ہے اور موساد کے امان سٹیشن نے اطلاع دی تھی کہ وہ واپس امان آ گیا ہے"۔

نیتن یاہو کا چہرہ چمک اٹھا۔ "جاؤ اور اسے ختم کر دو اپنے آدمیوں کو امان بھیجو اُسے ختم کر دیں"۔

چھ ہفتے تک ایک ایسے وزیر اعظم کا دباؤ برداشت کرنے کے باوجود جسے ایسے آپریشن کے سیاسی عواقب و نتائج کی کوئی پروا نہ تھی۔ موساد کے سربراہ نے نیتن یاہو پر واضح کر دیا کہ امان میں ایسے آپریشن کے نتیجے میں اردن

کے ساتھ دوستی اور تعاون کے ان تعلقات کا خاتمہ ہو جائے جس کی بنیاد نیتن یاہو کے پیشرو، یزہاک رابن نے رکھی تھی۔ اس کے علاوہ امان میں مشعل کے قتل سے موساد کے اردنی انٹیلی جنس سے تعلقات بھی ختم ہو جائیں گے۔ حالانکہ موساد کو شام، عراق اور فلسطینیوں کے بارے سب سے زیادہ خفیہ اطلاعات اسی ذریعے سے حاصل ہوتی ہیں۔ یاطوم نے تجویز پیش کی کہ بہتر ہوگا کہ مشعل کے دوبارہ امان سے باہر جانے کا انتظار کیا جائے اور بیرون ملک اسے ختم کیا جائے۔

یاطوم کی عقل و دانش پر مبنی باتیں سن کر نیتن یاہو چلانے لگ گیا۔

"بہانے بازی، تم مجھے صرف بہانے بازی کرتے ہوئے بہلا رہے ہو۔ مجھے ایکشن اور نتیجہ چاہئے۔ میں فوری ایکشن چاہتا ہوں۔ عوام ایکشن چاہتے ہیں۔ عنقریب روش ہشانہ (Rosh Hashanah) (عید) آنے والی ہے، میں مشعل کے قتل کی صورت میں اپنے لوگوں کو عید کا تحفہ دینا چاہتا ہوں"۔

اس کے بعد یاطوم کو اپنے ہر چھوٹے بڑے اقدام کے لئے نیتن یاہو سے ذاتی طور پر منظوری لینی پڑتی تھی۔ آج تک کسی اسرائیلی وزیراعظم نے سرکاری سرپرستی میں ہونے والے قتل کے بارے میں اتنی ذاتی دلچسپی نہیں لی تھی۔

خالد مشعل کی عمر 41 سال تھی۔ اس نے مکمل داڑھی رکھی ہوئی تھی اور مضبوط ڈیل ڈول کا مالک تھا۔ وہ ایک انتہائی وفادار اور مخلص خاوند اور سات بچوں کا باپ تھا اور اس کی رہائش بھی کنگ حسین، والئ اردن کے محلے کے قریب ہی تھی۔ وہ انتہائی مہذب، خوش گفتار اور نفیس شخص تھا اور اسلام کی بنیاد پرست تحریک میں وہ کوئی معروف شخص نہ تھا لیکن امان میں موجود موساد کے سٹیشن نے جوڈیٹا جمع کر رکھا تھا اس میں مشعل کو ہی خودکش حملہ آوروں کی قوت محرکہ ظاہر کیا گیا تھا جو اسرائیلی سویلین پر حملے کر رہے تھے۔

مشعل کی نقل و حرکت اور آمدورفت کی نگرانی کی جا رہی تھی، اس کے علاوہ امان میں موساد کے سٹیشن چیف نے اس کی خفیہ طور پر فوٹو اتار کر بھی تل ابیب کو فراہم کر دی تھی۔ یاطوم نے وزیراعظم کو اپنی رپورٹ کے ساتھ اپنی ذاتی رائے بھی دے دی تھی کہ امان میں نیتن یاہو کی طرف سے مشعل کا قتل، دو سال تک دونوں ملکوں کے درمیان کی جانے والی امن کی کوششوں اور موساد اور اردن کی انٹیلی جنس ایجنسیوں کے درمیان تعاون اور معلومات کے تبادلے کے لئے کئے گئے اقدامات کو ملیامیٹ کر دے گا۔

نیتن یاہو نے موساد کے سربراہ کی اس دلیل کو حقارت سے رد کر دیا اور کہا۔ "اس دلیل سے اس مشن کی ناکامی کی بو آتی ہے جو میں کسی صورت برداشت نہیں کر سکتا"۔

اس دوران موساد کی آٹھ افراد پر مشتمل قاتل ٹیم اپنی تیاریوں میں مصروف رہی۔ ان میں سے دو قاتلوں نے روز روشن میں مشعل کو نشانہ بنانا تھا اور باقیوں نے کار سمیت قاتلوں کے بحفاظت بھاگنے میں سہولیات مہیا کرنی تھیں اور پوری ٹیم نے مشن کی تکمیل کے بعد یروشلم کے قریب واقع ایلن بی پل (Allenby Brighe) پار کر کے واپس اسرائیل آ جانا تھا۔

اس قتل کے لئے موساد نے جو اسلحہ استعمال کرنا تھا وہ ایک معمولی چیز تھی۔ یہ کوئی گن یا پستول نہیں تھی یہ اعصاب کو فوراً مفلوج کر دینے والی نروایجنٹ (Nerve Agent) سے بھری ہوئی ایک ٹیوب تھی (ٹوتھ پیسٹ کی ٹیوب کی طرح کی) یہ طریقہ کسی کو قتل کرنے کے لئے کسی اسرائیلی ایجنٹ کی طرف سے پہلی بار آزمایا جا رہا تھا۔ روسی انٹیلی جنس ایجنسی KBG اور روس کے زیر اثر ممالک

میں ایک عرصے سے یہ طریقہ نہایت کامیابی سے عمل میں لایا جاتا رہا تھا۔ ماضی قریب میں جو روسی سائنسدان مہاجر بن کر اسرائیل آ گئے تھے انہیں موساد نے نوکریاں دے کر ان سے یہ ہلاکت خیز گیسیں تیار کروانی شروع کر دی تھیں جس میں تابون (Tabun)، سارن (Sarin) اور سومن (Soman) وغیرہ شامل تھیں۔ جن پر بین الاقوامی معاہدوں کے تحت سخت پابندیاں تھیں۔ جس شخص کو ان کا شکار بنایا جاتا تھا اس کے حواس معطل، جسم مفلوج اور لمحوں میں موت واقع ہو جاتی تھی۔ مشعل کی موت کے لئے اسی طریقے کا انتخاب کیا گیا تھا۔

24 ستمبر 1997ء کو قاتل ٹیم کے ارکان نے امان کے لئے ایتھنز، روم اور پیرس سے فلائیٹس پکڑیں جہاں وہ کئی روز سے قیام کئے ہوئے تھے۔ ٹیم کے کچھ ارکان کے پاس فرانس اور اٹلی کے پاسپورٹ اور دستاویزات تھیں جنہوں نے مشعل کو نشانہ بنانا تھا، ان کے پاس کینیڈا کے پاسپورٹ تھے جن پر ان کے نام بیری بیڈز (Barry Beads) اور سیان کینڈال (Sean Kendall) درج تھے۔ وہ شہر کے انٹرنیشنل ہوٹل میں ٹھہرے، جہاں انہوں نے اپنے آپ کو بطور سیاح متعارف کرایا۔ قاتل ٹیم کے باقی ارکان نے اسرائیلی سفارتخانے میں قیام کیا جو ہوٹل سے تھوڑے ہی فاصلے پر واقع تھا۔ بیڈز اور کینڈال بھی اگلے روز ان میں جا شامل ہوئے۔ دونوں قاتلوں نے ایک دفعہ پھر گیس ٹیوب کا معائنہ کیا۔ دونوں میں سے کسی کو بھی پتہ نہیں کہ ٹیوب کے اندر کون سی نرو ایجنٹ (گیس) بھری گئی ہے۔ ان کا قیاس تھا کہ یہ موت سے قبل خفقان یا دل کی حرکت بند ہونے کا باعث بنے گی۔ انہیں سٹیشن چیف موساد نے مشعل کی تازہ ترین نقل و حرکت سے آگاہ کیا۔

ستمبر 1978ء میں وہ لندن میں تھا جب ایک بلغارین منحرف شہری کو نرو گیس (ایجنٹ) کے ذریعے قتل کیا گیا تھا۔ جارجی مارکوف کو پاس سے گزرنے والے ایک شخص نے اپنی چھتری کی بالائی نوک اس کی ران میں چبھو دی تھی اور وہ فوراً گر کر مر گیا تھا کیونکہ چھتری کی نوک میں ریسن نامی زہر تھا جو ارنڈی کے پودے کے بیجوں سے تیار کیا جاتا ہے اور مارکوف کو شکار کرنے والا KBG، روسی انٹیلی جنس ایجنسی کا کارندہ تھا جو کبھی پکڑا نہیں گیا۔

اپنے قاتلانہ مشن کی کامیابی کا خواب دیکھتے ہوئے بیڈز اور کینڈال آدھی رات کو اپنے ہوٹل واپس آ گئے۔ ہر ایک نے اپنے کمرے میں ہی صبح کے ناشتے کا آرڈر دیا جو کافی، مالٹے کا جوس ڈینش، پیسٹری پر مشتمل تھا۔ اگلی صبح سب سے پہلے بیڈز ہوٹل کی لابی میں نکلا اور اپنے لئے بک کی گئی دو گاڑیوں میں سے ایک گاڑی، نیلے رنگ کی ٹیوٹا کے کاغذات پر دستخط کئے۔ جلد ہی دوسری گاڑی، ہرے رنگ کی ہنڈائی بھی آ گئی جس کے کاغذات پر کینڈال نے دستخط کئے۔ اس نے ایک استقبالیہ کلرک کو بتایا کہ وہ اور اس کا دوست ملک کے جنوبی حصے کی سیاحت کے لئے جا رہے ہیں۔

10 بجے مشعل اپنی گاڑی میں، جسے اُس کا ڈرائیور چلا رہا تھا، کام پر جانے کے لئے گھر سے نکلا۔ اس کی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر اس کے تین کمسن بچے، ایک لڑکا اور دو لڑکیاں بھی موجود تھے۔ بیڈز (Beads) نے کچھ فاصلہ رکھ کر خفیہ طور پر اپنی کرائے کی گاڑی میں اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ قاتل ٹیم کے دوسرے ارکان اپنی دیگر گاڑیوں میں اسی سڑک پر اِدھر اُدھر موجود تھے۔

جیسے ہی وہ شہر کے گارڈن ڈسٹرکٹ میں داخل ہوئے ڈرائیور نے مشعل کو آگاہ کیا کہ ان کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ مشعل نے کار کے فون سے بیڈز کی کار کا میک اور نمبر امان کی پولیس کے ہیڈ کوارٹر کو آگاہ کر دیا۔ کرائے کی ٹیوٹا قریب سے گزری تو مشعل کے بچوں نے ہاتھ ہلاتے ہوئے اسے بھی مرحبا مرحبا کہا جیسے وہ پاس سے

گزرنے والی دیگر گاڑیوں کے مسافروں کو کہہ رہے تھے۔ موساد کے ایجنٹ نے ان کی طرف توجہ دینا ضروری نہیں سمجھا۔ اگلے لمحے کینڈال کی سبز رنگ کی ہنڈائی کار ڈرائیور سے آگے نکلی اور دونوں کاریں شہر کی ٹریفک کے ہجوم میں غائب ہوگئیں۔

اگلے لمحے پولیس ہیڈ کوارٹر سے ایک افسر نے مشعل کو فون کر کے بتایا کہ کار کسی کینیڈین سیاح نے کرائے پر لے رکھی ہے۔ مشعل مطمئن ہو گیا اور دوبارہ اپنے بچوں کو دوسرے مسافروں کے لئے ہاتھ ہلاتے ہوئے دیکھ کر خوش ہونے لگا۔ ہر صبح بچے باری باری اپنے باپ کے ساتھ، دفتر جاتے ہوئے کار کی سواری کا لطف اٹھایا کرتے تھے۔ مشعل کو دفتر اتار کر ڈرائیور بچوں کو سکول چھوڑ آیا کرتا تھا۔

10:30 بجے سے کچھ پہلے ڈرائیور واصفی الطال سٹریٹ میں مڑا تو اس نے وہاں حماس کے دفتر کے باہر ایک ہجوم کو اکٹھے ہوئے دیکھا۔ ان لوگوں میں کینڈال اور بیڈز بھی موجود تھے۔ ان کی موجودگی سے کسی نے کوئی خطرہ محسوس نہیں کیا کیونکہ اکثر سیاح "حماس" اور اس کے مقاصد بارے معلومات کی خاطر وہاں آ جایا کرتے تھے۔

مشعل نے جلدی سے اپنے بچوں سے پیار کیا اور انہیں الوداع کہتے ہوئے کار سے باہر نکل آیا۔ بیڈز جلدی سے اس طرح اس کی طرف بڑھا جیسے اس سے ہاتھ ملانا چاہتا ہو۔ کینڈال اُس کے کندھے کے پاس کھڑا پلاسٹک بیگ میں سے کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔

"مسٹر مشعل!" بیڈز نے نہایت مہذب طریقے سے مخاطب کیا۔

مشعل نے اس کی طرف مشکوک نظر سے دیکھا۔ اتنے میں کینڈال نے گیس والی ٹیوب نکال لی اور مشعل کے کان میں سپرے کرنے کی کوشش کی۔

حماس کے رہنما نے فوراً اپنا کان دبا لیا چونک کر دیکھا اور انگلی سے کان کی صفائی شروع کر دی۔ کینڈال نے دوبارہ کوشش کی۔ اتنے میں ہجوم میں ہل چل مچ گئی اور وہ دونوں ایجنٹوں کو پکڑنے کے لئے آگے بڑھے۔

"بھاگو....." بیڈز نے ہیبریو زبان میں کہا۔

آگے بیڈز، پیچھے کینڈال اُس گلی کی طرف بھاگے جہاں بیڈز نے گاڑی پارک کر رکھی تھی۔ مشعل کے ڈرائیور نے جس نے تمام واقعہ دیکھا تھا، وہیں سے گاڑی اس گلی کی طرف موڑ دی تاکہ ٹیوٹا کا راستہ روک سکے۔ مشعل لڑکھڑا رہا تھا اور کراہ رہا تھا۔ لوگ اسے سہارا دے رہے تھے تاکہ وہ گرنے نہ پائے۔ دوسرے ایمبولنس کے لئے دہائی دے رہے تھے۔

بیڈز جس کے ساتھ کینڈال بھی اب تک آدھی استعمال کی گئی زہر کی ٹیوب تھامے ہوئے تھا، ڈرائیور کی گاڑی کی ٹکر سے بچنے کے لئے گلی کی دوسری طرف کار کو بھگائے لئے جا رہا تھا۔ دوسری کاریں اُس کا پیچھا کر رہی تھیں۔ ایک ڈرائیور کے پاس سیل فون تھا۔ وہ سڑک بلاک کرنے کے لئے کالیں کر رہا تھا۔ مشعل کا ڈرائیور پولیس ہیڈ کوارٹر سے رابطے کے لئے اپنا کار فون استعمال کر رہا تھا۔

اب تک قاتلوں کی امدادی ٹیم کے ارکان بھی پہنچ گئے تھے۔ ان میں سے ایک نے بیڈز کو اشارہ کیا کہ وہ اپنی کار چھوڑ کر اس کی کار میں آ جائے۔ موساد کے دونوں

تصحیح

شمارہ جولائی 2014ء میں کہانی "فاختہ اور دلِ دریدہ" کا آخری پیرا اس طرح پڑھا جائے — "فاختہ کی لاش ناصر کے ساکت مُردہ دل کے برابر پڑی تھی"۔ (ادارہ)

ایجنٹ اپنی کار سے باہر کود ے ایک دوسری کار نے ان کا راستہ روک لیا۔ اس کار میں سے کئی مسلح افراد باہر نکلے۔ انہوں نے بیڈز اور کینڈال کو زمین پر گرا لیا۔ لمحے بھر بعد پولیس پہنچ گئی۔ یہ احساس ہوتے ہی کہ اب ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ امدادی قاتل ٹیم کے ارکان وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے اور بغیر کسی رکاوٹ کے واپس اسرائیل پہنچ گئے۔

بیڈز اور کینڈال بدقسمت ثابت ہوئے۔ انہیں سینٹرل پولیس ہیڈ کوارٹر لے جایا گیا۔ انہوں نے وہاں پر اپنے کینیڈین پاسپورٹ پیش کئے اور اصرار کیا کہ انہیں کسی گہری سازش کا حصہ بنایا گیا ہے۔ اردن کے کاؤنٹر انٹیلی جنس چیف سمیع بطیخی کی آمد نے ان کے جھوٹ کا پول کھول دیا۔ اس نے بتایا کہ "وہ جانتا ہے کہ وہ کون ہیں۔ اس کی ابھی ابھی امان میں موساد کے اسٹیشن چیف سے فون پر بات ہوئی ہے اور سپائی ماسٹر نے اعتراف کر لیا ہے کہ یہ اُس کے آدمی ہیں۔ اب اسرائیل شاہ اردن کے ساتھ ان کے بارے میں معاملات طے کرے گا"۔

بطیخی نے حکم دیا کہ موساد کے دونوں ایجنٹوں کو الگ الگ کال کوٹھریوں میں بند کیا جائے لیکن انہیں کسی قسم کا نقصان نہ پہنچایا جائے۔

اس دوران مشعل کو امان کے مرکزی ہسپتال کے انتہائی نگہداشت یونٹ میں داخل کرا دیا گیا تھا۔ اس کی شکایت تھی کہ اس کے بائیں کان میں مسلسل گھنٹیاں بج رہی ہیں (اس میں زہر ڈالنے کی کوشش کی گئی تھی) اور کپکپی طاری ہے جیسے پورے جسم سے بجلی کا کرنٹ گزر رہا ہو اور سانس لینے میں دشواری پیدا ہو رہی ہے۔ (زہر کان کے اندر تک نہیں پہنچا تھا ورنہ دماغ ماؤف ہونے سے فوری موت واقع ہو سکتی۔ کان کے باہر بہنے کے بھی زہر کے کس قدر شدید اثرات تھے)۔

ڈاکٹروں نے مشعل کو لائف سپورٹ سسٹم پر ڈال دیا تھا۔

امان سے موساد کے اسٹیشن چیف نے اسرائیلی سفارتخانے کے خفیہ فون سے اپنے چیف اور ڈائریکٹر جنرل موساد یاطوم کو اس آپریشن کی ناکامی کی اطلاع دے دی تھی۔ دونوں افراد، اسٹیشن چیف اور یاطوم غصے سے پاگل ہو رہے تھے۔

جب یاطوم اس ناکامی کی اطلاع دینے وزیراعظم کے دفتر پہنچا، نیتن یاہو کو پہلے ہی کنگ حسین کا ہاٹ لائن پر جو دونوں لیڈروں کے درمیان ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کے لئے قائم تھی، فون کال آ چکی تھی۔ فون کال کا لب ولہجہ کیسا تھا، اس کا انکشاف بعد میں ایک انٹیلی جنس افسر نے کیا۔

شاہ حسین نے بی بی سے دو سوال پوچھے تھے۔

"وہ حرامی کون سا کھیل کھیل رہا ہے؟"۔ اور "نرو گیس کا کوئی توڑ (علاج) ہے؟" والیٔ اُردن نے انتہائی اشتعال اور غصے میں کہا۔

"میں اپنے آپ کو ایک ایسا آدمی محسوس کر رہا ہوں جس کے انتہائی با اعتماد دوست نے میری بیٹی کی عزت لوٹی ہو۔ اگر نیتن یاہو اس سارے معاملے کی تردید کرنے کی سوچ رہا ہو تو اُسے معلوم ہونا چاہئے اس کے دو جاسوس ہمارے قبضے میں ہیں جو ویڈیو کیمرہ کے سامنے اپنے جرم کا اعتراف کر چکے ہیں اور یہ ویڈیو ٹیپ میڈلین البرائٹ، امریکن سیکرٹری آف سٹیٹ (وزیر خارجہ) کے ملاحظہ کے لئے واشنگٹن روانہ کر دی گئی ہے"۔

اب نیتن یاہو اپنے ٹیلیفون کے اوپر اس طرح جھکا بیٹھا تھا جیسے اس کی گردن کسی نے مروڑ دی ہو۔ اس کا رنگ ایسے سفید ہو رہا تھا جیسے اس کے جسم کا سارا خون کسی نے نچوڑ لیا ہو اور اس کی شکل ایسے ہو رہی تھی جیسے اس کا ہاتھ کسی بھاری پتھر کی سِل کے نیچے آیا ہُوا ہو۔

نیتن یاہو اسی وقت جہاز پکڑ کر صورت حال کی

کنگ حسین کے سامنے وضاحت کے لئے امان جانا چاہتا تھا لیکن شاہ حسین نے صاف کہہ دیا۔ "میرے پاس ضائع کرنے کے لئے وقت نہیں ہے"۔

اردن سے آنے والی ہر فون کال کا لہجہ اب دھمکی آمیز ہوتا تھا۔ نیتن یاہو اس وقت بھی احتجاج نہ کر سکا جب شاہ حسین نے اسے حکم دیا کہ اب وہ اسرائیلی قید خانوں سے حماس لیڈر شیخ احمد لیسین سمیت دوسرے فلسطینیوں کو رہا کر دے۔ یہ فون کال صرف چند منٹ کی تھی۔ یہ بی بی کی سیاسی زندگی کا غالباً سیاہ ترین وقت تھا۔

اب وقت کا دھارا اپنا رخ خود متعین کر رہا تھا۔ ایک گھنٹے کے اندر اسرائیل کا ایک ملٹری جہاز نروگیس کا توڑ یا علاج کی دوا لے کر امان پہنچ چکا تھا۔ اس سے مشعل کا علاج شروع ہو گیا اور وہ چند دن میں اس قابل ہو گیا کہ اس نے پریس کانفرنس سے خطاب کیا جس میں موساد کے گھناؤنے کردار کو خوب بے نقاب کیا۔ امان میں موساد کے سٹیشن چیف اور بطحی کے درمیان ایک مختصر میٹنگ ہوئی جس کے دوران انہوں نے فون پر یاطوم سے بھی بات کی۔ موساد کے ڈائریکٹر جنرل نے فوراً اس بات کا وعدہ کر لیا کہ آئندہ کبھی بھی اردن کی سرزمین پر موساد کی طرف سے کسی کو قتل کرنے کی کوشش نہیں کی جائے گی۔

اگلے روز امریکن وزیر خارجہ میڈلین البرائٹ نے نیتن یاہو کو دو مختصر ٹیلیفون کالیں کیں اور بی بی کو بتایا کہ وہ تمام معاملے کو خوب سمجھتی ہیں۔ اس کا لب ولہجہ بھی تلخ و ترش اور کنگ حسین جیسا ہی تھا۔

کینیڈا کو جب پتہ چلا کہ اسرائیلیوں نے اس کے جعلی پاسپورٹ ایک قتل کے منصوبے کی تکمیل کے لئے استعمال کیے ہیں تو احتجاجاً اسرائیل سے اپنا سفیر واپس بلا لیا۔ صرف اتنی رعایت برتی کہ سفارتی تعلقات بالکل ختم نہیں کئے۔

جب اس واقعے کی تفصیلات اسرائیلی اور بین الاقوامی پریس میں آنی شروع ہوئیں تو نیتن یاہو کے لئے پریس والوں سے منہ چھپانا مشکل ہو گیا اور اسرائیلی افسروں نے استعفے دے دیئے۔

ایک ہفتے کے اندر اندر ہی حماس کے رہبر و رہنما شیخ احمد لیسین کو رہا کر دیا گیا اور غزہ میں ان کا فقیدالمثال استقبال کیا گیا۔ بدلے میں بیڈز اور کینڈال بھی اپنے کینیڈین پاسپورٹ کے بغیر واپس اسرائیل کے حوالے کر دیئے گئے۔ ان کے پاسپورٹ امان میں کینیڈا کے سفارتخانے کے حوالے کر دیئے گئے تا کہ محفوظ رہیں اور بوقتِ ضرورت کام آئیں۔

ان دونوں ایجنٹوں کو پھر کبھی قتل کے مشن میں شامل نہیں کیا گیا۔ انہیں موساد ہیڈ کوارٹر میں کسی معمولی کلرک کا کام دے دیا گیا تھا۔ ایک اسرائیلی انٹیلی جنس افسر نے بتایا۔ "وہ دونوں بلڈنگ کے بیت الخلاؤں کی سیکورٹی کے انچارج تھے"۔

اس واقعے کے بعد موساد کا ڈائریکٹر جنرل یاطوم محض "لنگڑی بطخ" بن کر رہ گیا تھا۔ اس کے سینئر افسروں کا خیال تھا کہ وہ نیتن یاہو کے غلط اور ناجائز دباؤ کے سامنے ڈٹ جانے میں ناکام رہا۔ موساد کے لئے کام کرنے والے جاسوسوں اور مخبروں کے حوصلے پست ہو گئے تھے۔ وزیراعظم کے دفتر کی طرف سے یہ افواہ پھیلائی شروع کر دی گئی کہ یاطوم آج گیا کہ کل۔ اس کے اپنے محکمے کے اندر اس کی مخالفت اور کردار کشی شروع ہو چکی تھی۔ اس نے کچھ عرصہ یہ صورت حال برداشت کی پھر فروری 1998ء میں خود ہی استعفیٰ دے دیا۔ وزیراعظم نیتن یاہو نے اسے روایتی قسم کا وہ خط بھی نہیں لکھا جس میں جانے والے کے کام کی تعریف اور خدمات کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

(جاری ہے)

"میں چلے جانے کے لئے نہیں آیا نوری! میں یہیں دفن ہونے کے لئے آیا ہوں جہاں تم نے میرے ہاتھ کا لکھا ہوا اسٹد لیس دفن کیا تھا"۔

☆ تحریر: شفاعت احمد / انتخاب: محمد صدیق۔ جنڈ، چونیاں

"ہاں میں ہی نوری ہوں"۔ بڑھیا نے کھاٹ کو نیم کے پیڑ تلے گھسیٹ کر لاتے ہوئے کہا۔ "تم میرا نام سُن کر شاید چونک اُٹھے ہو۔ بیٹھ جاؤ۔ میں نے عمر کے ستر برس اس پیڑ تلے بیٹھے گزار دیے ہیں۔ تم حیران ہو رہے ہو کہ میرا نام نوری کیوں ہے۔ بجھی بجھی، زرد پیلی آنکھوں، سفید راکھ جیسے بالوں اور زرد چہرے پر عمر کی بکھری ہوئی گہری لکیروں پر میرا نام کچھ اچھا تو نہیں لگتا لیکن میں پیدا ہوئی تو ماں باپ نے مجھے نوری کہا تھا۔ وہ مجھے نوری کہتے کہتے مر گئے ہیں۔ میں مر جاؤں گی تو لوگ بھی کہیں گے کہ نوری مر گئی ہے، کبھی میری آنکھوں میں بھی نور تھا۔ کچھ ایسا ہی نور میرے رخساروں پر بھی تھا۔ اب نوری رہ گئی ہے، نور مر گیا ہے...... تم ذرا اچھی طرح بیٹھ جاؤ نا۔ تمہارے ہاتھ کانپ رہے ہیں، عمر کی بات ہے۔ میں جانتی ہوں ان ہاتھوں سے تم نے بھی پانچ من کی سل بھی اٹھالی ہوگی مگر آج تمہارے ہاتھ تمہاری پتلی پتلی انگلیوں کا بوجھ بھی نہیں سہار سکتے۔ تمہاری عمر مجھ جتنی ہوگی؟ یہی کوئی ستر بہتر برس"۔

"تم یہاں کیوں آئے ہو؟" بڑھیا نے پوچھا۔ "میں نے تمہیں پہلے تو کبھی نہیں دیکھا...... شاید تم آگے جا رہے تھے اور ذرا ستانے کو نیم کے پیڑ تلے آرکے ہو!"

بوڑھے نے آنکھیں موند لیں۔ اُس کے چہرے پر عمر کی لکیریں اور گہری ہوگئیں۔ اُس کی پلکوں کو جنبش سی ہوئی اور اُس نے اَدھ کھلی آنکھوں سے نوری کو دیکھا۔

"ہاں نوری!" بوڑھے نے کہا۔ "ذرا نیم کے پیڑ تلے ستانے آرکا ہوں۔ تھک گیا ہوں۔ منزل جتنی قریب آرہی ہے، مسافت اتنی ہی کٹھن ہوتی جارہی ہے۔ اب اور آگے جانے کی ہمت نہیں۔ دل ساتھ نہیں دے رہا، روح شل ہوگئی ہے"۔

"تمہیں میرا نام کس نے بتایا تھا؟" نوری نے پوچھا۔ "تم نے پوچھا تھا نا، نوری تم ہی ہو؟"

"بہت مدت ہوئی تمہارا نام سنا تھا"۔ بوڑھے نے تھکی تھکی آواز میں کہا۔ "بہت ہی مدت گزر گئی ہے جب تمہارا نام سنا تھا"۔

"کب؟"

"جب میں پانچ من کی سل اٹھا لیا کرتا تھا"۔ بوڑھے نے پھیکی سی مسکراہٹ سے کہا اور پوچھا۔ "تم اکیلی رہتی ہو یہاں؟"

"نہیں تو"۔ بڑھیا بولی۔ "صبح اور شام کے وقت لوگوں کے بچے قرآن پڑھنے آتے ہیں۔ جب چلے جاتے ہیں تو نیم کے اس پیڑ سے باتیں کرنے لگتی ہوں۔ اس کی عمر بھی ہم دونوں جتنی ہے لیکن تم کہہ سکتے ہو کہ میں یہاں اکیلی رہتی ہوں"۔

"کب سے اکیلی ہو؟"

"لگتا ہے ساری عمر اکیلے بیت گئی ہے"۔ بڑھیا نے کہا۔ "لیکن میں نے وقت کے لمحوں کو دُور نہیں جانے دیا۔ ایک ایک لمحے کو نیم کے پتوں میں سموتی رہی ہوں۔ اس کی بھینی بھینی بُو میں میری جوانی کی بُو باس رچی ہوئی ہے۔ جب پت جھڑ میں سوکھے پتے ایک ایک کر کے آنگن میں گرتے ہیں تو ان کی 'بس، بس' کی آواز میں مجھے اپنی سسکیاں سنائی دیتی ہیں اور جب سوکھی ڈالیوں سے کونپلیں پھوٹتی ہیں اور پیڑ گھنیری چھاؤں والی ہری چھتری بن جاتا ہے تو میری بوڑھی ضعیف ذات میں کوئی بڑے ہی میٹھے سُروں میں جوانی کے وہی گیت گنگنانے لگتا ہے جو میں نے نہ جانے کس کی محبت میں گائے تھے"۔

"تمہیں یہ بھی یاد نہیں رہا کہ تمہیں کس سے محبت تھی؟"

'اتنا ہی یاد ہے کہ دل میں محبت تھی۔ یوں جانو کہ محبت کا ایک پیغام جو کسی کو دے نہ سکی۔ عمر بیت گئی۔ تم سنو

نا ..... میں تمہیں نیم کے پیڑ کی کہانی سنا رہی تھی......

"اور جب ساون میں نیم کی نمبولیاں پکتی ہیں تو محلے بھر کے بچے دن بھر پیڑ پر چڑھے چڑیوں کی طرح چہکتے رہتے ہیں۔ پھر میرا بچپن لوٹ آتا ہے۔ میں بھول جاتی ہوں کہ میں اکیلی ہوں۔ میں تمہیں اپنی جوانی کی کوئی تصویر نہیں دکھا سکتی۔ میرے ذہن میں جھانکو تو ذرا..... میرے گھنیرے ریشمی بالوں، دہکتے گالوں اور شرمائی لجائی چال ڈھال کو دیکھ کر پانچ من کی سل اٹھانے والے کنکھیوں دیکھا کرتے تھے اور نہ جانے مجھے ان پر غصہ کیوں نہیں آتا تھا؟......

"اس الہڑ مٹیارن کا نام نوری تھا۔ میں تو اس نوری کا سایہ ہوں جسے ڈوبتے سورج کے ساتھ گھپ اندھیری رات میں گھل مل جانا ہے۔ سکھی سہیلیاں مجھے کہا کرتی تھیں، نوری! تیری جوانی تو قیامت ہے لیکن میری جوانی نے جو قیامت میرے ماں باپ کے سینے میں بپا کی تھی وہ تو کوئی بھی نہ دیکھ سکا تھا۔ لانبے قد اور گول گول بانہوں والی نوری کو آہیں بھر بھر کے دیکھنے والے کسی بھی چھیل چھبیلے کو خدا نے ہمت نہ دی کہ میری جوانی نے میرے ماں باپ کے سینے پر جو پانچ من کی سل رکھ دی ہے، ذرا اسے اٹھا کر پرے کر دے۔ پر ایسا نہ ہوا......

"تم لیٹ جاؤ نا! کہتے تھے تھک گیا ہوں۔ میں نے اتنی باتیں کبھی نہیں کیں۔ کروں بھی کس سے؟ باتیں سننے کے لئے تمہاری طرح کون پاس آ کے بیٹھتا ہے۔ رات کو دیا جلتا چھوڑ دیتی ہوں، شاید کوئی تھکا ماندہ مسافر دم بھر کو میری کٹیا میں رُک جائے۔ کچھ اپنی کہے، کچھ میری سنے، پر کون آتا ہے یہاں۔ آج تم آئے ہو تو اس دھوکے میں اپنی کہانی چھیڑ بیٹھی ہوں جیسے تم میری کہانی ہی تو سننے آئے ہو یہاں"۔

"کہانی ہی تو سننے آیا ہوں نوری!" بوڑھے نے لرزتی آواز میں کہا۔ "کیوں نوری! تمہاری جوانی تمہارے باپ کے سینے پر پانچ من کی سل بن کے گری، پھر کیا ہوا؟ وہ سل کس نے اٹھائی تھی؟"

"کسی نے بھی نہیں"۔ بوڑھی نوری نے کہا۔ "میرا باپ ڈاکیہ تھا جسے خدا نے ایک بچی اور سرکار نے ایک وردی دے دی تھی۔ وردی بھی اور بچی بھی اس کے ساتھ چپکی اسے دیمک کی طرح کھاتی رہیں۔ میرا باپ خاکی پتلون اور خاکی کوٹ پہن کر اور سر پر خاکی پگڑی لپیٹ کر صبح ہی صبح گھر سے نکل جاتا تھا۔ کئی بار مرمت کیے ہوئے جوتے گھسیٹتا سارا دن گلی گلی، گھر گھر گھومتا اور خط تقسیم کرتا رہتا تھا۔ میرا باپ لوگوں کے لئے مجسم پیغام تھا۔ محبت کا بھی، نفرت کا بھی، مسرت کا بھی، ملال کا بھی......لوگوں کو وصال کے سندیس دیتا تھا، وفات کے بھی، اس کے تھیلے میں پھول بھی تھے، پتھر بھی، مگر وہ اپنی بچی کے لئے کبھی کوئی سندیس نہ لایا، کبھی کوئی نیلا لفافہ نہ لایا جس میں عطر رچا بسا ہوتا۔ وہ خود ہی میرے لئے پیار کا سندیس تھا۔ شام کو تھکا ماندہ گھر آتا تھا تو میں دوڑ کر اس سے لپٹ جاتی تھی اور وہ میرے گالوں پر تھپکیاں دے کر سینے سے لگا لیا کرتا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ جایا کرتی تھی۔ اس کے پاس اس بے ساختہ مسکراہٹ کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ لوگوں میں سینکڑوں ہزاروں روپے تقسیم کرنے والا ڈاکیہ میرے لئے دو چار پیسوں کی ریوڑیاں خرید لانے سے بھی معذور تھا......

"پھر وہ مجھے گودی سے اتار دیا کرتا تھا مگر اس کی چال ڈھال ایسی ہوتی تھی جیسے وہ میرے بوجھ سے تھک گیا ہو۔ ماں چولہے چوکے میں جتی رہتی تھی یا محلے کے بچوں کو قرآن پڑھایا کرتی تھی۔ بس ایسے ہی میں نے بھی قرآن پڑھ لیا تھا۔ دھن والوں کی بچیاں ہنستی کھیلتی سکول جایا کرتی تھیں اور میں کھڑی انہیں دیکھا کرتی اور سوچا کرتی تھی کہ یہ اس لئے سکول جا سکتی ہیں کہ ان کے باپ ڈاکیے نہیں۔ میں نے ایک بار ماں سے کہا کہ مجھے بھی

سکول داخل کر دو لیکن ماں نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا تھا۔ نہ، نہ، نہ سکول جا کر دین ایمان برباد ہو جاتا ہے۔ اچھی بچیاں گھر قرآن پڑھ لیا کرتی ہیں...... تم جانو، غریب یوں ہی اپنے آپ کو فریب دے لیا کرتے ہیں۔ جو چیز لکھنے والے نے نصیب میں ہی نہ لکھی ہو، ہم غریب اُسے اپنے لئے حرام قرار دے لیتے ہیں......

"بس یہ تھی ہماری زندگی جس میں کبھی کوئی تبدیلی نہ آئی۔ کولہو کے گرد ایک چکر تھا جس پر ہمارا کنبہ گھومتا رہا اور گھومتا ہی رہا مگر یک لخت ایک انقلاب آ گیا۔ میں جوان ہو گئی اور ایک شام باپ گھر آیا تو میں پہلے کی طرح دوڑ کر اُس کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ باپ نے میرے گال تھپکانے کو ہاتھ بڑھایا مگر ہاتھ یوں روک لیا جیسے میرے گال انگارے بن گئے ہوں۔ باپ کھسیانی سی ہنسی ہنس دیا اور اُس کے تھکے ہوئے چہرے کا رنگ بدل گیا......

"اُس رات میں نے لحاف میں چھپ کر اپنے گال کو ہاتھ لگایا تو گال تپ رہا تھا۔ انگارے کی طرح ...... پھر میرے اور باپ کے درمیان ایسی دیوار حائل ہو گئی جسے میں محسوس کرتی تھی، دیکھ نہ سکتی تھی۔ میری ماں نے میرے بچپن اور میرے درمیان ٹاٹ کا ایک پردہ حائل کر دیا...... دروازے پر لٹکے ہوئے ٹاٹ کے پردے نے میرے ذہن کو سوالوں سے بھر دیا۔ ان میں سب سے زیادہ پریشان کرنے والا سوال یہی تھا کہ میرے ذہن میں اتنے ڈھیر سارے سوال ایک ہی بار کیوں آ گئے ہیں؟......

"میری جوانی نے میری ماں کو شکی مزاج بنا دیا۔ ٹاٹ کا پردہ پتھروں کی دیوار تو نہیں تھا۔ میں کسی سہیلی کے گھر چلی ہی جایا کرتی تھی اور یہی وہ وقت ہوتا تھا جب پانچ من کی بیل اٹھانے والے جوان مجھے گھورا کرتے، مسکرایا کرتے، آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ کہہ جایا کرتے اور میں شرمائی لجائی سی، سہیلی کے گھر جا پہنچتی مگر مجھے غصہ نہیں آیا کرتا تھا۔ وہ مجھے چھیڑتے نہیں تھے، آج کل کے لڑکوں بالوں کی طرح گندے گندے بول نہیں گاتے تھے۔ آوازے نہیں کستے تھے۔ پر اُن کی کسمسی سی انگڑائیاں اتنا ضرور کہہ جاتی تھیں۔ 'نوری! تم ہمیں اچھی لگتی ہو۔ کبھی کبھی قریب سے گزر جایا کرو'۔ اور میں بھی سوچتی تھی کہ یہ لوگ دیوار کے سائے تلے کھڑے میرا کیا بگاڑ لیتے ہیں۔ بس دیکھ لیتے ہیں...... پر تمہیں سچی بات بتا دوں...... دل یوں مچلتا تھا کہ میں ان کے قریب سے گزرتی رہوں اور وہ مجھے دیکھتے رہیں اور کبھی دل یوں بھی مچلتا تھا کہ میں بھی انہیں دیکھوں مگر نظر ملتی تھی تو بدن میں گدگدی سی ہوتی تھی۔ پھر نظریں آپ ہی آپ جھک جاتی تھیں......

"ہاں تو میں کیا کہہ رہی تھی؟ تم مجھے یاد دلاتے چلو نا چپ کیوں بیٹھے ہو...... تم نے بھی شاید مجھے کبھی دیکھا ہو گا؟"

"دیکھا تھا نوری!" بوڑھے نے یوں آنکھیں موند لیں جیسے مرجھائی ہوئی پلکوں کی تیرگی میں نوری کے گئے گزرے حسن و جوانی کو دیکھ رہا ہو۔ خواب ناک آواز میں بولا۔ "تم اپنی ماں کی بات کر رہی تھی نا کہ تمہاری جوانی نے اُسے شکی مزاج بنا دیا تھا"۔

"ہاں!" نوری نے کہا۔ "ماں نے مجھے اُن باتوں سے بھی آگاہ کر دیا تھا جو مجھ سے یا میرے جسم سے ہی متعلق تھیں مگر میں ان سے آگاہ نہیں تھی۔ جہاں دوپٹہ سر سے ڈھلکا اُس نے ڈانٹ کر کہہ دیا۔ 'کیا بے حیاؤں کی طرح زلفیں بکھیر رکھی ہیں، ڈھک لے انہیں'۔ اور میں جان گئی کہ زلفیں جوان لڑکی کے حُسن کا ایک حصہ ہوتی ہیں جو ہر کسی کو دکھاتے پھرنا اچھا نہیں اور جب ماں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ دوپٹہ ذرا سینے پر اچھی طرح پھیلا کے رکھا کر تو مجھ پر کچھ ایسے راز افشا ہوئے جو میں اپنے

آپ سے بھی چھپانے لگی اور جب ماں نے مجھے عمر قید کا حکم سناتے ہوئے کہہ دیا کہ اب باہر نہ جایا کر، گلیوں میں موئے مسٹنڈے دیدے پھاڑے کھڑے دیکھتے ہیں تو میں ٹاٹ کے پردے کے پیچھے قید ہوگئی مگر میرے تصور وہ کو کوئی گرفتار نہ کر سکا...... تم جانو، تصور تنہائی کے ساتھی تو ہوتے ہیں پر ہوتے فریب ہی ہیں۔ میری جوانی چٹان ایسی حقیقت تھی جس سے بڑے بڑے حسین فریب ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہوگئے......

"اور پھر ایک روز میرا باپ اپنی زندگی کی پہلی اور آخری چٹھی اپنے گھر بھی لے آیا۔ میں اتنا ہی سن سکی کہ میرے باپ نے رازداری سے میری ماں سے کہا۔'اُن کی چٹھی آئی ہے۔ ہمارے گھر میں چٹھی کا آنا میری جوانی سے کہیں زیادہ اہم اور انوکھا واقعہ تھا۔ میں پوچھنے ہی لگی تھی کہ امی، ابا کس کی چٹھی لائے ہیں کہ ماں نے مجھے کہا۔ ...... ذرا...... ابو کے لئے چائے بنا دے، ہمارے گھر میں شام کی چائے بھی ایک واقعہ ہُوا کرتی تھی۔ اُس روز یہ واقعہ ایک عرصے بعد رُونما ہُوا تو میں سمجھ گئی کہ چٹھی میں کوئی ایسی بات لکھی ہے جو میرے جاننے والی نہیں۔ میں جانا نہ چاہتے ہوئے بھی چولہے پر جا بیٹھی اور اپنے ماں باپ کی کھسر پھسر سنتی رہی......

"میں نے رات ماں سے پوچھ ہی لیا کہ کس کی چٹھی ہے؟ ماں نے بتایا کہ کل کوئی مہمان آنے والے ہیں۔ پھر اُس نے مجھے دُھلے کپڑے پہننے، آنکھوں میں کاجل اور سر میں تیل ڈالنے کی تاکید کی۔ یہ بھی کہا کہ وہ آئیں تو اُن کے سامنے سگھڑ بیٹیوں کی طرح اٹھنا بیٹھنا۔ کوئی ایسی حرکت یا بات نہ کرنا جس سے وہ کہہ بیٹھیں کہ کیسی اجڈ لڑکی ہے۔ دیکھ، یہ تیرے ابا کی عزت بے عزتی کا سوال ہے......

"اگلی صبح ہمارے گھر میں اتنی صفائی ہوئی جو کبھی عید پر بھی نہ ہوئی تھی۔ میں نے عید والے کپڑے پہنے۔

ماں نے اپنے ہاتھوں سے میری کنگھی کی، میری آنکھوں میں کاجل ڈالا اور مجھے اس طرح سر سے پاؤں اور پاؤں سے سر تک دیکھا کہ میں حیران بھی ہوئی اور پریشان بھی۔ میں اُس وقت نادان تھی، کچھ سمجھ بھی گئی، کچھ نہ بھی سمجھ سکی مگر آج سوچتی ہوں تو کچھ بھی سمجھ نہیں آتا کہ ہم اپنی بیٹیوں کو اپنے ہاتھوں سجا سنوار کر نمائش کے لئے غیروں کے سامنے کھڑا کرتے ہیں اور انہیں کہتے ہیں، دیکھ، تیرے ابا کی عزت بے عزتی تیرے ہاتھ ہے......

''بس، تم جانو، ایسی ہی نمائش میری ہوئی۔ ہماری مہمان دو عورتیں تھیں۔ ایک تو سوکھی سڑی اور دوسری اتنی موٹی جیسے دوسری عورت کی روزی بھی اللہ نے اسی کے نام لکھ دی ہو۔ مجھے ماں نے دوسرے کمرے سے بلایا تو میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ قدم بوجھل ہو گئے۔ بدن کانپنے لگا اور میں خواب میں چلنے کی طرح چلتی ہوئی مہمانوں کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ یاد نہیں میں نے انہیں سلام کیا تھا یا نہیں۔ میرے کانوں میں ایک عورت کی آواز پڑی۔ 'اچھا، یہ ہے نوری'۔ ماں نے کہا۔ 'بیٹھ جاؤ'۔ اور میں کھاٹ پر بیٹھ گئی۔ موٹی عورت نے کہا۔ 'اٹھو تو ذرا'۔ میں اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس نے سوکھی سڑی عورت سے کہا۔ 'قد کاٹھ تو اچھا ہے'۔ سوکھی سڑی عورت نے پوچھا۔ 'عمر کتنی ہے؟' ماں نے ذہن پر زور دیا، آنکھیں موندیں اور رُک رُک کر بولی۔ 'میری شادی کے چار سال بعد پیدا ہوئی تھی۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب امرتسر میں گولی چلی تھی اور گوروں نے دیسیوں پر بڑا ظلم کیا تھا'۔ موٹی عورت نے کہا۔ 'پھر سال دو سال کم ہی کی کہو نا'۔ میری ماں نے کہا۔ 'سلائی بنائی خوب کرتی ہے'۔ سوکھی سڑی عورت نے پوچھا۔ 'لگائی بجھائی تو نہیں کرتی؟'۔ 'نہ جی، اس بے چاری کے منہ میں تو زبان ہی نہیں'۔ ماں نے کہا......

''تم نے کبھی قصائی کو بکرا خریدتے دیکھا ہے؟ ......تم اس موٹی بھدی اور سوکھی سڑی عورت کو دیکھ لیتے تو جان لیتے کہ قصائی بکرے کو کیسی نظروں سے دیکھتا ہے...... میرے منہ میں زبان تھی مگر ماں نے جو کہہ دیا تھا کہ اس کے منہ میں زبان نہیں ہے، میں جان گئی کہ میرے باپ کی عزت اسی میں ہے کہ میں فرض کر لوں کہ میرے منہ میں زبان نہیں ہے۔ میں نے ہونٹ بھینچ لئے اور زبان کو دانتوں تلے دبا لیا...... پھر مجھے حکم ملا۔ 'جاؤ'۔ اور میں دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ مجھے اپنی دو سہیلیوں کی باتیں یاد آنے لگیں۔ انہیں بھی اسی طرح کی دو عورتیں دیکھنے آئی تھیں جنہوں نے اسی طرح کی باتیں کی تھیں لیکن سہیلیوں نے مجھے اس کے بعد کی جو کہانی سنائی تھی وہ کسی طلسماتی دیس کی بڑی ہی پیاری داستان تھی۔ وہ ایک شہزادے کی کہانی تھی، خوابوں کا قصہ تھا......

''اور اُس روز میرے ذہن نے بھی ایک شہزادے کو جنم دے کر اس کے گرد رنگ رنگیلے تاروں کا جال تن ڈالا پھر مجھ پر خمار سا طاری ہونے لگا اور ان عورتوں کی گھورتی آنکھیں اور بے مزہ باتیں اچھی لگنے لگیں......

''وہ چلی گئیں۔ شام کے وقت میرا باپ گھر آیا تو اُس نے سوالیہ نگاہوں سے میری ماں کو دیکھا۔ میں نے دونوں کی آنکھوں میں جھانکا۔ ماں کی آنکھوں میں مایوسی کی جھلک تھی۔ وہ کمرے میں سر جھکائے باہر آیا۔ اُس نے میری طرف دیکھا اور آہ بھر کر منہ پھیر لیا۔ میں نے جو تصور تخلیق کیے تھے، وہ ریزہ ریزہ ہو کر ذہن سے گرد کی طرح اڑ گئے۔ طلسماتی دیس کا شہزادہ بھی ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ پھر میرے ذہن کی کوکھ بانجھ ہو گئی اور کسی تصور کو جنم نہ دے سکی......

''دن گزرتے چلے گئے اور میری ماں چپ چاپ آہیں بھرتی رہی۔ باپ کے کندھے کچھ جھکے جھکے سے رہنے لگے۔ میں جان گئی کہ میرا وجود پانچ من کی سل بن گیا ہے جسے بوڑھا اور غریب ڈاکیہ کبھی نہیں، کبھی نہیں

اُٹھا سکے گا۔ تم جانو، محبت اور ملال دو ایسے جذبے ہیں جو کسی رازداں کے بغیر برداشت نہیں ہوتے۔ ماں نے ملال سے گھبرا کر مجھے رازداں بنالیا اور بتایا کہ نوری، تم تو انہیں پسند آ گئی تھیں پر وہ جہیز بہت مانگتے ہیں۔ بیٹی! پیٹ کاٹ کر اڑھائی تین سو روپے جوڑے تھے۔ سوچتی ہوں اس سے زیور بنواؤں یا کپڑے۔ وہ کہتے ہیں، گیارہ جوڑے ریشمی ضرور ہوں۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ ابھی نواری پلنگ بھی نہیں بنا......

"جس نے ساری عمر موٹی خاکی وردی اور کئی بار مرمت کرائے ہوئے جوتوں میں گزار دی تھی، وہ ریشم کے دو جوڑے بھی نہ بنا سکا، وہ نہ نواری پلنگ بنا سکا جس کے پائے لال سُرخ ہوتے ہیں۔ میرے ماں باپ نے اپنا سارا ہی خون نچوڑ ڈالا مگر پلنگ کا ایک پایہ بھی سُرخ نہ ہو سکا۔ ایک رات ماں نجی شاید میں سو گئی ہوں۔ میرے ابا سے کہنے لگی۔ 'عیدوں پر اُن گھروں سے ہو آیا کرو جہاں عید کارڈ تقسیم کرتے ہو۔' میرا باپ پھنکار کر بولا۔ 'مجھے بھیک مانگنے کو کہہ رہی ہو؟ بیٹی کو تمام عمر کنواری بٹھائے رکھوں گا، کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاؤں گا'......

"آج تو تم جانتے ہو کہ ڈاکیے اُن گھروں سے بھی عیدی لئے بغیر نہیں ٹلتے جہاں عید کے روز بھی بچوں کو نئے کپڑے نصیب نہیں ہوتے۔ وقت وقت کی بات ہے"۔

بڑھیا نے بوڑھے کو جھنجھوڑ کر کہا۔ "تم تو سو گئے ہو"۔

"نہیں تو!" بوڑھے نے آنکھیں کھولے بغیر کہا۔ 'بڑے غور سے سُن رہا ہوں۔ تمہارا باپ بھیک نہیں مانگنا چاہتا تھا نا"۔

"آج ہی آج سُن لو۔ تم بھی پھر لوٹ کے نہیں آؤ گے۔ میرے پاس اس کہانی کے سوا اور کچھ بھی نہیں"۔ نوری نے کہا۔ "میری ماں نے مجھے رازداں بنالیا اور ہم ماں بیٹی، اس نیم کے پیڑ تلے بیٹھی دکھ بانٹتی رہتی تھیں۔ میں نے اس چٹھی کو پھاڑ ڈالا اور اس کے پُرزوں کو نیم کے تنے کے ساتھ دفن کر دیا تھا۔ وہ تو میرے خوابوں کے پُرزے تھے جنہیں میں نے اپنے ہاتھوں دفن کر دیا تھا۔ مجھے اُس موٹی عورت اور سوکھی سڑی عورت سے نفرت ہو گئی لیکن اُس مرد سے مجھے نفرت نہ ہوئی جس کے لئے وہ میرا رشتہ لینے آئی تھیں۔ میں نے بارہا سوچا، تنہائیوں میں سوچا، لحاف کے اندھیرے میں اور نیم کی چھاؤں میں بیٹھ کے سوچا جانے وہ کون ہے؟ کیسا ہے؟ اگر وہ خود آتا تو شاید مجھے جہیز کے بغیر ہی ساتھ لے جاتا! پھر مجھے کچھ ایسا محسوس ہونے لگا جیسے وہ میرے لئے آہیں بھر رہا ہو اور ماں سے کہہ رہا ہو کہ نہیں، میں تو نوری سے ہی بیاہ کروں گا۔ جانے کیوں مجھے دکھ سا ہونے لگا کہ جہیز کی خاطر دو دلوں کا خون کر دیا گیا ہے......

"اور کچھ ایسے ہی فریب تھے جو میں اپنے آپ کو دیتی رہی اور نیم کا یہ پیڑ بڑھتا پھولتا رہا۔ اس کی چھتری چوڑی اور گھنیری ہوتی چلی گئی۔ پتے جھڑے بھی، ہرے بھی ہوئے اور ایک روز ایک پڑوسن میری ماں سے کہہ رہی تھی۔ 'نوری بہت بڑی ہو گئی ہے بوا، کوئی غریب غربا گھر دیکھ لو۔' ماں نے کہا۔ 'غریب کلموئے بھی آتے ہیں تو تین ہزار کے زیور کپڑے سے نیچے بات ہی نہیں کرتے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ ہم پانچ ہزار حق مہر لکھوائیں گے تو وہ یہ کہہ کر اُٹھ جاتے ہیں کہ ہمارے ہاں حق مہر کا تو رواج ہی نہیں'۔ ماں نے منہ پرے کر کے آنسو پونچھ ڈالے اور پڑوسن یہ کہہ کر چلی گئی کہ اچھا، ذرا صبر کرو، میں کچھ کرتی ہوں......

"پڑوسن کو کچھ کرتے دو سال بیت گئے، اور ایک بار پھر میری نمائش کی گئی۔ میں جب مہمانوں کے سامنے گئی تو جواب ملا۔ 'لڑکی کی عمر زیادہ ہے'۔ تم جانو، مرد کتنا خود غرض، کتنا کٹھور ہوتا ہے۔ ساٹھ برس کی عمر میں سولہ

برس کی بچی سے بیاہ رچا لیتا ہے اور بچی اٹھائیس برس کی ہو تو کہتا ہے، عمر زیادہ ہے......

"تم بھی کچھ بولو نا! تم بھی مرد ہو۔ اس عمر میں بھی تم اپنے آپ کو بوڑھا نہیں کہو گے مگر اٹھائیس برس کی کنواری لڑکی کو دیکھ کر کہو گے، یہ تو بوڑھی ہو چلی ہے۔ میری عمر اٹھائیس برس کی تھی جب میں رشتے ڈھونڈنے والوں کے لئے بوڑھی ہو گئی تھی۔ میں نے کالے کلوٹے، بھدے، بدصورت مردوں کو بھی کہتے سنا ہے کہ میں تو لڑکی کو دیکھ کر بیاہ کروں گا۔ تم لڑکی کو بھی یہ حق کیوں نہیں دیتے؟ تم اپنی عزت کو لڑکی کی زبان کی نوک پر کیوں رکھ دیتے ہو؟ جب لڑکی اپنی زبان کو دانتوں تلے دے لیتی ہے تو جانو اُس نے تمہاری عزت اور تمہاری ناک کو کاٹ کھایا ہے۔ تم نہ اپنی عزت سے رستے ہوئے خون کو دیکھتے ہو نہ اپنی بیٹی کے ارمانوں سے ٹپکتے ہوئے لہو کو دیکھتے ہو، پر لڑکی دونوں کے خون کو اپنے جگر میں چھپا لیتی ہے اور یہ خون زہر بن کر اُسے اندر ہی اندر کھاتا رہتا ہے۔ وہ گھٹ گھٹ کے مر جاتی ہے پر فریاد نہیں کرتی۔ اُسے جس کے پلے باندھ دو، وہ اُس کے اسی بول پر قربان ہو جاتی ہے۔ 'تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو، مجھے تم سے محبت ہے'۔ وہ ان دو ہی جملوں کی خاطر بچے جنتی ہے، بھٹ جھونکتی ہے اور اپنی جوانی کا رس اور اپنا خون چھاتیوں کے راستے اُس مرد کے بچوں کو پلا دیتی ہے جو اُسے کہتا ہے۔ 'تم مجھے اچھی لگتی ہو، مجھے تم سے محبت ہے'......

"پر میں تو ان دو جملوں کو ترستی ہی رہی اور نیم کا پیڑ بوڑھا ہوتا چلا گیا۔ پھر پت جھڑ میں اس کے پتے میری جوانی کی موت پر سسکیاں بھرتے رہے۔ میرے دروازے پر کوئی بارات نہ آئی۔ میرے آنگن سے ڈولی نہ اٹھی۔ یہاں سے کچھ اٹھا تو وہ میرے باپ کا جنازہ تھا جس نے اتنے پیسے جمع کر لئے تھے کہ گیارہ جوڑے ریشمی کپڑے بنوا لیتا لیکن میں بن بیاہی ماں بن چکی تھی جس کی کوکھ نے کسی انسان کو جنم نہ دیا جس کی تاریک راتیں بارات کی راہ دیکھتے گزر گئیں اور جس کا جسم مرد کے پیار بھرے لمس کو ترستا مرجھا گیا۔ میرے ابا کی چارپائی یہیں رکھی تھی جہاں تم لیٹے ہوئے ہو۔ آج بھی وہ مجھے یہیں لیٹا ہوا نظر آتا ہے۔ گھر گھر مسرت اور ملال کے سندیس دینے والا ڈاکیہ، شکوے شکایتوں کا بے جان اور بے حس سندیس بن کر خدا کے حضور چلا گیا۔ تم تو ستر بہتر کے پیٹے میں آ کے بوڑھے ہوئے ہو مگر میرا باپ پچاس برس جی کر ہی تم سے زیادہ بوڑھا ہو گیا تھا۔ سینے پر پانچ من کی سِل رکھ کر ستر برس کون جی سکتا ہے......

"پھر وہ پیسے جو ماں باپ نے پیٹ باندھ کر میرے جہیز کے لئے جمع کئے تھے، وہ ماں بیٹی نے کھا لئے۔ جب آخری کوڑی بھی پیٹ کی بھٹی میں پگھل گئی تو ماں بھی اسی نیم تلے لیٹ گئی۔ بے جان اور بے حس۔ اُس کی میت جیسے مجھے بہ زبانِ خامشی کہہ رہی تھی۔ 'نوری! اب ٹاٹ کا یہ پردہ اتار پھینک سَر سے دوپٹہ سرک جانے دے۔ تیرے کھچڑی جیسے بالوں کو اب کون رُک رُک کر دیکھے گا'......

"جب لوگ میری ماں کو بھی اٹھا کے لے گئے تو میں بہت روئی، کچھ اس لئے کہ میرے ماں باپ دنیا سے اُٹھ گئے تھے اور زیادہ تر اس لئے کہ میں اس دنیا میں کیوں آئی تھی۔ میری موت کوئی حادثہ نہیں ہو گا، حادثہ تو میری پیدائش تھی......

"ماں تھی تو میں اُس سے دُکھ بانٹا کرتی تھی۔ وہ نہ رہی تو میں نے نیم کے پتوں کو رازداں بنا لیا۔ میں نے اس پیڑ سے بہت باتیں کی ہیں۔ میں مر جاؤں گی تو لوگ کہیں گے کہ نوری مر گئی ہے، اور وہ یہ تو ضرور ہی کہیں گے کہ نوری پگلی تھی، جانے پیڑ کی گھنی شاخوں میں نظریں الجھائے ہنسا کیوں کرتی تھی؟ اور ان شاخوں میں جب فاختہ کا گھونسلا آباد ہو جاتا تھا تو نوری اس پر ٹکٹکی باندھے

جانے رویا کیوں کرتی تھی؟......

"تم مرد ہو۔ تم کبھی نہ سمجھ پاؤ گے کہ عورت ہنستی ہے تو کیوں ہنستی ہے، روتی ہے تو کیوں روتی ہے۔ تم نے کبھی روتی ہوئی مسکراہٹ دیکھی ہے؟ کبھی مسکراتے ہوئے آنسو دیکھے ہیں؟ نہیں دیکھے۔ تم مرد ہو نا۔ تم عورت کا جسم دیکھتے ہو۔ ساٹھ برس کے کھوسٹ ہو کر اٹھائیس برس کی چھوکری کو بڑھیا کہتے ہو...... یہی مرد کی بدنصیبی ہے......

"میں تو پھر بھٹک گئی ہوں۔ تم مجھے یاد دلاؤ نا کہ میں کیا کہہ رہی تھی۔ جانے سے پہلے ساری بات سنتے جاؤ۔ پھر تم کب آؤ گے یہاں سستانے کو"۔

"تم کہہ رہی تھیں نا کہ پھر تم نے نیم کے پتوں کو رازداں بنا لیا"۔ بوڑھے نے رعشہ گیر آواز میں کہا۔ "میں سن رہا ہوں نوری! میں سننے ہی تو آیا ہوں"۔

"ہاں تو"۔ نوری بولی۔ "میں نے پھر ایک روز محلے کے دو بچوں کو قرآن کا سبق دیا تو اگلے روز دو اور بچے آ گئے۔ پھر پندرہ بیس بچے آنے لگے اور میں انہیں قرآن پڑھانے لگی۔ یہ بچے اب بھی میرے ہاں آتے ہیں لیکن یہ اُن بچوں کے بچے ہیں جو پہلے پہل میرے ہاں آئے تھے۔ یہ میرے اپنے بچے ہیں۔ انہیں دیکھ کر ایسی خوشی سی ہوتی ہے جیسے یہ میری ہی کوکھ کی پیداوار ہوں اور تصوروں میں انہیں دودھ پلاتے میری چھاتیاں کبھی خشک نہیں ہوئیں۔ پر سچی کہوں، جب ننھی منی بچیوں کو اپنے آنگن میں کدکڑے لگاتے اور پیڑ پر چڑھتے اترتے دیکھتی ہوں تو سو سو دعائیں کرتی ہوں، یا مولا، ان بچیوں کو جوان نہ کر دینا۔ کسی بچی کو بانجھ من کی سل نہ بنا دینا ورنہ کوئی ضعیف باپ دب کر مر جائے گا، پر وہ بڑی ہو جاتی ہیں اور کچھ ایسی ہیں جو ایسے مرد کے ساتھ بندھ جاتی ہیں جو انہیں لڑکپن سے اٹھا کر بڑھاپے میں پٹخ دیتا ہے۔ انہیں علم ہی نہیں ہو پاتا کہ وہ جوان بھی ہوئی تھیں اور جو خوش رہتی ہیں وہ صرف اتنی سی بات پر کہ وہ کہتے ہیں تم مجھے بڑی اچھی لگتی ہو......

"بس عمر یوں ہی بیت گئی۔ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ نوری جوان ہو گئی ہے پھر مجھے لوگوں نے ہی بتایا کہ نوری بوڑھی ہو گئی ہے، پر مجھے یاد نہیں کہ جوانی کہاں ختم ہوئی اور بڑھاپا کہاں سے شروع ہوا۔ بچے آئے تو انہیں قرآن پڑھاتی رہی اور ان سے کھیلتی رہی، وہ چلے گئے تو نیم تلے کھاٹ پر لیٹ گئی، پر ایک بات ضرور کہوں گی کہ میری وہ سوچ بوڑھی نہیں ہوئی کہ وہ کون تھا؟ وہ کیسا تھا جس کا پہلا سندیس آیا تھا؟ میں نے اُس کے سندیس کے پُرزے یہیں دفن کر دیے تھے جہاں تم لیٹے ہوئے ہو۔ پر اُس کے تصور کو دفن نہ کر سکی۔ میری سوچ ایک تصور بن گئی۔ جسم بوڑھا ہوتا گیا۔ تصور جوان ہوتا گیا۔ میں تصوروں کی دلہن بنی بیٹھی رہی۔ پر وہ نہ آیا۔ نہ اس کی آواز سنائی دی۔ 'نوری! تم مجھے بڑی اچھی لگتی ہو'۔ لگتا ہے جیسے مجھے اُس سے پیار ہو گیا تھا۔ اب بھی ہے"۔

"سچ کہتی ہو؟ نوری! تمہیں اس سے اب بھی پیار ہے؟" بوڑھا لیٹے لیٹے اُٹھ بیٹھا اور لرزتی اور تھرتھر کانپتی آواز میں بولا۔ "وہ سندیس میرا تھا جس کے پُرزوں کو تم نے یہاں دفن کیا تھا۔ وہ موٹی عورت میری ماں تھی اور سوکھی سڑی میری خالہ تھی۔ وہ خط میرے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا کیونکہ میرے ماں باپ لکھے پڑھے نہیں تھے۔ میں نے وہ خط پچاس میل دُور سے لکھا تھا لیکن تمہیں بہت قریب سے دیکھ کر۔ ذرا یاد کرو۔ بوڑھے ذہن سے وقت کے پردے اٹھاؤ تو تمہیں ایک رات یاد آئے گی۔ باہر والی حویلی میں ایک شادی تھی۔ وہ میرے چچا کی حویلی تھی۔ اب تو سب مر مرا گئے ہیں۔ میں بھی آیا تھا۔ تم سکھی سہیلیوں میں بیٹھی وہاں ڈھولک پر گا رہی تھیں۔ میں نے تمہاری چال میں لوچ دیکھی تھی، آنکھوں میں خمار دیکھا

تھا اور تمہاری آواز جو دوسریوں سے الگ تھلگ تھی، تمہاری چال کی لوچ کی طرح اور تمہاری آنکھوں کے خمار کی طرح مجھے ایسا دیوانہ بنا گئی کہ میں نے اس شادی کے بعد بھی تمہیں دو بار دیکھا تھا۔ میں کسی بہانے چچا کے گھر آ ہی جاتا تھا۔ میں نے چچی سے کہا تھا کہ تمہارے رشتے کی بات کریں۔ پھر جو تم پر بیتی وہ تم جانتی ہو مگر جو مجھ پر بیتی وہ تم نہیں جانتیں"۔

بڑھیا کے ہونٹ لرزے مگر کچھ کہہ نہ سکے۔ اُس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں مگر اشکوں کو پی گئیں۔

بوڑھا کہہ رہا تھا۔ "وہ میری خالہ تھی جس نے تمہاری ماں سے پوچھا تھا کہ یہ لگائی بجھائی تو نہیں کرتی؟ مگر وہ اُس لڑکی کو میری زندگی میں دھکیل کر خوش ہو گئیں جو لگائی بجھائی کے سوا کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔ تم عورت ہو نوری! تم نے عورت کی تصویر میں بڑے پیارے رنگ بھرے ہیں...... میں نے ایک سانپ دیکھا تھا جس کا رنگ چمکتا ہوا سبز تھا۔ اتنا پیارا رنگ کہ میں نے اسے مارا نہیں تھا مگر اسی سانپ نے میری بکری کو ڈنک مارا تو میری بکری بغیر تڑپے مر گئی تھی۔ مجھے بھی رنگوں نے ڈس لیا۔ ماں باپ گیارہ جوڑے ریشمی کپڑے، بارہ تولے سونا اور جہیز سے لدی ہوئی لاری کو دیکھ کر پھولے نہ سمائے تھے مگر جس جہیز نے تیرے باپ کے سینے پر پانچ من وزنی سِل رکھ دی تھی، اسی جہیز نے وہی سِل میرے سینے پر بھی رکھ دی تھی۔ میری دلہن کے ہاتھوں کی مہندی کا رنگ ابھی تازہ ہی تھا کہ اُس نے مجھے میری ماں سے لڑا دیا پھر گھر کے سارے ہی لوگ ایک دوسرے سے لڑنے لگے۔ میں نے اپنی بیوی کو مارا، ماں کو پیٹا، اپنے باپ کے منہ آیا اور میرا اچھا بھلا گھر جہنم بن گیا......

"نوری! میرے لئے کوئی پناہ نہیں تھی۔ پھر ایک روز میں نے بھاگ کر تیرے تصور میں پناہ لے لی۔ گھر میں ایسا فساد بپا ہوا کہ میری بیوی روٹھ کر میکے چلی گئی۔ وقت گزرنے لگا اور طلاق ہو گئی۔ مجھے شادی سے نفرت ہو گئی، پر تیرے تصور کو ذہن سے اتار نہ سکا۔ ماں باپ نے بہت مجبور کیا کہ دوسرا بیاہ کر لو۔ میں نے کہا کہ کروں گا تو نوری سے کروں گا۔ ماں نے کہا کہ عزت والے لوگ تھوک کے نہیں چاٹا کرتے۔ وہ ہمارا دھتکارا ہوا رشتہ ہے......نوری!"

اُس نے لپک کر نوری کے دونوں ہاتھ تھام لئے اور رُندھی ہوئی آواز میں بولا۔ "آج تیرے دروازے پر آ گرا ہوں۔ ساری عمر اکیلے گزار دی ہے"۔ اُس نے بڑھیا کو زمین سے اٹھا کر اپنے پاس کھاٹ پر بٹھا لیا اور کُرتے کی جیب سے کانچ کی چوڑیاں نکال کر نوری کی مرجھائی ہوئی کلائیوں پر چڑھا دیں۔ کہنے لگا۔ "نوری! تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو، مجھے تم سے محبت ہے"۔

نوری نے بے تابی سے بوڑھے کے رعشہ گیر ہاتھ تھامے اور اس کے ہاتھوں میں اپنے چہرے کو چھپا کر سسکنے کے لہجے میں کہا۔ "ایک بار پھر کہو، تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔ پھر کہو، مجھے تم سے محبت ہے"۔ وہ ہچکیاں بھرنے لگی اور بولی۔ "تم بہت بوڑھے ہو پر تم نے پانچ من کی سِل اٹھا لی ہے۔ میں نے باپ کی میت سے یہ سِل اٹھا کر اپنے سینے پر رکھ لی تھی۔ آج ہلکی پھلکی ہو گئی ہوں۔ یہ سِل پھر مجھ پر رکھ کر چلے نہ جانا"۔

بوڑھے نے اُس کے سَر کو اپنے سینے سے لگا کر کہا۔ "میں چلے جانے کے لئے نہیں آیا نوری! میں یہیں دفن ہونے کے لئے آیا ہوں جہاں تم نے میرے ہاتھ کا لکھا ہُوا سندیس دفن کیا تھا"۔ اور بوڑھے کے آنسو نوری کے سپید راکھ جیسے بالوں میں گرنے لگے۔

ایک تاثر

تریاق

اس زندگی کی تکلیفوں کو چن لو یا اس زندگی کی لیکن عارضی نہ چنو!

☆ .... رحمیٰ شاہد

سڑک کے مشرقی کنارے جہاں روشنیاں سرِ شام ہی مدھم ہو جایا کرتی تھیں اور کچھ لوگوں کے لئے یہ مدھم روشنیاں بظاہر ان کی زندگی کے اجالوں کا سبب بنا کرتی تھیں۔ جمیلہ بانو اپنی عمر کے ڈھلتے پن کو سمیٹے اپنی ضرورت کی ڈور کو کسی اَن چاہے اور انجانے رشتے میں مدغم کرنے کی خواہاں تھی۔ مسئلہ رشتے کا نہیں تھا۔ یہ مسئلہ عزتِ نفس، خودداری اور زعمِ ذات سے نکل کر ضرورت اور بس ضرورت کا ہی تھا۔ پیٹ کی آگ بجھانے کی ضرورت سر چھپانے کی ضرورت اور زندگی کی بچی کھچی سانسوں کو قائم رکھنے کی ضرورت۔

آج کافی دیر سے جمیلہ نے اپنی کلائی پہ بندھی واحد بوسیدہ گھڑی کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ ہوس اور دولت کے پجاریوں کے پاس پیسے کی ریل پیل ہونے کے باوجود وہ بھوکی سوئے گی۔ "نہیں"۔ اس کے اندر سے جیسے کسی کی درد بھری آواز آئی ہو اور اس کے تھکے چہرے پہ جھوٹی مسکان پھیلی۔ "پھر آج یہ دیر کیوں؟" اس نے خود سے سوال کیا۔ کبھی ایسا ہوا تو نہیں تھا۔ اس شہر میں ہر قدم اور ہر لحہ ضرورت کے پجاری بھٹکتے بھٹکتے اس موڑ پہ آ ہی رکتے تھے۔ پھر آج۔ ذرا دور سے اپنی طرف بڑھتی ہوئی آہٹوں کی آواز نے اسے خیالوں کی دنیا سے باہر آ دھکیلا۔ اس کے مصنوعی آرائش سے سجے چہرے پہ ایک شکاری کی طرح مسکراہٹ آ ٹھہری۔

"میں تو یونہی مایوس ہو رہی تھی"۔ اس نے جیسے اپنا مذاق اڑایا ہو یا ان لوگوں کا جن کی ہوس اور درندگی کی انتہا کبھی نہیں ہوتی۔

قدموں کی آہٹ قریب آ رکی۔ وہ ایک بارہ تیرہ سال کا بچہ تھا، گندہ نامکمل لباس اور ایک بڑا سا بدنما تھیلا جیسے اس کا کل اثاثہ تھا جو اس کے بڑھتے ہوئے قد کو ڈھانپے ہوئے تھا۔ زمین پہ کچھ ڈھونڈتی اس کی نگاہیں جمیلہ کے بدنما پیروں کو لپیٹے سینڈل پہ آ رکیں۔

"سلام باجی جی!"

"وعلیکم السلام"۔ جمیلہ نے بددلی سے جواب دیا اور ذہن میں سوچنے لگی۔ ابھی کچھ مانگے گا...... میں بھوکا ہوں...... پیسے دے دو باجی جی۔ "ہونہہ" اس نے نفرت سے ہنکارا بھرا۔ گھٹیا لوگوں کی کم تر اولاد جن کا وجود ان کے اپنے ماں باپ کے لئے بوجھ ہے۔ پیدا کر کے سڑکوں پہ چھوڑ دیتے ہیں اس نے دل ہی دل میں "گھٹیا لوگوں" کو کوسنا شروع کر دیا لیکن کافی دیر گزر گئی۔ اسکی کوئی آواز نہ آئی۔ وہ لڑکا دور پڑے کوڑے کے ڈھیر میں سے کچھ ڈھونڈتا اور اسے کسی انمول خزانے کی طرح اپنے تھیلے میں ڈال دیتا۔ چہرے پہ عجیب سا سکون تھا جس نے جمیلہ بانو کو چونکا دیا تھا۔ "گاہک" کے آنے تک وہ اسی سرگرمی کو انجوائے کرنے لگی اس کے چہرے پہ ایک تجسس

آ ٹھہرا جیسے کوئی اَن ہونی 'ہونے' کو ہے۔ جیسے معمول سے ہٹ کر کوئی عمل ہونے کو ہے۔

ایسا ہوتا تو نہیں پھر آج؟ اس نے سوچا 'آج' میں کیا خاص بات ہے جو ہر عمل کو متاثر کر رہا ہے۔ رزق کی تلاش میں دیر؟ گھٹیا لوگوں کی کم تر اولاد مانگنے سے گریز اں؟ ذہن فارغ ہو تو بے وقعت چیزیں اور چہرے بھی اہم ہونے لگتے ہیں جیسے یہ بچہ اور اس کا کام۔ بچے کی متلاشی آنکھیں اب سکون میں تھیں جیسے جو تلاش کرنا تھا مل گیا ہو۔

وہ جمیلہ بانو کے پاس سے ہو کر گزرنے لگا جب اس نے اسے آواز دے کر روکا۔ اس نے حیران نظروں نے اس عورت کو دیکھا۔ "آؤ بیٹھو"۔ جمیلہ نے کہا۔

"نہیں ماں انتظار کر رہی ہو گی، مجھے جانا ہے"۔ بچے نے ذمہ داری سے جواب دیا۔

"کوئی بات نہیں تھوڑی دیر بس"۔ جمیلہ نے ہلکی سی التجا کی ہو۔

کیوں؟ وہ خود نہ جان سکی۔

"جی باجی!"

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"راجا سکندر"۔ اس نے جواب دیا۔

"راجا سکندر!...... ہاہاہا راجا اور سکندر بھی"۔

"کیوں باجی! کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں، پڑھتے ہو کیا؟"

"جی باجی!"

"کون سی جماعت میں؟"

"تیسری میں ہوں جی"۔ وہ فخر سے بولا۔

"اچھا تو یہ کام کیوں کرتے ہو پھر؟" اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

"ابا مزدور ہے جی، دیہاڑی میں پوری نہیں پڑتی۔ اماں بیمار رہتی ہے، گھر کا خرچہ مشکل سے چلتا ہے اسی لئے"۔

"اچھا......" جمیلہ نے بیگ ٹٹولا گنے چنے سو ہی روپے تھے اس نے بیس روپے نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔ "لے لو!"

"نہیں باجی! ابا کہتا ہے حلال کی کھاؤ ورنہ اس جسم کو آگ لگے گی"۔

"ہاہاہا...... آگ؟"

"ہاں باجی! ابا کہتا ہے کہ یہ دنیا تو عارضی ہے ختم ہو جائے گی ایسے کام کیوں کریں کہ آخرت بھی خراب ہو جائے"۔ اس نے معصومیت سے کہا۔

"سب فضول باتیں ہیں، بڑی بڑی کانفرنسوں میں بیٹھے فارغ، خوش لباس اور آسودہ لوگوں کی باتیں اور دل میں منافقت لئے بڑے بڑے سیٹھوں کی ہوائی باتیں یا پھر مڈل کلاس لوگوں کی خالی خولی اخلاقیات جس سے پیٹ نہیں بھرتا"۔ جمیلہ سوچنے لگی اور تلخی اس کے چہرے سے نمایاں ہونے لگی۔

"کیا ہوا باجی! اب جاؤں میں؟"

"نہیں رکو۔ اور کیا کہتا ہے تمہارا ابا؟"

"ابا کہتا ہے اس زندگی کی تکلیفوں کو چُن لو یا اُس زندگی کی لیکن عارضی نہ چنو مستقل کو چنو۔ بس یہ دنیا عارضی ہے اور وہ دنیا ہمیشہ رہنے والی۔ اچھا باجی! چلتا ہوں، سلام!"

جمیلہ کے بے جان جسم میں جیسے کچھ نہ بچا ہو کبھی کبھی ایک لفظ، ایک جملہ وہ کام کر جاتا ہے جو دوسروں کی بڑی بڑی باتیں نہ کر پائیں۔

عارضی کو نہ چنو مستقل کو چنو۔ اب اسے پتہ چلا کہ 'آج' میں کیا خاص بات تھی۔ 'آج' اس کے خالق کو اسے زندگی کا فلسفہ سمجھانا تھا۔ اسے راہِ راست پہ لانا تھا۔ وہ مالک کتنا مہربان ہے اور میں کتنی خوش نصیب۔ یا اللہ، یا اللہ! اس کے آنسوؤں نے بہہ جانے کو رستہ دیکھ لیا۔

رنگا ڈاکو

زورآوروں کے ظلم اور انصاف نہ ملنے پر ایک شریف اور
سیدھے سادے نوجوان کو اور تنگ بہ سے "رنگا ڈاکو" بننے پر مجبور کر دیا۔

☆ ---------- محمد رضوان قیوم

اورنگزیب کا باپ ولایت الدین کھاریاں کے قریب ایک گاؤں کے ایک ہندو زمیندار راجا کھیرن کے کھیتوں میں بحیثیت مزارے کا کام کیا کرتا تھا۔ 1932ء میں اورنگزیب کی عمر 19 سال اور اس کی بہن نورالعین کی عمر 17 سال تھی۔ ولایت الدین کی بیوی تپ دق کے عارضہ کے باعث کافی عرصہ سے کاٹھ سے لگی معذوری کی زندگی گزار رہی تھی۔ ولایت الدین نے اپنے مکان کے سامنے کچھ بھیڑ بکریاں پالی ہوئی تھیں جنہیں کبھی اورنگزیب اور کبھی نورالعین چرایا کرتے تھے۔ بکریوں کا دودھ راجا کھیرن کی حویلی میں فروخت کیا جاتا تھا۔ اس سے ولایت الدین کو اضافی آمدنی ہو جایا کرتی تھی جبکہ گوشت کے قابل فربہ بھیڑ بکریوں کو ولایت الدین مقامی قصائیوں کو گوشت کی غرض سے فروخت کر دیا کرتا تھا۔ ولایت الدین جس جگہ رہتا تھا وہاں اردگرد ہندو، سکھ کی اکثریتی آبادی تھی۔ ہندو، سکھ فطری طور پر مسلمانوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔ اسی لئے ولایت الدین بھی اُن سے گھلنے ملنے کی کوشش نہ کرتا۔ وہ اپنا زیادہ تر وقت عبادات میں گزارہ کرتا تھا۔

ایک صبح نورالعین اپنی بھیڑ بکریوں کو چرانے علاقہ کی قریبی وادی میں گئی تو شام کو اس کی بکریاں تو واپس آ گئیں لیکن وہ نہ آئی۔ ولایت الدین اور اورنگزیب تشویش اور پریشانی کے عالم میں اُسے اردگرد کے علاقہ میں ڈھونڈنے نکل گئے۔ انہوں نے پہاڑوں، چراگاہوں میں چلا چلا کر پکارا۔ ''نورالعین...... نورالعین!'' لیکن ان کی تلاش بسیار کے بعد انہیں نورالعین نہ ملی۔ وہ تھک ہار کر مایوسی کے عالم میں اپنے گھر آ گئے جہاں نورالعین کے لاپتہ ہونے کی خبر سن کر لوگ جمع ہو گئے تھے۔ ولایت الدین کی بیوی کاٹھ پر پڑی بلک بلک کر لوگوں سے فریاد کر رہی تھی کہ خدا کے واسطے میری

> شمارہ جولائی 2014ء میں ایک کہانی ''نسخہ'' میں رنگا ڈاکو کا سرسری ساذکر آیا تھا۔ میں نے قارئین سے وعدہ کیا تھا کہ رنگا ڈاکو کی کہانی پھر کبھی تفصیل سے سناؤں گا۔ حسب وعدہ یہ کہانی پیش خدمت ہے۔ (مصنف)

بیٹی نورالعین کو تلاش کر کے لاؤ۔ اورنگزیب بھی ماں سے لپٹ کر رونے لگا جبکہ ولایت الدین انہیں تسلیاں دینے لگا۔

''ہاں! ہم نے نورالعین کو بہت تلاش کیا لیکن اُس کا کچھ پتہ نہیں چل رہا ہے''۔ اورنگزیب نے اُسے بتایا۔

کچھ دیر بعد زمیندار راجا کھیرن اپنے چند کارندوں کے ساتھ آ گیا۔ اسے دیکھ کر ولایت الدین اس کے قریب روتا ہوا گیا اور اس کے پاؤں پر گر کر گڑگڑا کر بولا۔

''راجا صاحب! میری بیٹی لاپتہ ہو گئی ہے، میں نے اور اورنگزیب نے اسے بہت تلاش کیا لیکن وہ ہمیں نہیں ملی، میری اس معاملہ میں مدد کرو''۔

راجا کھیرن نے اسے قدموں سے اٹھایا اور اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔ ''ولایت الدین! میں نے اپنی حویلی میں تیری بیٹی کی گمشدگی کی اطلاع سن لی تھی۔ تُو پریشان نہ ہو میں ابھی تیرا یہ مسئلہ حل کرتا ہوں''۔ اس نے ولایت کے مکان میں موجود لوگوں کو اپنے پاس بلا کر کہا۔

''تم ایک لمحے کے لئے میرے پاس آؤ''۔ سب اس کے پاس آ گئے۔

''تم لوگ یہاں فضول کھڑے کیا کر رہے ہو؟'' راجا کھیرن نے انہیں ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ''مورکھو! تم دیکھ نہیں رہے ہو کہ تمہارا پڑوسی ولایت الدین اس وقت کتنے کڑے کرب سے گزر رہا ہے، اس کی بیٹی لاپتہ ہو گئی ہے۔ ہم سب کا یہ اخلاقی فرض ہے کہ ہم ولایت الدین کی اس مصیبت میں اس کا بھرپور ساتھ دیں۔ تم میں سے

نوجوانوں کی ٹیمیں دور دراز کے علاقہ جات میں بچی کی تلاش میں نکلیں اور ادھیڑ عمر افراد اردگرد کے اُن علاقوں میں جائیں جہاں نورالعین اپنی بھیڑ بکریوں کو چرانے جایا کرتی تھی...... ولایت الدین میرا پرانا وفادار مزارع ہے اس نے میری بڑی خدمت کی ہے"۔

راجا کھیرن نے ولایت الدین اور اورنگ زیب کو کہا کہ تم دونوں آرام سے اپنی جھونپڑی میں بیٹھو۔ یہ گاؤں کے لوگ تیری بیٹی کو ڈھونڈ لائیں گے۔ گاؤں کے ہر عمر کے لوگ ساری رات قریہ قریہ پھر کر گمشدہ نورالعین کو تلاش کرتے رہے۔ بالآخر رات کے دوسرے پہر نورالعین مردہ حالت میں گاؤں کی حدود سے باہر ایک سوکھے کنواں میں مل گئی۔ نورالعین کی لاش کو گاؤں کے چند نوجوان اٹھا کر لائے تو ولایت الدین بیٹی کی لاش دیکھ کر بے ہوش ہو گیا جبکہ نورالعین کی ماں نے دیوانوں کی طرح اپنے بال نوچنا شروع کر دیئے۔ اورنگزیب رو رو کر اتنا ہلکان اور بے حال ہوا کہ اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا۔

نورالعین کا منہ بری طرح سوجا ہوا اور پسلیاں ٹوٹی ہوئی تھیں جبکہ اس کا لباس جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ یہ اس امر کا ثبوت تھا کہ کسی نے اس کے ساتھ پہلے زیادتی کی اور پھر اُسے قتل کر دیا۔

"ہائے...... کس نے میری بیٹی کے ساتھ یہ ظلم کیا ہے؟" اس کی ماں آسمان کی طرف منہ کر کے بین کرنے لگی۔ "اے خدا! میری بیٹی کے ساتھ جس نے اتنا ظلم کیا ہے تو اسے اسی طرح ذلیل و رسوا کرنا جس طرح ہم ہوئے ہیں"۔

وہ بیچاری اس کے سوا اور کر بھی کیا سکتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد متعلقہ تھانے سے پولیس بھی پہنچ گئی۔ نہال دھرم تھانیدار نے سب سے پہلے ولایت الدین اور اورنگزیب دونوں کو اپنے پاس بلا کر پہلے اُن سے نورالعین کے بہیمانہ قتل پر اظہار افسوس کیا اور پھر انہیں کہا کہ تم اس بات کی چنتا نہ کرو کہ میں تمہیں انصاف نہ دلواؤں گا۔ میں تمہاری بہن کے قاتل اور اس کی عزت خراب کرنے والے کو عبرت کے نشان میں تبدیل کر دوں گا لیکن مجھے اب اس معاملہ میں باقاعدہ قانونی کارروائی کرنی ہے۔ میری آپ دونوں سے استدعا ہے کہ تم دونوں میرے ساتھ بھرپور تعاون کرنا اور جیسا میں کہوں ویسا ہی کرنا"۔

"سرکار! ہم رہے غریب مزارعے"۔ اورنگزیب نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔ "ہماری کون سنتا ہے؟"

"ارے میں نے تجھے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ تُو اس بات کی فکر نہ کر کہ تمہیں انصاف نہیں ملے گا"۔ تھانیدار نے کہا۔ "ارے میں جو آ گیا ہوں تمہاری دادرسی کے لئے"۔

زمیندار راجا کھیرن جو قریب ہی کھڑا تھا، وہ دونوں باپ بیٹے کے قریب آیا اور اُس نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "میں نورالعین کی عزت لوٹنے اور اُسے قتل کرنے والے خونی ہاتھوں کی کھوج لگا کر رہوں گا۔ تم لوگ صبر سے کام لو۔ تھانیدار نہال دھرم کو اپنی قانونی کارروائی کرنے دو"۔

"سرکار! کیسی قانونی کارروائی کریں گے؟" ولایت نے پوچھا۔

"جو بہتر ہوگا ہم وہ کریں گے"۔ تھانیدار نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "لیکن یاد رکھو! اس بات کی احتیاط رہے کہ تم نے مقتولہ کی میت کو کسی حال میں چھیڑنا نہیں ہے۔ ہم نے اس کی میت کو پوسٹمارٹم اور کچھ ضروری میڈیکل رپورٹوں کے لئے جہلم شہر کے سرکاری ہسپتال لے کر جانا ہے"۔

"نہیں، خدا کے واسطے میری مظلوم بیٹی کی میت کی بے حرمتی نہ کرنا"۔ ولایت الدین کی بیوی نے چارپائی پر پڑے بے بسی سے روتے ہوئے کہا۔

"باتا جی! مقتولہ کے ساتھ ظلم کرنے والے کو

پکڑنے اور قانونی عمل سے گزرنے کے لئے یہ سب کچھ تو کرنا پڑے گا"۔ تھانیدار نے کہا۔

یہ باتیں سن کر ہجوم میں سے ایک ہندو بڑھیا آگے بڑھی اور اس نے تھانیدار پر چلاتے ہوئے کہا۔"ایک تو نورالعین کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے اور اب تم یہ چاہتے ہو کہ اس کے مرنے کے بعد اس کی لاش کی چیرا پھاڑی کروا کے تذلیل کروائی جائے؟"

"ماسی! تُو درمیان میں ہمیں اپنا مشورہ نہ دے"۔ تھانیدار نے کہا۔"مقتولہ کے خاندان سے پوچھنے دے کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ یہ جیسا چاہیں گے میں ویسا ہی کروں گا"۔

"ادھر آؤ ولایت الدین!" راجا کھیرن نے کہا۔ "تُو نے مقتولہ کا پوسٹ مارٹم کروانا ہے یا نہیں؟ تُو جیسا چاہے گا میں تھانیدار صاحب سے کہہ کر ویسا ہی کروا دیتا ہوں۔ یہ بہت اچھا تعاون کرنے والا انسان ہے، یہ وہی کرے گا جو میں اسے کہوں گا..... ولایت الدین تُو کیا کہتا ہے؟"

"سرکار! مجھے تو سچی بات ہے کچھ سجھائی نہیں دے رہا ہے۔" ولایت نے غمزدہ آواز میں کہا۔"کسی ظالم نے میری بیٹی کی نہ صرف بے حرمتی کی بلکہ اُسے جان سے بھی مار دیا ہے۔ راجا صاحب! اب آپ ہی بتلائیں میرا اب کیا رہ گیا ہے۔ مجھے بس میری بیٹی کی جان اور عزت کو پامال کرنے والا مجرم چاہئے"۔

"نہیں بابا! میں اب یہ گوارہ نہیں کروں گا"۔ اورنگ زیب نے تڑپ کر کہا۔"میری بہن کی میت کو شہر کے ہسپتال میں چیر پھاڑ اور دیگر ڈاکٹری رپورٹوں کے لئے گھسیٹا جائے"۔

"ولایت الدین! تیرے ساتھ جو ظلم ہو گیا سو ہو گیا لیکن اب تُو اپنی مری بیٹی کو غسل دے کر عزت سے قبر کے حوالہ کر۔ رہا سوال قانونی چارہ جوئی کا تو وہ تھانیدار صاحب سنبھال لیں گے"۔ راجا کھیرن نے اورنگزیب کی بات سن کر کہا۔

"بس، تھانیدار صاحب! میری بہن کا قاتل کسی صورت نہیں بچنا چاہئے"۔ اورنگزیب نے کہا۔

تھانیدار دھرم نہل اورنگزیب کے قریب گیا اور اُسے اپنے دل سے لگا کر چمکارتے ہوئے کہا۔"بیٹا! دیکھ میں تیری بہن کے ساتھ ظلم کرنے والے کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہوں۔ میں اُسے پاتال سے بھی ڈھونڈ لاؤں گا"۔

"نہل دھرم! تُو کچھ ایسا کر کہ قانونی تقاضے بھی پورے ہو جائیں اور مقتولہ کا پوسٹ مارٹم بھی نہ ہو"۔ راجا کھیرن نے تھانیدار سے کہا۔

تھانیدار دھرم نہل نے کافی دیر تک مردہ نورالعین کے جسم کا مختلف زاویوں سے جائزہ لینے کے علاوہ اس کی کئی تصاویر بنائیں اور کئی مقامی دیہاتیوں کے بیانات لئے۔ اس کے بعد اس نے ولایت الدین اور اورنگزیب کو میت دفنانے کی اجازت کے ساتھ یہ کہا کہ تم دونوں مجھ سے رابطہ میں رہنا۔ اُدھر زمیندار راجا کھیرن نے بھی دونوں باپ بیٹے کو یہ یقین دلایا کہ وہ تھانیدار سے اس کیس کی لمحہ بہ لمحہ رپورٹ لیتا رہے گا۔

نورالعین کو آہ و سسکیوں کے ساتھ دفنا دیا گیا۔ اس کی اپاہج ماں، باپ ولایت الدین اور بھائی اورنگزیب آخر تک دھاڑیں مار مار کر روتے رہے۔ وہ بیچارے اس کے سوا کر بھی کیا سکتے تھے۔

مقتولہ کی تدفین اور کفن، دفن، پُرسہ کے لئے آنے والے مہمانوں کے تمام اخراجات راجا کھیرن نے ادا کئے۔ اس کے ساتھ ساتھ تھانیدار دھرم نہل، اورنگزیب اور ولایت الدین کے ساتھ مختلف جگہوں میں جا کر انویسٹی گیشن کرتا رہا۔

"تُو اب بوڑھا ہو گیا ہے"۔ تین روز بعد راجا

کھیرن نے ولایت الدین کو کہا۔ ”تو اب گھر پر آرام کر اور میں تجھے دوسو روپے ماہانہ وظیفہ دیا کروں گا اور ان پیسوں کے علاوہ اپنی بھیڑ بکریوں اور دودھ کا کام جاری رکھ“۔

ولایت الدین کو راجا کھیرن کی بات مناسب لگی اور اُس نے مفت کے دو سو روپے ماہوار لینے پر رضامندی ظاہر کردی۔ اب اورنگزیب اپنے باڑے میں پالی ہوئی بھی ربکریوں کو چراتا۔ ان سے حاصل دودھ کو راجا کھیرن کی حویلی اور اردگرد کے صاحب حیثیت لوگوں کو فروخت کرتا جبکہ ولایت الدین گوشت کی غرض سے دودھ سے سوکھی بکریوں کو قصابوں کو فروخت کرنے کے معاملات وغیرہ سنبھالا کرتا تھا۔

اسی دوران تھانیدار نہل دھرم نے نورالعین کے قتل اور زیادتی کے شبہے میں گاؤں کے کئی مشکوک لوگوں کو پکڑ لیا لیکن اس نے ان سب کو بغیر کسی پیش رفت کے چھوڑ دیا۔ وہ ولایت الدین، اورنگزیب کو آئے روز تھانے بلا کر طفل تسلیاں دیتا رہا۔

دوسری طرف راجا کھیرن کچھ روز تک دونوں باپ بیٹے کے ساتھ تھانے کچہریوں میں جاتا رہا لیکن پھر اُس نے بھی اُن کے ساتھ اپنے تعاون میں سست روی دکھانا شروع کردی۔ بالآخر ایک دن ولایت الدین خود ہی تھک ہار کر دھرم نہل تھانیدار کے دفتر میں چلا کر کہا۔

”میں نورالعین کے قتل اور بے حرمتی کا معاملہ اپنے خدا پر چھوڑتا ہوں“۔

تھانیدار نے اس کی جانب سے یہ بیان سن کر یہ کیا کہ نورالعین کے قتل اور اس کیس اتھ زیادتی کا کیس کسی نامعلوم شخص پر ڈال کر کیس فائل کر دیا۔ اسی دوران نورالعین کی ماں جو پہلے ہی تپ دق کے مرض کا شکار تھی وہ اپنی بیٹی نورالعین کی عزت لٹنے اور قتل کا صدمہ برداشت نہ کر سکی اور مرگئی۔ زمیندار راجا کھیرن حسب وعدہ ولایت الدین کو ماہانہ دوسو روپے بھیجتا رہا۔

اس کہانی میں ایک نیا موڑ اس طرح آیا کہ ایک دن اورنگزیب اپنی بکریوں کو چراتے ہوئے ایک ایسی جگہ جا نکلا جہاں ٹھہرے پانی کا بہت گہرا جوہڑ تھا، وہ وہاں اپنی بکریوں کو پانی پلانے کی غرض سے جارہا تھا کہ اچانک اس کے کانوں میں فلک شگاف آوازیں ٹکرائیں۔

”بچاؤ، بچاؤ، بھگوان کے واسطے کوئی ہے جو میری زندگی بچالے میں ڈوب رہا ہوں“۔ اورنگزیب بجلی کی رفتار سے اُس گس (جوہڑ) کی طرف بھاگتا ہوا پہنچا۔ وہاں اُس نے دیکھا کہ ایک آشنا سا شخص جوہڑ میں تقریباً ڈوبنے کے قریب ہے اور وہ اپنی زندگی کو بچانے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ اورنگزیب نے آؤ دیکھا نہ تاؤ قریب پڑی ایک لمبی سی شاخ اٹھا کر اس کی جانب بڑھائی تاکہ وہ اُسے پکڑ کر باہر آجائے۔ ڈوبنے والے نے اس شاخ کو پکڑنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ اسے پکڑنے میں ناکام رہا تو اورنگزیب نے اُسے کہا کہ تُو فکر نہ کر میں خود جوہڑ میں اتر کر تجھے بچانے کی کوشش کرتا ہوں“۔

”نہیں نہیں میرا بچنا مشکل ہے“۔ اس آدمی نے کہا۔ ”تم اپنی زندگی خطرے میں نہ ڈالو“۔

اورنگزیب نے کہا کہ بے شک تمہیں بچانے میں میری زندگی ہی کیوں نہ چلی جائے میں کوشش ضرور کروں گا۔

اورنگزیب نے اپنی جان پر کھیل کر ڈوبتے ہوئے اُس شخص کو بچا کر اُسے ایک خشک جگہ پر لٹایا۔

”اورنگزیب! تم نے میری زندگی بچا کر مجھے عمر بھر کے لئے خرید لیا ہے“۔ اُس آدمی نے اُس کے پاؤں پکڑ کر کہا۔

”میں تمہیں نہیں جانتا لیکن تم نے مجھے کیسے پہچانا تم کون ہو؟“ اورنگزیب نے پوچھا۔

”میرا نام دھومنی ہے“۔ اس شخص نے کہا۔ ”اور

میں زمیندار راجا کھیرن کے پنورے کا خاص بندہ ہوں"۔ (پنورہ یا پنورے دراصل پنے سے نکلا ہے۔ پنا سے مراد علاقہ کے بڑے بدمعاش یا زمیندار کی رہائش گاہ سے ہٹ کر وہ بڑی بیٹھک ہوتی تھی جہاں اُس کے یار دوست ڈیرہ لگاتے تھے۔ اسے رہائش گاہ بھی کہہ سکتے ہیں)۔ "تم تو میرے لئے بھگوان بن کر آگئے جس نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر مجھے نیا جیون دیا ہے"۔ دھومنی نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"اگر میں تمہیں نہ بچاتا تو میرا ضمیر مجھے ساری عمر لعن طعن کرتا"۔ اورنگزیب نے اُسے اپنے سینے سے لگا کر کہا۔ "اور اس بات کے لئے مجھے خدا کے آگے جوابدہ ہونا پڑتا۔ ویسے بھی میں زندہ کہاں ہوں میری پیاری بہن نورالعین کا جس دن قتل ہوا ہے میں تو اُسی دن مر گیا تھا۔ میں تو صرف ایک زندہ لاش ہوں۔ تم بار بار اپنی جان بچانے کا مجھ سے شکریہ ادا نہ کرو۔ ہاں، یہ تو میں بھول گیا کہ تم سے پوچھوں کہ میں تو اس جگہ اپنی بھیڑ بکریاں چرانے آیا تھا تم یہاں کیسے آئے اور ڈوبنے لگے؟"

"میں دراصل یہاں اپنے مالک راجا کھیرن کے لئے جنگلی خرگوش کے شکار کے لئے آیا تھا"۔ دھومنی نے کہا۔ "میں نے ایک بڑے خرگوش کو سوٹا (ایک قسم کا چھوٹا ہتھیار جس سے چھوٹے جانور شکار کئے جاتے تھے) ماری تھی جس سے وہ ہلکا سا زخمی ہو کر بھاگ رہا تھا۔ اُسے پکڑنے کی کوشش میں اس جوہڑ میں گر کر پانی کے اندر موجود چکنی کیچڑ میں دھنسنے لگا تھا۔ راجا کھیرن کو جو شکاری جنگلی خرگوش پکڑ کر لا کر دیتا ہے تو وہ خوش ہو کر انعام میں کچھ روپے دے دیتے ہیں۔ یہی بات ہے میں اسی لالچ میں یہاں آیا تھا۔ آج راجا کھیرن کے چند خصوصی دوست آ رہے ہیں انہوں نے مجھے کہا تھا کہ تم چند جنگلی خرگوشوں کا شکار کرنے کی کوشش کرو، وہ اسے اپنے دوستوں کو دیسی شراب کے ساتھ پیش کریں گے"۔

ابھی ان دونوں کے مابین یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ اچانک دھومنی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور ساتھ ہی اسی حالت میں اورنگزیب کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

"دھومنی بھائی! تجھے کیا ہوا ہے تو اس طرح بلک بلک کر کیوں رو رہا ہے؟" اورنگزیب نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ابھی تم نے کچھ لمحے پہلے مجھے کہا تھا کہ تمہارا خدا تمہارے مرنے کے بعد تم سے پوچھتا کہ تم نے کسی ڈوبتے شخص کو ڈوبنے سے کیوں نہ بچایا۔ تم نے مجھے مرنے سے بچا کر اپنے ضمیر کے زندہ اور خدا کے سامنے سرخرو ہونے کا ثبوت فراہم کر دیا ہے۔ تم نے تو اپنے ضمیر کو مرنے نہیں دیا لیکن میں نے بھی تو اپنی مرگ کے بعد اپنے بھگوان کی عدالت میں پیش ہو کر اپنے کالے کرتوتوں کا جواب دہ ہونا ہے"۔

"تم اور کالے کرتوت؟" اورنگزیب نے ایک بار پھر متجسس ہو کر پوچھا۔

"ہاں، لڑکیوں عورتوں کی عزتوں سے کھلواڑ کرنے والے ظالم بے رحم زمیندار راجا کھیرن کی عیاشی کے لوازمات کا انتظام کرتا ہوں"۔ دھومنی نے کہا۔ "اب تو میں سوچ رہا ہوں کہ کاش تم مجھے بھگوان کی صورت میں آ کر اس جوہڑ میں ڈوبنے سے نہ بچاتے، میں مر جاتا تو بہتر ہوتا"۔

"دھومنی تم اس قسم کی اُلجھی باتیں کر کے مجھے پہیلیوں میں نہ ڈالو"۔ اورنگزیب نے کہا۔ "تم مجھے اب وہ بتلاؤ جو تم کو پریشان کر رہا ہے"۔

"اورنگزیب بھائی! تم میرے محسن اور شریف انسان ہو"۔ دھومنی نے کہا۔ "تم نے تو میرا ضمیر جگا دیا ہے"۔

"یہ تم اپنے ضمیر کے جاگنے کی کیا بات کر رہے ہو"۔ اورنگزیب نے تجسس سے اُس سے پوچھا۔ "کیا

پہلے تمہارا ضمیر سویا ہوا تھا؟ میں تو اس بات سے اُلجھ گیا ہوں"۔

"میں تمہارے سامنے ایک بھیانک انکشاف کرنے والا ہوں"۔ دھومنی نے کہا۔ "پہلے تو تم مجھ سے وعدہ کرو کہ اُسے سن کر فوری طور پر اشتعال میں نہ آؤ گے اور نہ ہی فوری طور پر اپنا ردعمل ظاہر کرو گے"۔

اورنگزیب نے اس سے وعدہ کیا کہ جیسا وہ چاہے گا وہ ویسا ہی کرے گا۔

دھومنی نے اس کے سامنے یہ بھیانک انکشاف کیا کہ تیری بہن نورالعین کی بے حرمتی اور اسے قتل کرنے والا مرکزی کردار راجا کھیرن ہی ہے۔ اورنگزیب نے اس وقت دھومنی کے منہ سے یہ انکشاف بڑے تحمل سے سنا۔ دھومنی نے اس واردات کی تفصیل یوں سنائی۔

ایک دن راجا کھیرن کے تین بدمعاش دوست اُسے ملنے اس کے ڈیرے میں آئے۔ بلراج، سانو اور مکیش۔ دراصل راجا کھیرن نے اپنے دوستوں کے لئے یہ دعوت شراب اور زنا کے لئے سجائی تھی۔ اس وقت چوبارے میں راجا کھیرن اور چوبارے کا کرتا دھرتا ماجو سنگھ بھی تھا۔ یعنی یہ ٹوٹل 5 افراد تھے۔ یہ پانچوں ایک مخصوص جگہ بیٹھ کر شراب کے ساتھ کاجو اور جنگلی خرگوش کے مزے اڑا رہے تھے۔

"یار اگر کسی حسینہ کا بندوبست ہو جائے تو ہمارا مزہ دوآتشہ ہو جائے"۔ مکیش نے راجا کھیرن کو کہا۔

"ہاں یار کھیرن! تیری یہ دعوت بغیر جسمانی راحت کے ادھوری ہے"۔ بلراج نے درمیان میں یہ لقمہ دیا تھا۔

"تمہاری راحت کا سامان اس لئے مشکل ہے"۔ راجا کھیرن نے کہا۔ "کیونکہ آج کل میری رکھیل سونیا بنارس گئی ہوئی ہے ورنہ میں اس کو بلا لیتا"۔

"ارے کھیرن! اس قسم کی باتیں کر کے ہمارے نشہ کا مزہ کرکرا نہ کر"۔

یہ پانچوں دوست آپس میں بیٹھے فحش گفتگو کرنے لگے۔ اسی دوران ماجو سنگھ کسی کام سے باہر گیا اور وہ تھوڑی دیر بعد اپنے ساتھ تیری معصوم بہن نورالعین کو چراگاہ سے ورغلا کر لے آیا اور اُسے کہا کہ تیرا باپ راجا کھیرن کے چوبارے میں ہے اور وہ تجھے بلا رہا ہے۔ وہ بیچاری اس کے بہکاوے میں آ گئی اُس نے جب چوبارے میں اپنے باپ کو نہ پایا اور وہاں راجا کھیرن اور اس کے چار دوستوں کی شیطانی نظروں کو دیکھا تو اُس نے وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی لیکن اُس کے بھاگنے کی تمام کوشش اس وقت رائیگاں گئی جب راجا کھیرن سمیت پانچوں کتوں نے اُس معصوم بچی کو آرام سے دبوچ کر باری باری اپنی ہوس کا شکار بنا دیا۔ اس بیچاری نے ہاتھ میں پکڑے بکریوں کو ہنکانے والے ڈنڈے سے مزاحمت کی کوشش کی تھی لیکن بھیڑیوں کے آگے وہ معصوم بے بس ہو گئی اور اپنی عزت گنوا بیٹھی۔ اس کے بعد راجا کھیرن نے مضبوطی سے اس کا گلا گھونٹا جب تلک وہ مر نہ گئی۔ اس کے دوست تو خوش ہو کر چلے گئے لیکن اب راجا کھیرن کے نزدیک سب سے بڑا مسئلہ مقتولہ نورالعین کی لاش کو ٹھکانے لگانے کا تھا۔ اس نے ماجو سنگھ کو کہا کہ لڑکی کی لاش کو کسی ویران کنوئیں یا مناسب جگہ پھینک آؤ۔ لہٰذا اس کے حکم پر تیری بہن کی لاش کو راجا کے غنڈوں نے مناسب جگہ پھینک دیا"۔

اورنگزیب نے بڑے تحمل سے دھومنی کی بات سنی اور پھر اس سے پوچھا کہ کیا تم بھی اُن لوگوں میں شامل تھے جنہوں نے میری بہن کی لاش کو سوکھے کنوئیں میں پھینکا تھا۔

"نہیں، اورنگزیب بھائی!" دھومنی نے کہا۔ "میں اس وقت چوبارے کی رسوئی میں راجا کھیرن کے دوستوں کے لئے شراب اور میوہ جات کا بندوبست کر رہا تھا۔ بھگوان جانتا ہے جس وقت تمہاری بہن کو راجا کھیرن اور

اس کے دوست اپنی ہوس کا نشانہ بنا رہے تھے تو وہ منظر مجھ سے اور میرے ساتھی پران سے دیکھا نہیں جا رہا تھا"۔

"یہ پران کون ہے؟"

"اورنگزیب بھائی! دراصل پران اور میں راجا کھیرن کے ڈیرے کی رسوئی میں اس کے جل پان کے فرائض سرانجام دیتے ہیں"۔

اس کے بعد اورنگزیب نے دھومنی سے مکیش، بلراج، سالو کے بارے میں تفصیل سے اُن کی رہائش گاہوں کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔

آخر میں دھومنی نے اسے نصیحت کی کہ اُسے قانون سے کوئی انصاف نہیں ملے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ راجا کھیرن کے ہاتھ بہت لمبے اور اثر رسوخ والے ہیں۔ وہ اپنی دولت کی بدولت قانونی مشینری کو اپنے مقصد کے لئے کرتا ہے۔ دھومنی نے اس کے سامنے یہ بھی انکشاف کیا کہ زمیندار راجا کھیرن نے تھانیدار دھرم نہل کے منہ میں بھی بڑے نوٹوں کی گڈیاں ٹھونس کر اس کا منہ بند کر دیا تھا۔ تھانیدار دھرم نہل نے جان بوجھ کے قتل اور عزت لٹنے میں کسی کو ملزم نامزد نہیں کیا بلکہ اُس نے نامعلوم ملزمان کے خلاف کچا پرچہ کاٹا ہے۔

"دھومنی! تم اس سلسلے میں کس طرح میری مدد کر سکتے ہو؟" اورنگزیب نے پوچھا۔

دھومنی نے اُسے کہا کہ وہ ڈیرے کی ہر خبر اُسے کسی طے شدہ جگہ پر دیا کرے گا۔ دونوں واپس اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔

گھر پہنچ کر اورنگزیب نے سب سے پہلے دھومنی کی طرف سے کیا گیا انکشاف جب اپنے باپ ولایت الدین کو بتلایا تو اس نے پہلے راجا کھیرن کے اس میں ملوث ہونے کو تسلیم نہ کرتے ہوئے اُسے کہا کہ راجا کھیرن ایک اچھا اور ہمارا ہمدرد انسان ہے۔ اس نے نہ صرف میرا دو سو روپے کا وظیفہ باندھ دیا ہے بلکہ اپنی مارکیٹ میں اُس نے مجھے دُکان بھی دی ہے اور اُس سے بڑھ کر اُس نے نورالعین کو تلاش کرنے اور پھر اس کے قتل ہونے کے بعد تھانہ کچہریوں میں ہماری کتنی مدد کی تھی۔ مجھے تو لگتا ہے کہ راجا کھیرن کے کسی دشمن نے تجھے اس کے خلاف من گھڑت کہانی سنا کر بھڑکا دیا ہے۔ نہیں بیٹا لگتا ہے تجھے غلط فہمی ہو گئی ہے۔ تُو مجھے اُس کا نام تو بتلا جس نے تجھے یہ بات بتلائی ہے۔ باپ کے بہت اصرار کے باوجود اورنگزیب نے دھومنی کا نام نہ بتلایا۔

دوسرے روز اورنگزیب تھانیدار دھرم نہل کے پاس تھانے پہنچا اور اسے کہا کہ وہ نورالعین کی عزت لٹنے اور قتل کے سلسلہ میں راجا کھیرن کے خلاف پرچہ کاٹے۔ تھانیدار دھرم نہل نے اُسے جھڑکی دیتے ہوئے کہا کہ تیرے پاس اس کا کوئی ثبوت ہے کہ راجا کھیرن ہی اس میں ملوث ہے۔ اورنگزیب نے اسے کہا کہ یہ بات مجھے اُس کے ڈیرے کے ایک خاص آدمی نے بتلائی ہے۔

"تو مجھے اُس گواہ کا نام بتلائے گا تو میں اس کی بنیاد پر راجا کھیرن کے خلاف پرچہ کاٹوں گا"۔ تھانیدار نے کہا۔

اورنگزیب جانتا تھا کہ اگر اس نے دھومنی کا نام بتا دیا تو راجا کھیرن اسے بھی مروا دے گا۔ اس لئے اس نے تھانیدار سے کہا کہ وہ پرچہ کاٹ لے۔ وہ وقت آنے پر گواہ پیش کر دے گا۔

تھانیدار نے اُسے لتاڑ کر تھانے سے بھگا دیا۔ تھانے سے ذلیل و خوار ہونے کے بعد اورنگزیب اپنے گھر نہ آیا۔ اس کا باپ ساری رات دروازہ پر اس کی راہ تکتا رہا۔ اسی طرح پندرہ دن ہو گئے اورنگزیب کا کچھ پتا نہ چلا کہ وہ کہاں گیا۔

اُدھر زمیندار کھیرن نے اس کے باپ ولایت الدین کو یہ کہہ کر ذلیل و خوار کرنا شروع کر دیا کہ میں نے

تیرے خاندان پر لاتعداد احسانات کیے ہیں۔ تیرا بیٹا مجھے ہی نورالعین کے قتل کے جرم میں ملوث کر رہا ہے۔ راجا کھیرن نے اس کے باپ کو دھمکی دی کہ وہ اس کا ماہانہ وظیفہ بند کر دے گا بلکہ اُسے اُس کی دُکان سے بھی بے دخل کر دے گا۔

اورنگزیب کے لاپتہ ہونے کے پندرہ روز بعد رات کے تیسرے پہر راجا کھیرن کے ڈیرے کی پچھلی دیوار میں سے دس نقاب پوش کودے۔ انہوں نے سب سے پہلے وہاں کے دو چوکیداروں کے ہتھیار چھینے اور پھر اُن کو باندھ دیا۔ اس کے بعد وہ نقاب پوش راجا کھیرن کی خوابگاہ میں گھسے۔ اُن نقاب پوشوں نے راجا کھیرن اور اس کی پتنی کو سوتی حالت میں بندوقوں کے بٹ مار کر اٹھایا۔ دونوں ہڑبڑا کر اٹھے۔ ان نقاب پوشوں میں سے ایک نے اپنا نقاب اٹھایا تو راجا کھیرن اُسے دیکھ کر دہل گیا۔

''تم اورنگزیب، کیا چاہتے ہو؟'' اس نے ہڑبڑائی آواز میں کہا۔

اورنگزیب نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی بندوق کا بٹ اس کے سر پر مارتے ہوئے کہا۔ ''اورنگزیب نہیں، رنگا ..... اورنگزیب مر چکا ہے۔ میں تجھے جان سے مارنے آیا ہوں لیکن اگر تو میرے سامنے میری بہن کی عزت لوٹنے اور اس کے قتل میں ملوث ہونے کا اقرار کرے تو میں تیری زندگی بخش دوں گا..... میرے سوال کا جلدی جواب دے کھیرن! ورنہ میں گولی کا سیسہ تیرے سینے میں اتار دوں گا''۔

''بھگوان کے واسطے میرے پتی کو نہ مارو''۔ اس کی بیوی اورنگزیب کے قدموں پر گر کر اس کی زندگی کی بھیک مانگنے لگی۔

''میری تجھ سے کوئی دشمنی نہیں ہے، تو درمیان میں نہ آ''۔ اورنگزیب نے ڈپٹ کر کہا۔ ''مجھے راجا کھیرن کے

دو چیزیں

☆دو گھونٹ اللہ کو بہت پسند ہیں ایک غصے کا دوسرا صبر کا۔
☆دو قطرے اللہ کو بہت پسند ہیں ایک جہاد میں خون کا قطرہ اور تنہائی میں خوف خدا سے نکلا آنسو۔
☆دو قدم اللہ کو بہت پسند ہیں۔ فرض نماز کے لئے اٹھا اور بیمار کی عیادت کے لئے اٹھا قدم۔ (نسیم سکینہ صدف)
☆محبت کرنے والے کو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوتی اور ضرورت مند کو کسی چیز سے محبت نہیں ہوتی۔ (حکیم محمود)
☆دو چیزیں کسی کی شخصیت کی وضاحت کرتی ہیں:
(1) صبر۔ جب آپ کے پاس کچھ بھی نہ ہو۔
(2) آپ کا رویہ۔ جب آپ کے پاس سب کچھ ہو۔
(نبیلہ نازش)

منہ سے صرف یہ سننا ہے کہ وہ میری بہن کا مجرم ہے کہ نہیں''۔

راجا کھیرن کی کمر میں ایک نقاب پوش نے بڑی زور سے گھونسا مارا جس سے وہ لڑکھڑا گیا۔ ''بول جو سوال رنگا پوچھ رہا ہے ہاں یا ناں؟ نہیں بولتا تو میں تیری زندگی کی ڈور کاٹ دوں''۔

''ہاں، ہاں ...... یہ سچ ہے''۔ کھیرن نے لرزتی آواز میں کہا۔ ''میں نے اور میرے دوستوں نے نورالعین کی نہ صرف عزت لوٹی تھی بلکہ اُس کے بعد میں نے اپنے گناہ کا ثبوت چھپانے کے لئے اس کا گلا دبا کر مار دیا تھا''۔

اس اقرار جرم کے بعد وہ اورنگزیب سے اپنی زندگی کی بھیک مانگنے لگا۔ دوسرے کمرے سے راجا کھیرن کی جوان بیٹی سندری اپنی آنکھیں ملتی ہوئی آئی۔

''کیا ہوا پتا جی!''

''سندری تم اندر جاؤ''۔ راجا کھیرن کی بیوی نے گھبرائی ہوئی حالت میں اُسے کہا۔

اورنگزیب نے سندری کو دیکھا تو اس نے اپنے نقاب پوش ساتھیوں کو کہا۔ "اسے قابو کرو"۔

"تم جو چاہے مجھے سزا دے دو"۔ کھیرن نے التجا کی۔ "لیکن میری لاڈلی بیٹی کو ہاتھ نہ لگانا"۔

"میں تجھے ایسی موت دوں گا جس سے تُو ایک دم نہیں بلکہ روز مرے گا۔ اسی طرح تڑپے گا جس طرح میرا خاندان میری ماں میرا باپ اور میں تڑپا ہوں"۔ اورنگزیب نے قہر بھری آواز میں کہا۔ "اٹھا لو اس کی لاڈلی بیٹی کو"۔

"نہیں، نہیں..... اتنا ظلم نہ کرو"۔ کھیرن نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

اورنگزیب نے ایک گولی راجا کھیرن کی ٹانگ میں ماری اور اس کی بیوی کو کہا کہ اگر تُو نے مزید رونا دھونا کیا تو میں تیری سندری کو گولی مار دوں گا۔ لہٰذا تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ تم اپنی زبانیں بند رکھو۔ نقاب پوش ساتھیوں نے سندری کے منہ میں کپڑا ٹھونسا اور اُسے کندھے پر اٹھا کر بجلی کی رفتار سے راجا کھیرن کے ڈیرے سے بھاگ گئے۔

راجا کھیرن کے ڈیرے میں نقاب پوش اورنگزیب اور ساتھیوں کے حملہ اور سندری کے اغوا کی خبر سن کر پورے گاؤں میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ لوگ دانتوں تلے انگلیاں دبا کر حیرت کا اظہار کر رہے تھے۔ تھانیدار دھرم نہل کی قیادت میں پولیس کی بھاری نفری راجا کھیرن کے ڈیرے میں پہنچ گئی۔

ہسپتال میں راجا کھیرن کے پاؤں میں لگی گولی کا آپریشن ہوا تھا۔ وہ ہسپتال میں داخل تھا جبکہ اس کی بیوی پنڈال میں جمع دیہاتیوں اور پولیس کے سامنے واویلا کر رہی تھی۔ تھانیدار راجا کھیرن کی بیوی کو یہ تسلی دے رہا تھا کہ میں اس بے حیثیت چوہے کو کبھی شیر نہیں بننے دوں گا۔ اورنگزیب کی اتنی پسلی نہیں ہے کہ وہ کالا نقاب پہن کر رنگا ڈاکو کی شکل اختیار کرے۔ تقریباً دو گھنٹہ بعد راجا کھیرن پاؤں میں پٹی بندھا ہوا آپریشن سے فارغ ہو کر وہاں پہنچ گیا۔ وہ حالانکہ شدید تکلیف میں تھا۔

"راجا صاحب! آپ فکر نہ کریں" تھانیدار دھرم نہل اس کے قریب گیا اور اُسے کہا۔ "میں بہت جلد اورنگزیب اور آپ کی بیٹی کو آپ کے سامنے پیش کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا"۔

"تُو نے اب تلک کیا کیا ہے؟" راجا کھیرن نے اس پر غصہ سے چڑھائی کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے یہ الفاظ سنا کر کھوکھلی تسلیاں نہ دے کہ میں اورنگزیب کے قبضے سے سندری کو چھڑا لوں گا۔ مجھے ہر حال میں اورنگزیب اور اپنی بیٹی چاہئے اور یاد رکھ اگر تُو اس سلسلہ میں ناکام لوٹا تو اسی کرب سے گزرے گا جس میں میں گزر رہا ہوں"۔

"راجا صاحب!" تھانیدار دھرم نہل دہل کر بولا۔ "میں ابھی اور اسی وقت اورنگزیب کی تلاش اور سندری کی بازیابی کے لئے چھاپہ مار ٹیمیں تشکیل دیتا ہوں"۔

تھانیدار دھرم نہل نے اورنگزیب کی گرفتاری کے لئے فوری طور پر پولیس کی تین ٹیموں کی منظوری ہیڈ آفس سے لی۔ پولیس کی ان تینوں ٹیموں نے اورنگزیب کو گاؤں در گاؤں بدمعاشوں کے ٹھکانوں اور جہاں جہاں انہیں اس کی موجودگی کا شک تھا وہاں اسے خوب تلاش کیا لیکن وہ ناکام رہے۔ اسی دوران راجا کھیرن نے بڑے پولیس ہیڈ کوارٹر لاہور میں اورنگزیب کے ہاتھوں اپنی بیٹی کے اغوا کی رپورٹ کر دی۔ اس کی اس رپورٹ پر اورنگزیب کو تلاش کرنے کے لئے مزید پولیس پارٹیاں تشکیل دی گئیں اور اس کی براہ راست نگرانی ایس پی سنگھو نے سنبھال لی لیکن اورنگزیب کا کچھ علم نہ ہو سکا۔ یہ خبر ہندوستان سے نکلنے والے بڑے اخبارات اور ریڈیو کی زینت بن گئی۔

ایک دن راجا کھیرن کے خاص آدمی مکیش کی

سربریدہ لاش گاؤں کے قریب ایک ویرانے سے ملی۔
کیشؔ ان مجرموں میں شامل تھا جنہوں نے نورالعین کی عزت لوٹی تھی اور مقتولہ کو سوکھے کنویں میں پھینکنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ ہر زبان پر ایک ہی جملہ تھا کہ اورنگزیب نے اپنی بہن کا بدلہ لیا ہے اور وہ باقی مجرموں کو بھی نہیں چھوڑے گا۔

اورنگزیب کے ہاتھوں کیشؔ کی ایسی بھیانک موت کو دیکھ کر پورے گاؤں میں سراسیمگی اور خوف کی لہر دوڑ گئی۔ پولیس نے اس کے باپ ولایت الدین کو اس خیال سے اپنی حراست میں لے لیا کہ اپنے باپ کی محبت کی خاطر اورنگزیب لامحالہ اپنی گرفتاری دے گا لیکن پولیس کی یہ سکیم بھی ناکام ثابت ہوئی۔

پولیس کی انٹیلی جنس رپورٹ کے مطابق اورنگزیب نے زمیندار راجا کھیرن کے ہاتھوں اپنی بہن کی عزت لٹنے اور قتل اور پولیس انتظامیہ کی جانب سے عدم تعاون، بے حسی سے بددل ہو کر راجا کھیرن اور اس کے ساتھیوں سے بذاتِ خود انتقام لینے کا فیصلہ کیا اور اس نے اردگرد کے وارداتیوں کے ساتھ مل کر اپنا ڈاکوؤں کا گروہ بنا لیا ہے اور اس کا ٹولہ ڈسکہ تا جالندھر کے درمیان کسی خفیہ مقام میں چھپا بیٹھا ہے۔ اب وہ اورنگزیب سے "رنگا ڈاکو" کے نام سے شہرت پا چکا تھا۔

دراصل اورنگزیب کو رنگا ڈاکو کا خطاب اس وقت کے میڈیا نے انگریزوں کی ایما پر دیا تھا۔ رنگا ڈاکو نے اپنی وارداتوں کا دائرہ پانی پت تک مزید بڑھا دیا تھا۔ اس نے ایک آزادی پسند تحریک باغیوں کے گروہ سے اپنے ٹولے کا الحاق کر لیا تھا۔ اس تحریک آزادی کی قیادت اتم سنگھ کا ٹولہ کرتا تھا۔ رنگا ڈاکو اور اتم سنگھ اعلیٰ انگریز اور انڈین افسران کو نشانہ بنایا کرتے تھے۔ انہوں نے لائلپور (فیصل آباد) کے ڈپٹی کمشنر مسٹر ٹومز، گورا منیجر میو (Mioy) کو گولی ماری۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے کئی بار سرکاری خزانوں کے کانواؤں (قافلہ) کو لوٹا تھا۔

حکومتِ وقت نے اس زمانہ میں رنگا ڈاکو کو زندہ یا مردہ گرفتار کرنے پر 20 ہزار روپے نقد اور 10 مربعہ نہری زمین بطور انعام کا اعلان کیا تھا۔

اُس زمانے کے لوگ بتلاتے ہیں کہ رنگا ڈاکو نے اپنی بہن نورالعین کی عزت لوٹنے والے ایک کردار سونو کے گھر میں گھس کر پہلے اُس کی جوان بیوی کو قابو کرنے کے بعد اپنے ہی ڈاکو ٹولہ کے ایک ڈاکو کے حوالہ کر دیا تھا جس نے پہلے سانو کے سامنے اس کی عزت لوٹی اور پھر اسے سانو کے حوالہ کرنے کے بعد اُس کے دونوں بازوؤں کو گولیوں کا برسٹ مار کر ساری زندگی کے لئے اپاہج کر دیا۔ سانو نے طیش میں آ کر ڈاکوؤں کے ہاتھوں عزت لٹنے کے بعد اپنی بیوی کو گولی مار دی۔

رنگا ڈاکو کا کہنا تھا کہ اُسے زمینداروں، گوروں سے نفرت ہے۔ یہ گورے ظالم زمینداروں کے بل بوتے پر غریب عوام پر ظلم ڈھاتے ہیں۔

ادھر راجا کھیرن کی بیٹی سندری کو رنگا ڈاکو کے ہاتھوں اغوا ہوئے اڑھائی سال گزر گئے۔ اس کی حالت نیم پاگلوں جیسی ہو گئی تھی۔ ممتا کی ماری اس کی بیوی نے اس کا جینا حرام کیا ہوا تھا کہ وہ ہر قیمت پر اس کی بیٹی کو ظالم رنگا ڈاکو کے ہاتھوں سے چھڑائے۔

گوروں نے رنگا ڈاکو کے سر کی قیمت 20 ہزار روپے سے بڑھا کر 50 ہزار روپے کر دی تھی جس میں سے 30 ہزار روپے راجا کھیرن نے حکومت کو دینے کا وعدہ کیا تھا۔

ایک دن راجا کھیرن کے ڈیرے میں ایک چٹھی ملی جس میں سندری کی لکھائی میں لکھا گیا تھا کہ میں نے مسلمان ہونے کے بعد اپنی مرضی سے اورنگزیب سے شادی کر لی ہے اور آپ کا ایک نواسہ بھی ہے۔ آخر میں اس نے لکھا کہ اورنگزیب ایک اچھا قدردان انسان

ہے۔ وہ تم لوگوں کے ظلم کی بناء پر ایک شریف النفس انسان ہونے کے باوجود ڈاکو بنا ہے۔ مجھے آپ سے نفرت اور رنگا ڈاکو کی بیوی ہونے پر فخر ہے۔ ہمیں تلاش کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ (سندری)

رنگا ڈاکو کو کس طرح پکڑا اور سندری کو اس کے چنگل سے کیسے چھڑایا جائے۔ انتظامیہ کے افسران اس مسئلہ پر سر جوڑ کر غور و خوض کرنے لگے۔

ایک دن پولیس انٹیلی جنس کے کارندوں نے انتظامیہ کو یہ خفیہ رپورٹ دی کہ اورنگزیب نے اپنی بیوی سندری اور اور بچے کو محلہ افغاناں میں اپنے ایک جگری دوست موسیٰ خان کے مکان میں چھپا کر رکھا ہوا ہے اور وہ ہر جمعہ کو اپنا روپ بدل کر سندری سے ملنے آتا ہے۔

ایس پی سنکھو سنگھ بڑی احتیاط سے اورنگزیب کو قابو کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ضلع جہلم سے بھاری اضافی پولیس نفری کو بلوایا جن میں زیادہ تر ماہر نشانہ باز کمانڈوز تھے۔ وہ مکان کی نگرانی کرنے لگے۔ آخر چار دن بعد ان کی محنت رنگ لائی۔ رنگا ڈاکو بھیس بدل کر اپنے پانچ ساتھیوں کے ساتھ محلہ افغاناں میں موسیٰ خان کے گھر میں اپنی بیوی سندری اور بیٹے سے ملنے آیا تو پولیس کی بھاری نفری نے اس مکان کو اپنے حصار میں لے لیا۔ ایس پی سنکھو نے پولیس نفری کو یہ ہدایات جاری کی تھیں کہ ہر ممکن طریقہ سے سندری کو زندہ بازیاب کروانا ہے نیز اورنگزیب کو کسی صورت میں بھاگنے نہیں دینا۔

رنگا اپنے پانچ ڈاکو ساتھیوں کے ساتھ سندری اور بیٹے کے کمرے میں موجود تھا۔ اسی دوران ایس پی سنکھو نے میگافون سپیکر پر اُسے باور کرواتے ہوئے کہا کہ اب تم مکمل طور پر پولیس کی بھاری نفری کے نرغے میں ہو۔ تمہارے لئے بہتر یہی ہے کہ تم سندری، اپنے بچے اور اپنے ساتھیوں سمیت خود کو قانون کے حوالے کر دو۔ میرا تم سے وعدہ ہے کہ میں تم لوگوں کی زندگیوں کو ہرگز نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔

اورنگزیب نے سندری کو کہا کہ تُو بچے سمیت پولیس کے پاس چلی جا۔ یہ کتے مجھے کسی حالت میں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ سندری نے اورنگزیب سے پوچھا کہ کیا تُو بھی ہمارے ساتھ اپنے آپ کو پولیس کے حوالہ کرے گا؟ اُس نے کہا کہ نہیں میں مر کر بھی ایسا نہیں کروں گا۔

سندری نے اس کے پاؤں پر گر کر کہا کہ تم میری خاطر نہیں تو اپنے بچے کی خاطر اپنی ضد چھوڑ کر اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دو۔

اورنگزیب نے بھی اپنی جگہ ضد پکڑ لی کہ وہ مر جائے گا لیکن وہ خود اور اپنے ساتھیوں کو کبھی بھی پولیس کے حوالے نہیں کرے گا۔ سندری نے اورنگزیب کے کندھے پر اپنا سر رکھتے ہوئے قسم کھائی کہ وہ ہر حال میں اس کے ساتھ ہی رہے گی۔ اورنگزیب نے اپنے ڈاکو ساتھیوں کو کہا کہ سندری اور بچے کو زبردستی پکڑ کر گھر کا دروازہ کھول کر پولیس کے حوالے کر دیں۔ انہوں نے دونوں کو زبردستی گھسیٹ کر دروازہ سے باہر نکالنے کی کوشش کی لیکن سندری اُن سے اپنا آپ چھڑا کر واپس اورنگزیب کے پاس آ گئی۔ اسی کشمکش میں ایس پی سنکھو نے اپنے پولیس کمانڈوز کو حکم دیا کہ وہ گھر کے گرد اپنا حصار تنگ کر دیں۔ اُدھر اورنگزیب نے پولیس کی اپنے گھر کی جانب پیش قدمی کو بھانپا تو اس نے اپنے پانچوں ساتھیوں کو پوزیشن لے کر پولیس سے آخری وقت تک مقابلہ کرنے کا حکم دیا۔ اُس نے اپنے چاروں اسلحہ بردار ساتھی چھت پر چڑھا دیئے۔ جبکہ اُس نے خود اپنے ایک ساتھی کے ساتھ مکان کے نچلے کمرے کی کھڑکیوں کی آڑ لے کر پولیس سے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

اُدھر ایس پی سنکھو سنگھ نے پولیس نفری کو حکم دیا کہ وہ پہلے مقابلہ کرنے والوں کی جانب بے ہوش کرنے والی گیس پھینکے (اس کی پہلی ترجیح یہ تھی کہ سندری، بچے اور

تمام ڈاکوؤں کو زندہ گرفتار کیا جائے)۔

ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ایس پی سنگھو سنگھ نے جب یہ محسوس کیا کہ اورنگزیب اور اس کے ساتھیوں کی جانب سے شدید مزاحمت اور مقابلہ ہو رہا ہے اور بے ہوش کرنے والی گیس سے خلاف توقع کوئی اثر نہیں ہو رہا تو اس نے اپنے نشانہ باز پولیس کمانڈوز کو حکم دیا کہ وہ سب سے پہلے چھت سے مقابلہ کرتے رنگا کے ڈاکو ساتھیوں کو گولی کا نشانہ بنائیں۔ پولیس نشانہ بازوں نے چھت پر چڑھے مقابلہ کرتے چاروں ڈاکوؤں کو جب مار دیا تو رنگا اور اس کے ساتھی نے خود چھت پر چڑھ کر مقابلہ کی ٹھانی۔ دونوں نے مکان کی چھت پر چڑھ کر آگے بڑھتی پولیس پر گولیاں برسانا شروع کر دیں جبکہ سندری پستول بھر بھر کر دونوں کو چھت پر سپلائی کرتی رہی۔ دونوں جانب سے چھوٹے بڑے اسلحہ کا بے دریغ آزادانہ استعمال کیا جا رہا تھا۔ ماحول میں بارود اور دھوئیں کی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔

پولیس اور رنگا ڈاکو کی جانب سے مقابلہ تقریباً دو گھنٹہ جاری رہا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ یہ سلسلہ ایک خوفناک دھماکے کی آواز سے یکدم رک گیا۔ یہ گرینیڈ کا دھماکہ تھا۔

ایس پی سنگھو کا یہ خیال تھا کہ شاید مقابلہ کرتے بقیہ تینوں نے اسلحہ ختم ہونے کے بعد مشترکہ خودکشی کر لی ہے۔ ایس پی نے کچھ دیر مزاحمت کاروں کی جانب سے مزید متوقع مزاحمت کا انتظار کیا۔ اسے جب قوی یقین ہو گیا کہ سارے مارے جا چکے ہیں تو اس نے پولیس پارٹی کو مکان کے اندر جانے کا حکم دیا۔ پولیس جب مکان کے اندر گھسی تو کمرے کے اندر انہیں سندری کی لاش سے چمٹا بے ہوش بچہ اور قریب پڑا شدید زخمی حالت میں رنگا ڈاکو کا ساتھی ملا۔ جبکہ چھت پر اس کے چاروں ڈاکو ساتھیوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں لیکن حیرت انگیز طور پر انہیں پورے گھر میں اورنگزیب کی لاش کہیں بھی نہ ملی۔

وہ کہاں گیا؟ وہ اگر پولیس مقابلہ میں مارا گیا تو اس کی لاش کہاں گئی۔ پولیس پارٹی کو ان سوالات کے جوابات نہ مل سکے۔ تاہم رنگا ڈاکو کے شدید زخمی ساتھی نے دم توڑتے ہوئے یہ بیان دیا تھا کہ میرے ساتھ آخری وقت تک اورنگزیب چھت پر پولیس سے مقابلہ کر رہا تھا۔ میری کمر میں گولی لگ گئی تھی اس نے مجھے کہا تھا کہ نیچے کمرے میں چلے جاؤ۔ میں جب نیچے آیا تو سندری اپنے بچے کے ساتھ چمٹی سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ اس نے مایوسی سے کہا کہ ہمارے پاس گولیاں ختم ہو گئی ہیں تم اورنگزیب کو نیچے بلا لو تاکہ اب ہم اپنے آخری لمحوں میں اپنی زندگی اور موت کا فیصلہ کر سکیں۔ میں نے آواز دے کر چھت پر چڑھے اورنگزیب کو کمرے میں نیچے بلایا تھا۔

اورنگزیب نے نیچے اتر کر سندری اور مجھے کہا کہ میں تمہیں اس بات کی اجازت دیتا ہوں کہ تم اپنے آپ کو پولیس کے حوالہ کر دو۔ اس طریقہ سے تم تینوں کم از کم زندہ رہ سکو گے لیکن سندری اور میں نے اُسے وچن دیا تھا کہ ہم سب ساتھ جئیں اور مریں گے۔ اس کے ساتھ ہمارے کانوں میں گرینیڈ پھٹنے کی سمع خراش آواز سنائی دی۔ میرے اعصاب شل ہو گئے تھے۔ مجھے اس کے بعد کچھ بھی پتہ نہ چلا بعد میں وہ شدید زخمی ڈاکو بھی مر گیا۔

پولیس پارٹی نے اس مکان تو کیا اس علاقہ کا چپہ چپہ کئی بار کھنگالا لیکن انہیں کہیں بھی اس امر کا سراغ نہ مل سکا کہ حیرت انگیز اور پُراسرار طور پر اورنگزیب کی لاش کہاں گئی۔ آیا جبکہ وہ مرا بھی تھا یا کسی طرح پولیس کا نرغہ توڑ کر بھاگ گیا تھا۔

رنگا ڈاکو کا آج تک پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں گیا اور نہ ہی وہ کبھی منظر عام پر آیا۔ اس کے بیٹے کو ایک ہندو بے اولاد جوڑے نے گود لے لیا تھا۔

طب و صحت

مریض دوائی منگوانے کے لئے اپنا حوالہ نمبر ضرور لکھا کریں
رپورٹس اور خطوط پر اپنا موبائل نمبر لازماً لکھیں

دستِ شفاء

ایک پُراسرار مرض کا علاج!

ڈاکٹر رانا محمد اقبال (گولڈ میڈلسٹ)
0321-7612717
ڈی۔ایچ۔ایم ایس (DH.Ms)
ممبر پیرا میڈیکس ایسوسی ایشن پنجاب
ممبر پنجاب ہومیو پیتھک ایسوسی ایشن
شعبہ طب و نفسیات

اس ماہ کا کیس دینے سے قبل ہم قارئین سے ایک گزارش کرنا ضروری سمجھتے ہیں وہ یہ کہ جب بھی ڈاکٹر صاحب سے ملنا ہو پہلے فون پر ٹائم ضرور لیں۔ اچانک آنے کی صورت میں پیدا ہونے والی پریشانی کے وہ خود ذمہ دار ہوں گے۔ دوسری بات یہ کہ دوا شروع رکنے سے قبل "فارم ہدایت" بغور پڑھیں تاکہ ہر بات ان کے ذہن میں کلیئر ہو اور مجوزہ مدت تک علاج لازمی کرائیں تاکہ مرض کا جڑ سے خاتمہ ہو جائے۔

اب ہم اس ماہ کے کیس کی طرف آتے ہیں۔ یہ کیس تقریباً چار پانچ سال پرانا ہے۔ ہوا یوں کہ راولپنڈی میں ہمارے ایک نہایت قریبی عزیز ہیں ان کے والد صاحب آرمی میں کیپٹن تھے اور وہ خود اور دیگر اہلِ خانہ (سب بھائی) بھی ہومیو پیتھک ڈاکٹر ہیں اور میرے اس عزیز کی تو ماشاء اللہ بہت اچھی پریکٹس چل رہی ہے اور بہت نامی گرامی ڈاکٹر ہیں اور خدا نے انہیں بہت عزت دی ہے۔

ایک بار میں اچانک راولپنڈی ایک سرکاری کام کے سلسلے میں گیا تو ان کے ہاں قیام کیا۔ صبح کو فیصل آباد سے چل کر دوپہر ان کے ہاں پہنچا، سب لوگ مل کر بہت خوش ہوئے۔ میں کھانا کھا کر سو گیا۔ شام کو جاگا تو سب اہلِ خانہ کو بہت سراسیمہ پایا۔ خاصا کرید کرید کر پوچھا تو معلوم ہوا کہ میرے بہنوئی کی والدہ صاحبہ کے دائیں ہاتھ میں بہت تکلیف ہے۔ سب ڈاکٹر صاحبان ان کے آگے پیچھے دوڑ رہے ہیں اور شہد کی مکھیوں کی طرح ساتھ ہی واقع (دوائی خانہ کے چکر کاٹ رہے ہیں) کبھی ایک صاحب کوئی دوا کھلا رہے ہیں کبھی دوسرا

صاحب اپنی عقل کے مطابق دوسری دوا اور پھر تیسرے صاحب تیسری دوا۔ مگر درد ہے کہ کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا۔ ادھر وہ بیچاری درد سے بے حال مگر وہ اللہ کے نیک بندے سب اپنی اپنی ڈاکٹری لڑا رہے ہیں۔ مزید پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ معاملہ کئی دن سے چل رہا ہے مگر باوجود سب دوائیں اور تدبیریں (تعویذات، عملیات) کرنے کے معاملہ دن بہ دن گڑبڑ ہو رہا ہے اور کوئی ڈاکٹر ہار ماننے کو تیار نہیں حالانکہ مریضہ کی جان پر بنی ہوئی تھی مگر ان کو اپنے طریقہ علاج پر اتنا یقین تھا کہ جتنا مسلمانوں کو روزِ قیامت پر ہے۔

چونکہ میں بھی میڈیکل کے شعبے سے تعلق رکھتا تھا اس لئے رہا نہ گیا اور آخر دل کڑا کر کے پوچھ ہی لیا کہ جناب اگر مجھ ناچیز کو کسی قابل سمجھیں تو شاملِ راز کرلیں۔ شاید کوئی حل بتا سکوں۔ آخر کار نہ چاہتے ہوئے بھی انہیں بولنا پڑا (کیونکہ ان کی) ناک نیچی ہوتی تھی کہ ایک "حقیر ہومیو پیتھک" کے سامنے اعتراف شکست کیسے کریں۔ یاد رہے کہ میں شروع میں ایلو پیتھک پریکٹس بھی کرتا تھا اور اسے عار نہیں سمجھتا بشرطیکہ وہ کسی بنیاد (Base) پر کی جائے اور Proper Dose دی جائے۔ (یہ معاملہ بعد میں لکھوں گا)۔

بہرحال میں نے کہا کہ پہلے میں متاثرہ ہاتھ کا معائنہ کروں گا اور باقی معاملات بعد کے ہیں کہ کون سی دوا دینی ہے۔ جب میں نے ہاتھ دکھانے کو کہا تو انہوں نے اس کے اوپر لپٹا ہوا موٹا سا کپڑا کھولا۔ پھر ایک پٹی سی بندھی تھی وہ کھولی تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کے اوپر گندے ہوئے آٹے کا ایک پیڑا چوڑا کر کے رکھا ہوا ہے۔

"یہ کیا حرکت ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ دم کیا ہوا آٹا ہے"۔ انہوں نے بتایا۔ "درد کے لئے کسی نامی گرامی پیر صاحب نے دم کر کے دیا ہے کہ "ہاتھ پر باندھ دیں فوراً ٹھنڈ پڑ جائے گی"۔

مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹا ہو گیا تھا۔ پورے ہاتھ میں بلکہ بازو میں درد کی شدید لہریں اور جلن سوجن نمایاں۔ میں نے اس پیڑے کو اتارا اور پھر ہاتھ صاف کر کے معائنہ کیا تو حیرت انگیز انکشاف ہوا۔ دبا کر چیک کیا تو صاف پتا چلا کہ ساری ہتھیلی PUS سے بھری ہوئی ہے۔ اب میں نے انہیں بتایا کہ جب تک یہ PUS خارج نہیں کی جاتی نہ تو مریض کو سکون ہوگا اور نہ ہی کوئی دوا کام کرے گی۔

"یہ کیسے ہوگا؟" سب نے پوچھا۔

"ایک چھوٹا سا کٹ لگا کر انجکشن والی سرنج سے یہ مواد نکال دیں تو مسئلہ حل ہو جائے گا ورنہ مریضہ کی جان پر بنی رہے گی اور یہ انفیکشن پھیل بھی سکتی ہے، بعد میں کوئی مناسب دوا دیں گے"۔

"نہیں یہ نہیں ہو سکتا"۔ سب نے یک زبان ہو کر کہا۔

"کیوں بھئی اس میں کیا رکاوٹ ہے؟ میں تو ہمیشہ ایسے کیسوں میں ایسے ہی کرتا ہوں"۔ میں نے کہا۔ تب انہوں نے مزید انکشاف کیا کہ جناب ایسا اس لئے نہیں کر سکتے کہ مریضہ کو شوگر ہے اور جلد پر کٹ لگنے کی صورت میں خون بند نہ ہوگا اور مریضہ کی زندگی بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ میں نے انہیں کہا کہ جناب ایسا ہی کرنا پڑے گا کیونکہ اور کوئی طریقہ نہیں جس سے یہ PUS نکالی جا سکے۔ میں نے نہایت حیرت سے ان کی طرف دیکھا جنہیں اس قانون قدرت کے بارے میں قطعاً کوئی علم نہ تھا اور کئی لوگوں کو شاید اب بھی نہ ہو، وہ یہ کہ جب ایسا گندہ مواد جسم میں کہیں پیدا ہوتا ہے تو قدرت باقی جسم کو اس کے خطرناک اثرات سے محفوظ رکھنے کے لئے اس مادے

اور جسم کی جلد کے درمیان ایک موٹی جھلی پیدا کر دیتی ہے ورنہ اگر ایسا نہ ہو تو یہ گندہ مواد سارے جسم میں پھیل کر جلد ہی سارے خون کو زہریلا کر دے اور انسان کی جلد موت واقع ہو جائے۔ اس لئے اس کٹ یا Minor Surgery سے قطعاً کوئی نقصان نہیں۔ مگر یہ بات بڑی مشکلوں سے ان کے دماغ میں آئی اور وہ چار و ناچار اس بات پر تیار ہوئے۔ آپ یقین کریں کہ تقریباً دو سرنجیں 5cc کی نکلیں۔ پھر سپرٹ اور روئی سے زخم کو صاف کر کے Pyodene لگا کر پٹی باندھ دی گئی۔

جلد ہی مریضہ کے چہرے پر سکون آ گیا اور جس درد نے اسے کئی دن رات سے بے حال کیا ہوا تھا وہ فوراً ختم ہو گئی۔ وہ سب کتابی ڈاکٹر (پیار سے میں ہومیو پیتھک حضرات کو کتابی/ علاماتی ڈاکٹر کہتا ہوں) بے حد حیران تھے اور ممنون بھی کہ وہ درد جو سب ادویات دینے کے باوجود ختم نہ ہو رہی تھی اب غائب تھی (ابھی کوئی دوا میں نے نہیں دی تھی مگر درد کی وجہ ختم ہو گئی تھی) اب وہ دوا کے بارے میں پوچھنے لگے تو میں نے کہا کہ اب سب دوائیں بھی اثر کریں گی۔ اگرچہ کوئی ڈاکٹر اپنی "انا" کی وجہ سے مجھ سے دوا نہیں پوچھے گا تاہم عوام الناس کی بھلائی کی خاطر میں از خود دوائیں بھی لکھ دیتا ہوں۔ وہ یہ ہیں:

(1) Apis Mel6 1+1+1
(2) Heper SLF6 1+1+1
(3) Pyrogenium 6 1+1+1
(One week)

اگر دوائی 6 میں دستیاب نہ ہو تو 30 میں بھی دے سکتے ہیں۔

یہاں میں نے جو بات بتائی ہے اس کو تمام ڈاکٹر حضرات پھر پڑھیں اور آزمائیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ "علم" صرف کتابیں پڑھنے سے مکمل نہیں ہوتا، پریکٹیکل بھی ضروری ہے اور آخری بات یہ کہ کبھی بھی کسی Base کے بغیر صحیح علاج نہیں ہو سکتا۔ تمام ڈاکٹر حضرات سے میری گزارش ہے کہ اچھی طرح تسلی کر کے مرض کی وجہ دریافت کریں یعنی Diagnosis کریں اور پھر علاج میں ہاتھ ڈالیں بے شک کوئی بھی طریقہ علاج ہو، اس کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتا۔

آخری اور نہایت ہی اہم بات یہ ہے کہ تمام معالجین کبھی بھی مجوزہ Prescribed Dose سے زیادہ ہرگز نہ دیں۔ یہ تمام ادویات علیحدہ علیحدہ ہیں اور میں نہایت دکھ کے ساتھ ایک بات لکھتا ہوں کہ محض مریض پر دھاک بٹھانے کی خاطر بعض ڈاکٹر و حکیم حضرات مقرر کردہ خوراک Prescribed Dose سے بھی زیادہ دے دیتے ہیں جن کے نہایت خطرناک اثرات مریضوں پر نمودار ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ جلد آرام پر ضد نہ کریں اور معالج کو بتا دیں کہ مریض (خصوصاً نازک مزاج لوگ) کو دوا زیادہ یا تیز مقدار میں ہرگز نہ دیں بے شک دو دن کے بعد آرام آئے ہمیں جلدی نہیں ورنہ مریض کے ساتھ بعد میں جو ہوگا اس کے بارے میں آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ مریض جان سے بھی جا سکتا ہے، یا عمر بھر کے لئے معذور بھی ہو سکتا ہے۔

میں نے ایسے کئی کیس دیکھے ہیں مگر آفرین ہے ان ڈاکٹر حضرات پر کہ پروں پر پانی نہیں پڑنے دیتے اور مریض کو بلا ضرورت ڈبل ڈوز دے دیتے ہیں حالانکہ ان کے فارما کوپیا اور دیگر کتابوں میں کیئر یہ بات درج ہے مگر پتا نہیں کیوں وہ اپنی غلط بات پر بضد ہیں۔ بس اللہ ہی ان کو ہدایت دے سکتا ہے۔ آپ بھی دعا کریں!

دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

دھوکے باز دوسرے شخص پر اس قسم کا نفسیاتی اثر ڈالتے ہیں اور اپنی باتوں سے ایسا ہپناٹائز کرتے ہیں اور دوسرے کو ایسا سحر زدہ کر دیتے ہیں کہ وہ اس کی باتوں میں آ جاتا ہے

☆ ------------------------------0301-4845557------------------ حبیب اشرف صبوحی

دھوکہ بازوں کے واقعات اور کہانیاں ہم ازل سے سنتے آ رہے ہیں اور ابد تک یہ داستانیں رہیں گی۔ دھوکہ دینے والے اپنے فن میں اتنے ماہر ہوتے ہیں اور ایسے طریقے استعمال کرتے ہیں کہ چالاک سے چالاک آدمی بھی ان کے دھوکے میں آ جاتا ہے۔ روزانہ اخبارات میں اور اپنے ملنے جلنے والوں میں اس اس قسم کے واقعات وقوع پذیر ہوتے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ دھوکے باز دوسرے شخص پر اس قسم کا نفسیاتی اثر ڈالتے ہیں اور اپنی باتوں سے ایسا ہپناٹائز کرتے ہیں اور دوسرے کو ایسا سحر زدہ کر دیتے ہیں کہ وہ اس کی باتوں میں آ جاتا ہے اور اس کے اشاروں پر عمل کرنا شروع کر دیتا ہے۔ کچھ واقعات پیش کرتا ہوں جن کا مقصد یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی میں محتاط رہیں اور دھوکے بازوں سے بچیں۔

☆ آج سے تقریباً 40 سال قبل میں شام کو دفتر سے واپس آیا اور آرام کرنے کی غرض سے لیٹا ہی تھا کہ کال بیل بجی۔ میں بادل ناخواستہ اٹھا۔ کھڑکی میں سے نیچے دیکھا تو ایک شناسا سا چہرہ نظر آیا اور مجھے دیکھتے ہی نیچے آنے کو کہا۔ میں مجبوراً نیچے گیا۔ اس نے سلام دعا کے بعد میرے بڑے بھائی صاحب کے بارے میں پوچھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ وہ یہاں سے شفٹ ہو کر ماڈل ٹاؤن چلے گئے ہیں۔ ان کا گھر کا نمبر اور فون نمبر اس کو بتا

دیا کہ وہاں جا کر مل لیں۔ اس نے بتایا کہ آپ کے بڑے بھائی میرے بچپن کے دوست ہیں اور ہم ایک ساتھ اسکول میں پڑھتے رہے ہیں۔ میں واپڈا میں ملازم ہوں۔ دو گلیاں چھوڑ کر تیسری گلی میں میرا گھر ہے۔ میں اس وقت سخت پریشانی میں ہوں اور میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ میں آپ کے بھائی صاحب کے پاس ماڈل ٹاؤن جا سکوں میرا آٹھ سال کا بیٹا کئی دنوں سے ہسپتال میں داخل تھا۔ نمونیہ ہو گیا تھا، پیسہ پانی کی طرح بہا دیا لیکن اس کو شفا نہیں ہوئی اور آج اس کا انتقال ہو گیا ہے۔ میت گھر میں پڑی ہوئی ہے کفن دفن کے لئے بھی پیسے نہیں ہیں مجھے صرف 600 روپے چاہئیں جو پہلی تاریخ کو آپ کو مل جائیں گے۔

اتنا کہنے کے بعد اس نے اپنے ہاتھ کی گھڑی اتار کر میرے ہاتھ میں پہنا دی اور سونے کی انگوٹھی بھی اپنی انگلی سے اتار کر میرے ہاتھ میں پہنا دی اور کہا کہ یہ دونوں چیزیں آپ اپنے پاس رکھ لیں جب میں پیسے واپس کروں گا تو یہ دونوں چیزیں آپ سے لے لوں گا۔

یہ حرکات کرتے ہوئے اس کا چہرہ افسردہ ہو گیا اور آنکھوں میں آنسو بھی آ گئے۔ میں نے اس کو دونوں چیزیں واپس کر دیں اور کہا کہ میں آپ کی خدمت کروں گا۔ یہ دونوں چیزیں اپنے پاس رکھ لیں۔ گھر کے نزدیک ایک نائی نے مجھ سے کچھ رقم ادھار لی ہوئی تھی میں اس آدمی کو لے کر نائی کے پاس گیا تاکہ اس کی مجبوری بتا کر رقم اس سے واپس لوں۔ جب نائی کی دکان پر گیا تو پتہ چلا کہ وہ دکان پر نہیں ہے۔ کہیں کام سے گیا ہوا ہے۔ ایک گھنٹے تک آئے گا۔ میں نے اس آدمی سے کہا کہ وہ ایک گھنٹے تک آ جائے میں اس سے رقم لے کر تمہیں دے دوں گا اور واپس نہیں لوں گا۔

وہ آدمی کہنے لگا کہ میں ایک گھنٹے کا انتظار نہیں کر سکتا، آپ مجھے کم ہی پیسے دے دیں۔ میرا ایک ایک لمحہ تکلیف دہ گزر رہا ہے۔ میری کچھ مجبوریاں ہیں۔ گھر کے باہر ایک پھل والے کی دکان تھی جس سے میں پھل وغیرہ لیتا تھا۔ میں نے اس آدمی کی پریشانی بتائی اور کہا کہ تمہارے پاس اگر 600 روپے ہیں تو دے دو میں تمہیں ابھی گھر جا کر دیتا ہوں۔ اس نے اپنے غلے میں سے تمام پیسے نکالے وہ تقریباً 450 روپے نکلے۔ میں نے وہ پیسے گن کر اس آدمی کو دے دیئے اور کہا کہ اس کو آپ اپنی ضرورت کے لئے پورا کریں اور مجھے واپس نہ کریں۔ اس نے شکریہ ادا کرتے ہوئے پیسے اپنی جیب میں ڈال لئے اور گھر کی طرف چل دیا۔

اس کے جاتے ہی محلے کے دو لڑکے جو نزدیک ہی کھڑے تھے، بھاگتے ہوئے میرے پاس آئے اور مجھ سے پوچھا کہ آپ نے اس کو کس سلسلہ میں پیسے دیئے ہیں۔ میں نے ساری کہانی ان لڑکوں کو بتا دی۔ اتفاق سے ان لڑکوں میں سے ایک لڑکے کا کوئی کام میں نے کروا دیا تھا جو ناممکن تھا، وہ میرا بڑا مشکور رہتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ یہ شخص بڑا دھوکہ باز ہے۔ مختلف حیلے بہانوں سے لوگوں سے پیسے ٹھگ لیتا ہے۔ آپ مجھے اجازت دیں کہ میں اس سے پیسے واپس لے کر آؤں۔ اس سے قبل بھی میں نے اس کو اس قسم کی واردات کرتے ہوئے پکڑا ہے۔ میں نے اس لڑکے کو اجازت دے دی۔ وہ بھاگا بھاگا گیا اور اس کو گریبان سے پکڑ کر کھینچتا ہوا لے آیا اور کہا کہ ان سے کس حساب میں پیسے لئے تھے۔ جب اس نے کوئی جواب نہیں دیا تو اس نے اس کے ایک تھپڑ مارا اور کہا کہ ان کے پیسے واپس کرو اور اس نے بغیر کسی حجت کے پیسے واپس کر دیئے۔ میں سوچتا رہا کہ انسان چند سو روپے حاصل کرنے کے لئے انسانیت سے کتنا گر جاتا ہے اور کتنا جھوٹ اور فریب کاری کرتا ہے۔ اب حقدار اور ناحق میں بھی تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

☆ میرے والد کے ایک دوست کی کتابوں کی

دُکان مسلم مسجد لوہاری دروازہ کے نیچے واقع تھی۔ انہوں نے ایک واقعہ سنایا کہ ایک روز صبح ایک نئی گاڑی شاندار قسم کی ان کی دُکان کے آگے آ کر کھڑی ہوئی۔ شوفر نے دروازہ کھولا اور ایک بڑے معزز آدمی ہاتھ میں چھڑی لئے ہوئے میری دُکان میں آئے اور بڑے پُرتپاک طریقے سے سلام کیا۔ ان کی شخصیت اتنی شاندار اور پُررعب تھی کہ میں اُن کے استقبال میں کھڑا ہو گیا اور کہا کہ فرمایئے میں کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ بڑی معیاری اور اچھی کتابیں شائع کرتے ہیں۔ میں کچھ کتابیں لینا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا کہ یہ کتابیں سامنے لگی ہوئی ہیں پسند فرمائیں۔ انہوں نے تین چار ہزار روپے کی کتابیں پسند کیں اور کہا کہ انہیں پیک کروادیں۔ میں نے پیک کروادیں۔ جب کتابیں پیک ہو گئیں تو انہوں نے ڈرائیور کو آواز دی اور کہا کہ یہ پیکٹ گاڑی میں رکھو۔

ڈرائیور پیکٹ اٹھا کر لے گیا۔ اس کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوئے اور کہا کہ بل بتایئے۔ میں نے رقم بتائی۔ انہوں نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا کہ کیا آپ کچھ رعایت کر سکتے ہیں یا نہیں؟ میں نے مروتاً کہا کہ آپ ویسے ہی لے جایئے۔ کہنے لگا کہ بہت بہت شکریہ اور بغیر رقم دیئے چلا۔ جب وہ چلا گیا تو جب مجھے ہوش آیا کہ وہ پیسے بھی دے کر نہیں گیا۔

☆ میرے ایک دوست بہت تعلیم یافتہ اور محتاط آدمی ہیں لیکن ایک روز وہ دھوکہ بازوں کے نرغے میں آ گئے اور بہت سمجھدار ہونے کے باوجود کئی ہزار روپوں کا نقصان اٹھانا پڑا۔

بقول ان کے ایک روز انہوں نے بنک سے ایک لاکھ روپے نکالے۔ پیسوں کو احتیاط سے جیب میں رکھا اور کچھ فاصلے پر گاڑی کھڑی تھی، اس میں جا کر بیٹھ گئے۔ ابھی گاڑی سٹارٹ کرنے والے تھے کہ ان کو محسوس ہوا کہ

غزل

ریحان آفاقی

روز اک مشغلہ تو رہتا ہے
اک نیا مسئلہ تو رہتا ہے

ہم ابھی ایک ہو نہیں پائے
درمیاں فاصلہ تو رہتا ہے

تجھ کو دل نے بھلا دیا لیکن
دِل میں اک آبلہ تو رہتا ہے

راستے ختم تو نہیں ہوتے
اک نیا راستہ تو رہتا ہے

طے جو کرتا ہے عشق کی منزل
عشق میں مبتلا تو رہتا ہے

کوئی شخص پیچھے سے ان کی گاڑی کے ساتھ ٹکرایا ہے اور گاڑی کے نیچے گھس گیا ہے۔ وہ فوری طور پر گاڑی سے اترے۔ دیکھا کہ ایک پندرہ سولہ سال کا لڑکا گاڑی کے نیچے گھسا ہوا ہے اور پانچ پانچ سو اور ہزار ہزار روپے کے نوٹ زمین سے اٹھا کر چن رہا ہے۔ میں نے اسے آواز دی کہ گاڑی کے نیچے سے نکلو یہ کیا کر رہے ہو؟ وہ فوری طور پر گاڑی کے نیچے سے نکل آیا اور کہا کہ یہ پیسے گاڑی کے نیچے گرے ہوئے تھے، آپ کے تو نہیں ہیں، چیک کر لیں؟ میں نے کہا کہ میرے نہیں ہیں۔ تھوڑی دیر وہ نوٹ گنتا رہا اور ایک طرف کو بھاگ گیا۔ میں دوبارہ گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی سٹارٹ کرنے لگا۔ اتنے میں ایک بوڑھا آدمی روتے ہوئے میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا کہ میں سامنے بنک سے پیسے نکلوا کر لایا تھا اور جہاں آپ کی گاڑی کھڑی ہے وہاں سواری کا انتظار کر رہا تھا۔ جب یہاں سواری نہیں ملی تو میں آگے چلا گیا، شاید آگے سے کوئی سواری مل جائے۔ جب سواری مل گئی اور میں اُس میں بیٹھنے لگا تو میں نے محسوس کیا کہ میری جیب میں رقم موجود نہیں ہے۔ میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ میں سواری میں نہیں بیٹھا اور یہاں تلاش کرنے آ گیا ہوں۔ پچاس ہزار روپے مالیت کے نوٹ تھے اور میں نے اپنی بچی کی شادی کے لئے نکلوائے تھے۔ میں نے بتایا کہ ایک لڑکے نے میری گاڑی کے نیچے سے نوٹ اٹھائے ہیں اور وہ سامنے کی طرف بھاگا ہے۔ وہ بوڑھا کہنے لگا کہ خدا کے لئے میری مدد کریں میں آپ کا احسان مند ہوں گا۔

میں نے بوڑھے کو گاڑی میں بٹھا لیا اور اس کو تسلیاں دیتا رہا اور وہ بوڑھا مجھے بتاتا رہا کہ ادھر چلیں ادھر چلیں۔ میں بڑا حیران تھا کہ اس کو کس طرح پتہ ہے کہ وہ لڑکا کہاں ہوگا؟ تھوڑی دور جانے کے بعد ہم نے لڑکے کو تلاش کر لیا۔ میں نے بوڑھے سے کہا۔ اس لڑکے کے پاس تمہارے پیسے ہیں۔ میں نے اس لڑکے سے کہا کہ تم نے جو پیسے میری گاڑی کے نیچے سے اٹھائے تھے وہ ان بزرگ کے ہیں۔ اس لڑکے نے نشانی پوچھی کہ 500 روپے کے کتنے نوٹ ہیں، 1000 روپے کے کتنے نوٹ ہیں؟ اس بوڑھے نے تعداد بتائی اور کہا کہ وہ سب نوٹ نئے ہیں۔ اس لڑکے نے گن کر نوٹ اس بزرگ کو دے دیئے۔ اب اس بزرگ نے لڑکے سے کہا کہ ان پیسوں کے ساتھ سونے کی انگوٹھی بھی تھی وہ بھی دو۔ لڑکے نے کہا کہ میری تلاشی لے لو جو پیسے میں نے اٹھائے تھے تمہیں دے دیئے۔ بوڑھا آدمی زور زور سے بولنا شروع ہو گیا اس کی آواز سن کر دو تین لوگ اور بھی آ گئے اور لڑکے سے کہا کہ تم تلاشی دو۔

لڑکے نے تلاشی دے دی۔ اب وہ بوڑھا آدمی کہنے لگا کہ یہ صاحب جو مجھے لے کر آئے ہیں ان کی بھی تلاشی لو۔ یہ لڑکے کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ مجھے بڑا غصہ آیا۔ میں نے بوڑھے سے کہا کہ تم شرم کرو، میں نے تمہاری مدد کی، گاڑی میں بٹھایا اور اس لڑکے تک پہنچایا۔ تم میرے احسان مند اور شکر گزار کیا ہو گے تم مجھ پر بھی الزام لگا رہے ہو۔ میرا نہ اس لڑکے سے تعلق ہے اور نہ تم سے۔ میں جا رہا ہوں۔ نیکی کا زمانہ نہیں ہے۔ وہ بوڑھا مسلسل یہی کہے جا رہا تھا کہ ان کی بھی تلاشی لو۔ دو تین آدمی وہاں کھڑے تھے وہ بھی بوڑھے کی تائید کرنے لگے کہ آپ بھی اپنی تلاشی دے دیں۔ بوڑھے آدمی کی تسلی ہو جائے گی۔ انہوں نے زبردستی میری تلاشی لینی شروع کر دی۔ میری جیب سے ایک لاکھ روپے نکالے اور خدا جانے کس طریقے سے 50 ہزار روپے اس میں نکالے اور باقی پیسے میری جیب میں ڈال دیئے اور کہا کہ آپ کی ہم نے تلاشی لے لی ہے۔ انگوٹھی نہیں ہے، آپ جا سکتے ہیں۔ جب گھر آ کر رقم گنی تو 50 ہزار روپے غائب تھے۔ خدا جانے انہوں نے کس طریقہ سے پیسے نکالے

کہ مجھے پتہ بھی نہیں چلا اور یہ نیکی میرے گلے پڑ گئی اور نیکی مجھے مہنگی پڑی۔

☆ میرے ایک دوست اپنی دُکان سے اٹھ کر جمعہ کی نماز کو جا رہے تھے، جیب میں کچھ رقم بھی تھی۔ ابھی مسجد سے کچھ دور ہی تھے کہ ایک لڑکا رنگ کی بالٹی لے کر سامنے سے آ رہا تھا۔ جب وہ نزدیک آیا تو وہ بڑی تیزی سے میرے دوست کے ساتھ ٹکرایا اور رنگ ان کے کپڑوں پر گر گیا اور وہ بھاگ کر ایک گلی میں چلا گیا۔ اتنے میں دو ہاریش لوگ بھاگے ہوئے میرے دوست کے پاس آئے اور افسوس کا اظہار کیا۔ لڑکے کو بُرا بھلا کہتے رہے اور کپڑے دھلانے کے بہانے مسجد میں لے گئے۔ قمیص اتروائی، رنگ کو صاف کیا اور قمیص پہنا دی اور فوری طور پر وہاں سے غائب ہو گئے۔ جب میرے دوست نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو رقم غائب تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ پورا ایک گینگ ہے۔

☆ چند ماہ قبل میں اپنے دوستوں کے ساتھ ایک دُکان میں بیٹھا ہوا تھا اور گپ شپ کا پروگرام چل رہا تھا کہ اتنے میں ایک ضعیف آدمی جو انتہائی کمزور تھا اور اس سے چلا بھی نہیں جاتا تھا، ہمارے پاس آ گیا اور درخواست کی کہ وہ فقیر نہیں اور نہ کچھ مانگنے آیا ہے بلکہ سخت بیمار ہے اور چلنے میں بھی دقت ہو رہی ہے۔ سخت بخار ہے، مجھے خالی دوائی دلوا دیں۔ اتفاق سے چند دُکانیں چھوڑ کر ایک ڈاکٹر کی دُکان تھی میں اُس کا ہاتھ پکڑ کر ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ اس کے پاس چار پانچ مریض بیٹھے تھے اور اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر کے کمپاؤنڈر سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب سے کہیں کہ اسے اچھی طرح چیک کریں اور اس کو دوائی دیں۔ جتنے پیسے ہوں گے میں دے دوں گا۔ کمپاؤنڈر نے کہا کہ ٹھیک ہے، آپ بے فکر ہو کر جائیں میں نے بزرگ آدمی سے کہا کہ اگر ڈاکٹر صاحب کوئی دوائی لکھ کر دیں تو میرے پاس لے کر نسخہ آ جائیں میں دوائیاں دلوا دوں گا اور اگر اپنے پاس سے دیں تب بھی مجھے بتا دینا۔ کچھ دیر بعد میں بزرگ ڈاکٹر کے پاس سے آیا اور ایک نسخہ دے دیا کہ ڈاکٹر صاحب نے لکھ کر دیا ہے۔ میں ایک کیمسٹ کی دُکان پر گیا اور کہا کہ ایک ہفتہ کی دوائیاں دے دو۔ وہ بزرگ کہنے لگا کہ مجھے ایک ماہ کی دوائیاں لے کر دو۔ میں بڑی دور سے آیا ہوں۔ میں نے کہا کہ باباجی آپ ایک ہفتہ دوائی استعمال کریں اگر اس سے آرام نہ آیا تو یہ دوائیاں بے کار جائیں گی اور اگر ان دوائیوں سے آرام آ گیا تو ڈاکٹر صاحب کو آ کر بتا دیں وہ نسخہ میں مزید تبدیلی کر کے دوائیاں دے دیں گے اور میں اس دُکان پر روز آ کر بیٹھتا ہوں فکر نہ کریں۔ اگر میں نہ بھی ہوا تو میں نے ڈاکٹر کے کمپاؤنڈر سے کہہ دیا ہے کہ یہ بزرگ جب بھی آئیں ان کا ڈاکٹر صاحب سے چیک اپ کروائیں اور کیمسٹ کو بھی کہہ دیتا ہوں کہ جب بھی آپ آئیں ان کو دوائی دے دیں لیکن وہ بزرگ مسلسل یہی کہتا رہا کہ مجھے ایک ماہ کی دوائیاں لے دیں۔ میں نے 15 روز کی دوائیاں لے دیں تو وہ بزرگ کہنے لگا کہ مجھے فلاں جگہ جانا ہے۔ رکشے کا کرایہ بھی دے دیں۔ میں نے اُسے کرایہ بھی دے دیا بلکہ اس سے بھی زیادہ پیسے دے دیے تا کہ بزرگ کو پریشانی نہ ہو اور دُکان سے واپس آ گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ بزرگ دُکان سے نکل آیا۔ میرے دل میں یہ خیال آیا کہ دیکھوں کہ یہ بزرگ رکشہ میں بیٹھتا ہے یا نہیں۔ میں اُس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ راستے میں کئی رکشے آئے وہ کسی میں نہیں بیٹھا۔ اب اس کی چال میں بھی تیزی آ گئی تھی۔ پھر میں نے دیکھا وہ ایک کیمسٹ کی دُکان میں داخل ہو گیا۔ میں بھی جلدی سے اُس کے پیچھے دُکان میں داخل ہو گیا۔ دُکان میں گاہکوں کا رش تھا۔ جب رش کم ہوا تو بزرگ سیلز مین کے

پاس گیا اور کہا کہ یہ دوائیاں میں لے کر گیا تھا، اب یہ دوائیاں بچ گئی ہیں۔ اس کو واپس کر لیں اور پیسے مجھے دے دیں۔ جب بزرگ نے یہ الفاظ سیلز مین کو کہے اور لفافہ اس کے ہاتھ میں پکڑایا تو میں نے فوری طور پر لفافہ سیلز مین سے لے لیا اور بزرگ سے کہا کہ یہ دوائیاں اس وجہ سے تم ایک ماہ کی لے رہے تھے کہ ان کو بیچ کر پیسے اپنی جیب میں ڈالو۔ تمہیں اپنی عمر دیکھنی چاہئے اور جو تم کام کر رہے ہو وہ دیکھو میں نے تو تم کو ترس کھا کر دوائیاں دلوائیں اور رکشے کے پیسے دیئے۔ تم دن میں یہ ڈرامہ کر کے کتنے لوگوں کو بے وقوف بناتے ہو گے۔ دکان میں جو دوسرے لوگ کھڑے ہوئے تھے انہوں نے بھی بزرگ کو شرمندہ کیا۔

اس کے بعد میں ڈاکٹر صاحب کے پاس گیا اور اُن سے پوچھا کہ آپ نے اس کی کون سی بیماریاں دیکھ اور اتنی دوائیاں لکھ دیں اور اس کو کیا بیماری تھی۔ ڈاکٹر صاحب کہنے لگے کہ جب وہ آیا تو بہت کمزوری کی حالت میں چل رہا تھا تو میں نے اس سے بیماری پوچھی تو اس نے بتایا کہ اسے سانس اور دمہ کی بیماری ہے اور جیب سے ایک نسخہ نکال کر مجھے دیا اور کہا کہ میں یہ دوائیاں کھاتا ہوں تو ٹھیک رہتا ہوں، مجھے یہ دوائیاں لکھ دیں لیکن جب اس کا تفصیلی معائنہ کیا تو اس میں اس قسم کی بیماری کے کوئی آثار نہیں تھے۔ اس کے کہنے پر اور مجبور کرنے پر میں نے دوائیاں لکھ دیں۔ جب میں نے ڈاکٹر صاحب کو صحیح صورتِ حال بتائی تو وہ بہت حیران ہوئے اور کہنے لگے کہ اب کس کو کس طرح سمجھیں کہ یہ حقدار ہے، اچھے اور بُرے آدمی میں تمیز کرنا مشکل ہو گیا ہے۔

☆ میرے ایک دوست کا ایک بڑا اسٹور ہے جہاں مختلف قسم کی چیزیں ملتی ہیں۔ ایک روز ایک صاحب بظاہر بہت شریف نظر آتے تھے، آئے اور کہا کہ مجھے ایک شادی کے فنکشن کے لئے دس فلم رول چاہئیں۔ میں ان کے پیسے دے جاتا ہوں۔ جتنے استعمال ہوں گے ان کے پیسے کاٹ لیجئے گا باقی رول آپ رکھ لیجئے گا اور اُس کے پیسے واپس کر دیجئے گا۔ میں نے کہا۔ ٹھیک ہے وہ چند روز بعد آئے کہا کہ صرف 2 رول استعمال ہوئے ہیں۔ آٹھ باقی آ گئے ہیں ان کے پیسے دے دیں۔ میں نے رول چیک کئے مکمل طور پر بند تھے۔ میں نے دو کے پیسے کاٹ لئے اور آٹھ رول کے پیسے واپس کر دیئے۔ کچھ دنوں بعد ایک صاحب آئے اور ایک فلم رول لے گئے۔ دوسرے روز وہ دُکان پر آئے، سخت ناراض تھے۔ کہنے لگے کہ فنکشن شروع ہونے سے پہلے میں نے فلم رول کھولا تو اس میں سے یہ گنڈیری کے چھلکے نکل آئے۔ آپ مذاق کرتے ہیں؟ میں کافی دیر سے یہ واپس کرنے آیا ہوں۔ اس نے مجھ سے بہت بحث کی اور کہا کہ میں آپ کا پرانا گاہک ہوں ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔ میں نے اُسے دوسرا رول دیا۔ اس نے میرے سامنے رول کھولا تو اس میں سے بھی گنڈیری کے چھلکے نکلے۔ وہ گاہک کہنے لگا کہ اب آپ خود انصاف کر لیں۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ جو صاحب آٹھ فلم رول واپس کر کے گئے تھے یہ ساری کارستانی اُن کی ہے۔ صبر کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں تھا۔

اسی طرح ان صاحب کی دُکان میں ایک بڑے اپ ٹو ڈیٹ صاحب آئے۔ انہوں نے کئی ہزار کی شاپنگ کی، جب پیسے دینے لگے تو کہنے لگے کہ میں باہر سے آیا ہوں، میرے پاس ڈالر ہیں، آپ لے لیں۔ میں نے کہا کہ ہمیں پاکستانی کرنسی دیں اسے ہم کہاں تبدیل کراتے رہیں گے۔ انہوں نے کہا مجھے یہ سامان بہت ضروری چاہئے میں ٹوٹل رقم پر 1500 روپے زیادہ دیتا ہوں میرے دوست لالچ میں آ گئے۔ ڈالر وصول کر لئے اور سامان دے دیا۔ دوسرے روز ڈالر مارکیٹ میں بھیجے تو پتہ چلا کہ ڈالر جعلی تھے، ان کو کئی ہزار کا نقصان پہنچ گیا۔

✿

دن سبک رفتاری سے گزرتے گئے۔ کتے کی خوفناک آوازیں، اُس کے بے رحمانہ شکار جاری رہے۔ موسلا دھار بارشیں، آندھیاں، جھکڑ اور طوفان اُس حویلی کی خاموش راتوں کو پُر اسرار بناتے رہے لیکن جنگلا نہ بن سکا۔

جنگلا

وقار احمد ملک، میانوالی

شہر کا یہ قدیم حصہ آہستہ آہستہ پُرسکون ہوتا جا رہا ہے۔ لوگوں نے اس خاموش علاقہ کے بڑے بڑے کشادہ صحنوں کو چھوڑ کر نئے شہر کی جدید کالونیوں کے چند مرلوں کے منقش ڈربوں میں خوشی خوشی قید قبول کر لی ہے۔ زمانہ جدید کے شور وغل اور ترقیوں کے شکنجے سے شہر کا یہ پرانا حصہ ابھی آزاد ہے۔ اس پرانے علاقے کی ایک گلی جو اینٹوں سے بنائی گئی تھی دن کے وقت بھی شام کا سماں پیدا کیے رہتی ہے۔ اس تاریکی کا سبب اس گلی کی دونوں جانب مغلوں کے زمانوں کے تعمیر شدہ پرانے مکانوں اور حویلیوں کی اونچی اونچی دیواریں اور ان دیواروں کے اوپر سے جھانکتے ہوئے بوڑھے آم کے درخت ہیں۔ اس گلی کے سکون کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ تنگ ہونے کی وجہ سے اس میں موٹروں اور گاڑیوں کا گزر نہیں ہوتا۔ اس گلی کے مکین زیادہ تر ادھیڑ عمر اور بزرگ لوگ ہیں جن کی اولادوں نے اس گلی کو چھوڑ کر نئے شہر میں رہائش اختیار کر لی ہے۔

رات کے وقت اس گلی کے حنوط شدہ سکوت کے مقابلہ میں گورستان کی خاموشی بھی شکست کھا جائے گی۔ وہ راتیں جب اس گلی میں تیز بارشوں کا موسم شروع ہوتا ہے اس گلی کو اور بھی پُر اسرار بنا دیتی ہیں۔ دسمبر کی یخ بستہ راتوں کے جھکڑ آم کے درختوں کے مریل، زرد سوکھے پتوں کو ایک دوسرے کے پیچھے لگائے پھرتے ہیں۔

اس گلی میں تھوڑا آگے جائیں تو بائیں طرف ایک پرانی طرز کا حویلی نما مکان ہے۔ دوسرے مکانوں کے برعکس اس حویلی کے اندر پرانے آم کے درختوں کے ساتھ ایک بوڑھا بوڑھ کا درخت بھی موجود ہے، جس کے چار پانچ فٹ محیط تنے میں بے شمار گلہریوں نے رہائش اختیار کی ہوئی ہے۔ درختوں کے اس قدیم کنج سے ہٹ کر دو تین پرانے کمروں، ایک غلام گردش، باورچی خانہ اور ایک سٹور پر مشتمل قدیم عمارت ہے۔

قیام پاکستان کے بعد میرٹھ سے ہجرت کر کے آنے والے نو بیاہتا جوڑے نے جب یہ حویلی الاٹ کرائی تھی تو

اُس وقت بھی شاید اس کی حالت زیادہ مختلف نہیں ہوگی۔

قاضی قمرالدین نے، جو پہلے ایک نواب کا منشی مقرر ہوا بعد میں بلدیاتی دفتر میں سٹینو گرافر کی ملازمت حاصل کر لی۔ قاضی صاحب اپنی متانت، شرافت اور پڑھا لکھا ہونے کی وجہ سے گلی میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ قاضی صاحب کی زوجہ شیریں بی بی کے نام سے معروف تھیں۔ پورے محلے کی خواتین سے اُن کی سلام دعا تھی۔ گو ان کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی لیکن اپنے انداز اور ہلکے پھلکے بناؤ سنگھار کی وجہ سے ایک نوجوان لڑکی کے مشابہ تھیں۔ شیریں بی بی دراز قد، کھلتی ہوئی سفید رنگت اور موتیوں جیسے دانتوں سے پھوٹنے والی مسکراہٹ کے سبب اس گلی کی حسین خواتین میں شمار کی جاسکتی تھیں۔

میاں بیوی کے درمیان محبت بھی لاثانی تھی۔ دونوں میاں بیوی میں ادبی ذوق کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ جوانی میں راتوں کا ایک طویل حصہ غالب اور میر کے دانشورانہ اور رومانوی اشعار کی نظر ہو جاتا۔ منٹو کا جو بھی نیا افسانہ شائع ہوتا دونوں میاں بیوی کئی کئی گھنٹے اس پر بحث کرتے۔ تقسیم موضوع پر لکھے ہوئے منٹو کے افسانہ "ٹوبہ ٹیک سنگھ" پر تو قاضی صاحب اور شیریں بی بی کی گفتگو اور تبصرے کئی دن جاری رہے۔ کئی مہینوں تک مذاق ہی مذاق میں وہ اس افسانے کے پاگل ہیرو کی مشہور گالی سے ایک دوسرے کو نوازتے رہے۔

اولاد نرینہ کی خواہش کی تکمیل نے اس وسیع مکان کے مختصر گھرانے کی خوشیوں میں قوسِ قزح کے رنگ بکھیر دیئے۔ ننھے ثاقب کی کلکاریوں نے خاموش حویلی کو گویائی عطا کر دی۔ قاضی صاحب کی محدود تنخواہ اس مختصر کنبے کی خوشیوں میں حائل نہ ہو سکی۔ شاید اس وجہ سے شیریں بی بی اور قاضی صاحب کی غیر مادی دلچسپیاں تھیں۔ وہ قیمتی ملبوسات، زیور یا سامان آرائش و زیبائش کا لطف کسی اچھے شعر، افسانے یا کسی بھولی بسری یاد کو کرید کر حاصل کر لیتے۔

زندگی انتہائی دلفریب ریلوے کے سفر کی طرح گزرتی گئی۔ اُدھر ثاقب نے فہم اور ادراک کی ابتدائی سیڑھی پر قدم رکھا، اُدھر محبت کرنے والے جوڑے کی آزادی ختم ہونے لگی۔ میاں بیوی کی باہمی محبت واحد بیٹے کی محبت سے بازی لے گئی۔ جیسے ہی ثاقب کی آنکھیں بند ہوتیں شیریں بی بی جھٹ پٹ اُسے اُٹھا کر ساتھ والے ٹرنک پیٹیوں والے کمرے میں پہلے سے تیار شدہ بستر پر ڈال آتی لیکن اکثر ثاقب تھوڑی دیر بعد روتا ہوا واپس آ جاتا اور گاڑی کے دو پہیوں کو پھر سے جدا کر دیتا۔ ثاقب کی عمر چھ سات سال ہو چکی تھی اور اس نے سکول جانا بھی شروع کر دیا تھا۔ شیریں بی بی نے ایک دن غلام گردش کے دوسری طرف واقع سٹور کی صفائی شروع کر دی۔ کمرے کو ان تصویروں، رنگوں اور مناظر سے مزین کر دیا جو ایک کمسن بچے کی دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ثاقب کے اندر بہادری کے مردانہ جوہر بیدار کرنے کے لیے اُسے ٹارزن کی کہانیاں بھی سنانا شروع کر دیں۔ ثاقب کو نیا کمرہ بہت پسند تھا جس میں اُس کے لیے نئے نئے کھلونے بھی لا کر رکھ دیے گئے تھے۔ چابی والا کتا تو اُس کو بہت پسند آیا تھا۔ جیسے ہی اُس کھلونا کتے کو چابی دی جاتی وہ اپنی چھوٹی سی دم ہلا کر بھوں بھوں کرنا شروع کر دیتا۔ کتے کے علاوہ بھالو، بندر، طوطے اور کچھوے بھی اُس کے لیے دلچسپی کا باعث تھے۔ چند دنوں بعد جب ثاقب کو یہ اطلاع دی گئی کہ اب اُس کو شب بسری بھی اس نئے کمرے میں کرنی پڑے گی تو اُس کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ ثاقب نے جب رات کو اکیلے کمرے میں سونے سے انکار کر دیا تو پہلی مرتبہ قاضی صاحب نے اُس کو زنانے کا تھپڑ رسید کیا۔ سُرخ پھولے ہوئے رخسار اور پھول گئے اور ان کا رنگ گہرا گلابی ہو گیا۔ آنسوؤں کی ایک جھڑی فوراً بہہ نکلی۔ یہ رمضان المبارک کی اختتامی رات کا واقعہ ہے جسے "چاند رات" بھی کہا جاتا ہے۔

چند راتیں ثاقب نے جاگ کر گزاریں لیکن اب آہستہ آہستہ وہ حویلی کی پرانی مکین "تنہائی" کا عادی ہوتا

گیا۔ ساری گلی کے مکانوں کی چھتیں ایک دوسری سے متصل تھیں۔ تین گھر دور چودھری فتح داد کا مکان تھا۔ چوہدری صاحب نے شوقیہ طور پر ایک کتا پال رکھا تھا۔ مکانوں کی ساری چھتیں اُس کتے کی ملکیت تھیں۔ ایک رات ایک بلی اپنے نومولود بچے کو منہ میں اٹھائے کہیں لے جارہی تھی کہ چوہدری صاحب کے کتے نے اُس کو دیکھ لیا۔ وحشیانہ انداز میں بھونکتا ہوا کتا بلی کے پیچھے بھاگا۔ بلی کے منہ سے اُس اچانک آفت کے باعث بچہ گر گیا۔ کتے نے بلی کی بجائے اُس بلونگڑے کے پیچھے بھاگنا شروع کر دیا اور بالآخر قاضی صاحب کے مکان کے سٹور کے اوپر بنے دُود کش کے قریب اُس کو پکڑ لیا۔ کتے نے بلونگڑے کو پکڑتے ہی اُس کی تکا بوٹی کر دی۔ خون کے چند قطرے دود کش سے ہوتے ہوئے نیچے سٹور میں بھی گرنے لگے۔ کتے کی خوفناک آواز سے ننھے ثاقب کی آنکھ کھل گئی۔ کھڑکی سے آتی ہوئی چاندنی کی ایک کرن دود کش کے نیچے ایک پرانے اور متروک چولہے پر پڑ رہی تھی۔ ثاقب نے جب خون کے قطرے دیکھے تو اس کی گھگھی بندھ گئی۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔ ڈرتے ڈرتے اُس نے دروازہ کھولا اور غلام گردش سے ہوتا ہوا امی ابو کے کمرے کی طرف بھاگا۔ اس نے دروازہ بجایا لیکن اندر والے شاید گھوڑے بیچ کر سو رہے تھے، دروازہ نہ کھلا۔ چاروناچار خوف، شرمندگی اور زندگی کے ایک نئے احساس کے ساتھ ثاقب اپنے کمرے کے بستر پر آلیٹا۔ خونی کھیل ختم ہو چکا تھا۔ بلونگڑے کا ایک کٹا ہوا معصوم سا کان دُود کش کے اندر فرش پر پڑا تھا۔ خون مزید نہیں گر رہا تھا۔ شاید اُس بے زبان کی رگوں کی کل متاع ہی یہی چند قطرے تھے۔

ثاقب نے صبح ناشتہ کرتے ہوئے امی ابو کو رات کا واقعہ بیان کیا اور التجا کی کہ ہمارے مکان کی چھتوں کے اردگرد دیوار بنا دی جائے تاکہ پھر ایسا واقعہ نہ ہو۔ قاضی صاحب اور شیریں بی بی کو ننھی جان ثاقب کی شب بیتی پر بڑا ترس آیا۔ ابو نے جنگلا جلد بنانے کا وعدہ کیا۔ اگلے دن ثاقب نے چابی والا کتا ایک بھاری پتھر سے مسل ڈالا اور

> ### لطیفہ
>
> لڑکی اپنے ابو سے، وہ سامنے والوں کا لڑکا مجھے بہت تنگ کرتا ہے۔
>
> ابو! میں اسے پولیس کے حوالے کرتا ہوں تاکہ اسے سخت سزا ملے۔
>
> لڑکی: نہیں ابو، میں تو اسے اس سے بھی سخت سزا دینا چاہتی ہوں۔
>
> ابو: کیسے؟
>
> لڑکی شرماتے ہوئے۔ ابو آپ میری اس سے شادی کر دیں!
>
> ابو! واہ بیٹی انتقام لینے میں بالکل اپنی ماں پہ گئی ہو۔
>
> (اشفاق شاہین، کراچی)

اُس کا ایک کان کاٹ کر بلونگڑے کے کان کے ساتھ جوڑ کر کنج میں دفن کر دیا۔

دن سبک رفتاری سے گزرتے گئے۔ کتے کی خوفناک آوازیں، اُس کے بے رحمانہ شکار جاری رہے۔ موسلا دھار بارشیں، آندھیاں، جھکڑ اور طوفان اُس حویلی کی خاموش راتوں کو پُراسرار بناتے رہے لیکن جنگلا نہ بن سکا۔

پاکستان بنے تین دہائیاں مکمل ہو چکی تھیں۔ میاں بیوی کے بالوں میں چاندی اُترنا شروع ہو گئی۔ ثاقب کے چہرے پر بھی سبزہ نمودار ہونا شروع ہو گیا۔ یہ اُس خاموش حویلی کے تمام مکینوں کی عمروں کا عبوری دور تھا۔ دو تین سالوں کے بعد ثاقب ایک خوبرو نوجوان کی شکل دھار گیا۔ موٹی موٹی آنکھیں، چھوٹی، چھوٹی خوبصورت تراشی ہوئی مونچھیں اور چھتے دار ریشمی زلفیں ثاقب کی دلکش شخصیت کی آئینہ دار بن گئیں۔ ثاقب اُس خاموش گلی کی مکین چند لڑکیوں کا ہیرو بن گیا۔ چوہدری فتح داد کی بیٹی فاریہ نے جب ثاقب کو پہلی مرتبہ دیکھا تو دم بخود رہ گئی۔ لیکن ثاقب ان سب رومانوی چکروں سے ماورا تعلیمی دنیا میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ ایم اے کرنے کے بعد وہ مقابلے

کے امتحان میں بیٹھا اور صوبہ بھر میں ساتویں پوزیشن حاصل کی۔ چند دنوں بعد اُس محکمہ کا سپرنٹینڈنٹ مقرر ہو گیا جس میں اُس کے والد قاضی صاحب نے معمولی ملازمت کرتے ہوئے اپنی عمر گزار دی تھی۔

میاں بیوی کی گاڑی کے دو پہیوں کے فراٹے ختم ہو گئے تھے لیکن گھرر گھرر کرتی ہوئی سست رفتار گراریوں والا دھیرا دھیرا استغراب تک جاری تھا۔ فراغت ملی تو ایک دوسرے کی ضرورت اور بڑھ گئی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد تو قاضی صاحب نے اب حویلی سے باہر نکلنا بہت ہی کم کر دیا تھا۔ ادبی ذوق میاں بیوی میں ہنوز باقی تھا بلکہ پہلے سے بڑھتا جا رہا تھا۔ اے حمید کے افسانے قاضی صاحب دلچسپی سے پڑھتے تھے۔ اے حمید کی امرتسر کی یادوں کو وہ میرٹھ کی تصوراتی نگاہوں سے پڑھتے۔ بعض اوقات تو اے حمید کے افسانوں کی دبیز رومانیت اور سکوت قاضی صاحب کے چہرے پر ایک گہری طمانیت کا احساس پیدا کر دیتا کسی سطر کو پڑھتے ہوئے وہ زیر لب مسکرانے لگتے۔ کوئی صفحہ اُن کی آنکھوں میں یادوں کے سمندر میں تیرتے ہوتے آنسوؤں کو جلوہ گر کر دیتا۔ آنسوؤں اور مسکراہٹوں کی دھوپ چھاؤں شیریں بی بی کو بڑی عجیب لگتی۔

گھر کی آمدن معقول تھی۔ قاضی صاحب کی پنشن اور ثاقب کی اچھی خاصی تنخواہ اُن کی ضرورت سے زائد تھیں۔ ثاقب کا کمرہ اب بیگانہ تصویروں سے خالی ہو گیا تھا۔ اب اس کمرے میں صادقین اور دوسرے معروف مصوروں کے خطاطی کے نمونے اُس کے عمدہ جمالیاتی ذوق کا احساس دلاتے تھے۔ تاریک راتیں، موسلا دھار بارشیں اور چوہدری صاحب کے کتوں کے شکار اب ثاقب کو خوفزدہ نہیں کرتے تھے۔ دوسری طرف چوہدری صاحب کی بیٹی بھی سیاسیات میں ایم اے کرنے کے بعد مقامی گرلز کالج میں لیکچرار مقرر ہو گئی تھی۔

اس مرتبہ جب سردیوں کی موسلا دھار بارشیں تھمیں تو گلابی جاڑے نے صحن میں طنابیں کس دیں۔ کچھ دن اور گزرے تو ماحول میں بسنتی رنگ کھلنے لگا۔ 23 فروری کو شہر میں بسنت منائی گئی۔ محلے کے سارے نوجوان چھتوں پر چڑھ دوڑے۔ پتنگیں اڑائی گئیں، پیچ لڑائے گئے۔ فاریہ اپنی بہنوں اور کزنوں کے ساتھ بسنتی جوڑے میں خوب کھلتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ ثاقب نے جب فاریہ کو تمام نوجوانوں کی نگاہوں کا مرکز دیکھا تو احساس رقابت کی وجہ سے اُس کا ناقدانہ جائزہ لیے بغیر نہ رہ سکا۔ واقعی ثاقب نے کافی وقت ضائع کیا تھا لیکن اب مزید وقت ضائع کرنا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ ثاقب نے ایسا پیچ لگایا کہ چوہدری صاحب کی پتنگ چند ہفتوں میں قاضی صاحب کے خاموش آنگن کی زینت بن چکی تھی۔

قاضی صاحب اور شیریں بی بی خود سے ساتھ والے کمرے میں کھسک گئے اور اپنا کمرہ نئے جوڑے کو دے دیا۔ ابھی دلہن کے ہاتھوں کی مہندی نہیں اتری تھی کہ اچانک شیریں بی بی کے دل کی شریانیں سکڑنا شروع ہو گئیں۔ ذیابیطس کا مرض تو اُن کو سالوں سے ہو چکا تھا۔

ساون شروع ہو گیا۔ چھتوں کے پرنالے موسلا دھار بارشوں کے پانی کو راستہ نہ دے سکے اور یہ ساون کا پانی چھتوں کے منیروں اور چھجوں کو عبور کر کے صحنوں میں گرنے لگا۔

ایک روز کمرہ کی کھڑکی کے قریب اُداس اور ویران آنکھوں سے قاضی صاحب بھی بارش میں نہاتے ہوئے بوڑھے اور بوڑھے آم کے درختوں کا نظارہ کر رہے تھے۔ شیریں بی بی کتنی دیر سے ان کے ساتھ کھڑی تھیں۔ قاضی صاحب کو متوجہ کرنے کے لیے شیریں بی بی نے پرانا گر استعمال کیا۔ اپنی کمزور ہوتی ہوئی دلنشین آواز میں قاضی صاحب کے چاندی جیسے بالوں کو گدگداتے ہوئے گویا ہوئیں۔

تجھے اپنی چادر سے میں ڈھانپ لوں
زمین آسماں کچھ دکھائی نہ دے

دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا جو تھوڑی دیر بعد ہلکے سے قہقہہ میں تبدیل ہو گیا۔ چند دن قبل قاضی صاحب ساتھ والے محلے کے ایک حکیم سے بیگم کی گرتی ہوئی طبیعت کے بارے میں مشورہ کرنے گئے

تھے۔ حکیم صاحب نے صبح اور رات سونے سے پہلے شہد کے ساتھ بیس دانے بادام کی غذا تجویز کی۔ جب اس دیسی دوا کا وقت آتا قاضی صاحب بڑے اہتمام سے ایک ایک دانا گن کر شیریں بی بی کو یُوں بادام کھلاتے جیسے چڑیا اپنے بچوں کو چوگا ڈالتی ہے۔

ایک روز قاضی صاحب عصر کی نماز ادا کرنے مسجد میں گئے ہوئے تھے۔ فاریہ اپنے کمرے میں پرچوں کی مارکنگ کر رہی ہے۔ ثاقب ابھی دفتر سے نہیں آیا۔ اچانک شیریں بی بی کی ہلکی سی چیخ بلند ہوئی۔ فاریہ بھاگتی ہوئی آئی اور دیکھا کہ آرام کرسی پر شیریں بی بی بڑے پُرسکون انداز میں ابدی نیند سو رہی ہیں۔ کچھ دیر بعد ثاقب دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ قاضی صاحب نے صبر کا مظاہرہ کیا۔ شاید اس وجہ سے کہ انھوں نے آنسوؤں کا محدود ذخیرہ مرتے دم تک آہستہ آہستہ لٹاتا تھا۔

درخت اپنے پتے اتار چکے ہیں۔ رات کے وقت ہواؤں کے جھکڑ خشک پتوں کی خوب دوڑ لگوا رہے ہیں۔ شدید سردیوں نے ویران حویلی کے مکینوں کو کمروں میں مقید کر رکھا ہے۔ ثاقب اور فاریہ پچھلے اتوار کو کچھ نیا فرنیچر خرید کر لائے تھے۔ شام ہونے سے پہلے پہلے فرنیچر بیڈ روم کے ساتھ والے کمرے میں سجا دیا گیا ہے۔ دونوں میاں بیوی بڑے احترام سے قاضی صاحب کا بستر اور کتابیں غلام گردش سے دُوسری طرف والے سٹور میں منتقل کر رہے ہیں۔ قاضی صاحب پُرسکون چہرے سے ساری کارروائی دیکھ رہے ہیں۔ فاریہ جیسے ہی انگیٹھی پر پڑی شیریں بی بی کی خوبصورت فریم میں لگی تصویر ہٹاتی ہے تو اسے ایک بند رومال نظر آتا ہے۔ ثاقب سے پوچھ کر جب وہ جلدی جلدی رومال کو کھولتی ہے تو بادام کی گریاں نیچے گر جاتی ہیں۔ میاں بیوی کو قاضی صاحب کی چپکے چپکے اس خوش خوراکی کے عمل پر ہنسی آ جاتی ہے۔ قاضی صاحب فوراً بادام کی گریوں کو بچوں کی طرح بیریاں چننے والے انداز سے اپنے جیب کے اندر ڈال کر محفوظ کر لیتے ہیں۔

قاضی صاحب کا زیادہ وقت سٹور نما بیڈ روم کے اندر ہی گزرتا ہے۔ اے حمید کے ساتھ ساتھ ہارڈی کے اردو کے ترجمہ شدہ ناول اور منقش فریم والی ایک تصویر قاضی صاحب کی کل کائنات ہے۔ بڑھاپے نے اُن کی جوانی والی ہمت، حوصلہ اور بہادری کا قلع قمع کر دیا تھا۔ ہلکی سی آہٹ بھی اُن کو ڈرا کر رکھ دیتی ہے۔

دسمبر کی ایک یخ بستہ رات کو ثاقب اور فاریہ رات دیر گئے کسی تقریب سے لوٹے اور آتے ہی سیدھے اپنے کمرے میں جا کر سو گئے۔ قاضی صاحب نے اپنی بوڑھی آنکھوں سے میاں بیوی کو ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے غلام گردش میں سے گزر کر کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ کبھی ایسے ہی جوش و ولولہ کے ساتھ دُنیا و مافیہا سے بے خبر قاضی صاحب اور شیریں بی بی غلام گردش میں گردش کیا کرتے تھے۔ جب ننھا ثاقب انجانے خوف و ہراس میں جکڑی زندگی گزار رہا تھا اور حسرت بھری نگاہوں سے اپنی کوٹھری کی سلاخ دار کھڑکیوں سے والدین کی آزاد، مطمئن اور بے خوف زندگی کو دیکھا کرتا تھا۔

نصف شب ہونے کو ہے۔ قاضی صاحب کو دسمبر کی یخ بستہ راتوں کی خوفناک خاموشی سونے نہیں دے رہی۔

اللہ پر یقین رکھو!

مجھے خود پر بہت افسوس ہوتا ہے جب میں اپنا سر زمین کے ناخداؤں کے آگے جھکاتا ہوں لیکن اس اللہ کے آگے نہیں جھکاتا جو پوری کائنات کے ذرے ذرے کا مالک ہے جب مسجد سے آواز آتی ہے حی علی الفلاح آؤ کامیابی کی طرف میں یہ آواز سن کر بھی نہیں جاتا کیوں آخر کیوں کیا میں اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں رکھتا۔ میں جو بھی کام کرتا ہوں میری یہی سوچ ہوتی ہے جس کا میں نے کام کیا ہے وہی شخص مجھے پیسے دے گا۔ میں اللہ پر یقین کیوں نہیں رکھتا؟ جب مجھے اللہ پر یقین آ جائے گا تو سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔

(راشد لطیف صبر ے والا، ملتان)

قاضی صاحب شیریں بی بی کی طرف حسرت ناک نگاہوں سے دیکھتے دیکھتے گلے شکوؤں میں لگ گئے۔

شیریں...... اور میری شیریں! میں نے کیا بگاڑا تھا تیرا؟

کیوں مجھے زہر کا ٹیکا لگا کر...... میری جھوک تباہ کر کے میرے گھر سے نکل گئی؟

میری عمر بھر کی محبتوں کا اچھا صلہ دیا تو نے۔ کب بلا رہی ہو مجھے اپنے پاس؟ آنکھیں کیوں سکیڑ رہی ہو؟

اس کوٹھری کی وجہ سے؟ ناں میری شیریں ناں! میں اس کوٹھری میں خوش ہوں۔ اُس بڑے کمرے میں تیری خوشبو، تیری یادیں کہاں مجھے سونے دیتی تھیں۔ میرا بیٹا اور بہو بہت اچھے ہیں کہ انہوں نے میری خاطر اُس بڑے کمرے میں رہائش اختیار کر لی۔ ہاں ایک بات بتانی ہے تم کو۔

میں نے تمہارا شہد اور بادام سنبھال رکھا ہے۔ تمہاری صرف دو خوراکیں باقی ہیں۔ حکیم صاحب کہتے ہیں کہ خوراک مکمل ہوتے ہی تم بالکل صحت مند ہو جاؤ گی۔ دیکھو میں نے تمہاری کتابیں، کپڑے اور وہ انگوٹھی بھی سنبھال رکھی ہے جو شادی سے پہلے میں نے تم کو تحفہ میں دی تھی۔

روزانہ صبح ثاقب چائے کا کپ اور ڈبل روٹی کا روایتی ناشتہ بابا جی کی کوٹھری میں لے کر آتا۔ چند دنوں سے ثاقب محسوس کر رہا تھا کہ قاضی صاحب کی آنکھیں سُرخ ہوتی جا رہی ہیں۔ ایک روز صبح ناشتہ دیتے وقت ثاقب نے اِس کی وجہ پوچھ ہی لی۔

قاضی صاحب نے کہا۔ ”بیٹے ثاقی اور تو مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ صرف رات کو یہ چوہدری صاحب کا کتا چھت پر دوڑتا ہے تو آنکھ کھل جاتی ہے اور پھر نیند نہیں آتی۔ تو ایک مہربانی کر ہماری چھتوں کے ساتھ ایک چھوٹا سا جنگلا بنوا دے۔ تا کہ کتا میری پُرسکون نیند کو خراب نہ کر سکے۔“ ثاقب نے کہا جی ابو بہت جلد یہ کام ہو جائے گا۔

ثاقب اور فاریہ بہت مصروف زندگی گزار رہے تھے۔ لیکن اس مصروفیت میں بھی ایک قسم کی طمانیت موجود تھی۔ زندگی کی گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے چھتوں کے اوپر دیواریں کھڑی نہ ہو سکیں۔ اب قاضی صاحب نے بھی اپنے مسئلہ کا حل نکال لیا تھا۔ ان کی نیند کا دشمن چوہدری صاحب کا بل ٹیریئر کتا تھا جو رات بھر جاگا کرتا اور بلیوں کو چھتوں پر بھگائے رکھتا۔ لیکن دن چڑھتے ہی اپنے لئے بنائی گئی مخصوص کوٹھری میں سو جاتا۔ چوہدری صاحب کا بیٹا صبح اُس جانور کو ایک پیالے میں دودھ اور ڈبل روٹی کے چند ٹکڑے ڈال جاتا۔ یہ ناشتہ کرتے ہی وہ سو جاتا۔ دن بھر اس کی آواز کوئی نہ سنتا۔ اب قاضی صاحب نے بھی جگ راتوں کی کمی دن کو سو کر پوری کرنا شروع کر دی۔ آنکھوں کی سُرخی ختم ہو گئی۔ رحم دل بیٹے نے بھی سکون کا سانس لیا کہ چلو ابو کی گمشدہ نیندیں لوٹ آئی ہیں۔

ایک رات کا واقعہ ہے کہ کتے نے جانے کون سی چیز دیکھ لی اور دیوانہ وار چھتوں کے چکر لگانا شروع کر دیے۔ قاضی صاحب جس کوٹھری میں سوئے ہوئے تھے، اس کی چھت پرانی ہونے کی وجہ سے بوسیدہ ہو چکی تھی اور کتا بھی رات بھر اپنے پنجوں سے اس کی مٹی کریدتا رہتا تھا۔ اچانک کتے کے بوجھ کی وجہ سے کوٹھری کی دو اینٹیں نیچے گر گئیں۔ ایک اینٹ قاضی صاحب کے پاؤں پر آن گری۔ پاؤں کی ہڈی کے ٹوٹ جانے کی ہلکی سے آواز پیدا ہوئی۔ پاؤں کی دو انگلیوں سے خون جاری ہو گیا۔ کتے نے بھی سوراخ کے قریب ڈیرہ لگا لیا اور ہر گھڑی دو گھڑی کے بعد تھوتھنی اندر ڈال کر بھاؤں بھاؤں کرنے لگ جاتا۔ قاضی صاحب شدید درد و کرب کے عالم میں بمشکل بستر سے اٹھے۔ غلام گردش کو عبور کر کے سامنے والے کمرے پر دستک دینے ہی والے تھے کہ اچانک اُن کے ہاتھ رک گئے۔ ان کے لاشعور سے ایک یاد لپک کر شعور میں آ گئی۔ انہیں ایسی ہی ایک رات یاد آ گئی جب وہ اپنی محبوب بیوی شیریں کے ساتھ گرم لحاف میں مزے کی نیند سو رہے تھے اور باہر سخت سردی میں ننھا ثاقب خوف کے مارے دروازے پیٹ رہا تھا۔

وہ کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح تھکے تھکے قدموں سے واپس لوٹ گئے۔

٭٭٭

کاش سینما منیجر لکھوا دیتا ”سینما محرم اور ربیع الاوّل اور رمضان شریف میں بند رہے گا“ اس طرح اس کی جزا میں خاطر خواہ اضافہ ہو جاتا۔

☆ بشیر احمد بھٹی

انسان کی اپنی سوچ فائدے کا کچھ نہ کچھ وجہ ہر رکھتی ہے۔ اک اسلامی واقعہ پڑھا تھا کہ ایک شخص مکان بنوا رہا تھا۔ روشن دانوں تک مکان تعمیر ہو چکا تھا۔ سرکار کا وہاں سے گزر ہوا۔ آپؐ نے اس شخص سے پوچھا۔ یہ روشن دان کس کام آئیں گے۔ مکان کے مالک نے عرض کی۔ سرکارؐ ان روشن دانوں سے تازہ ہوا آئے گی۔ آپؐ نے تبسم فرمایا اور اس مالک مکان سے فرمایا۔ اگر تم یہ کہہ دیتے کہ ان روشن دانوں سے اذان کی آواز آئے گی تو تمہارے اعمال نامے میں نیکیاں لکھ دی جاتیں۔ تازہ ہوا نے تو ہر حال میں آنا ہے۔ تمہیں اس نیت کا کہ ان سے اذان کی آواز آئے گی۔ مفت میں ثواب حاصل ہوتا۔ یہ تو تھی حدیث پاک، سبحان اللہ! انسان کو اسلام میں بڑی رعایت ہے۔

اب آیئے! آپ کو اپنے شہر بہاولپور کا ایک دلچسپ واقعہ سناتا ہوں۔ ایک انسان کی عقل مندی کا واقعہ جس نے مفت کی نیکیاں حاصل کرنے کا ایک بہترین عمل کیا۔ آپ یہ واقعہ پڑھ کر کافی محظوظ ہوں گے۔

کوئی دور تھا، جب سینما پر عروج ہوتا تھا۔ لوگ جوق در جوق فلم بینی کا شوق پورا کرتے تھے۔ ہر جمعہ کو ہر سینما پر تماشائیوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر رش کی صورت میں نظر آتا تھا۔ ہمارے شہر میں یوں تو کئی سینما گھر تھے جن کے نام یہ ہیں۔ عباسیہ ٹاکیز، رین بو، ریوالی،

فانوس، پیراڈائیز، شمع، پیلیکن، کسان سینما یہ بھی عرض کرتا چلوں ان میں قدیم سینما عباسیہ ٹاکیز تھا یا پھر ریوالی سینما تھا۔ جو ریلوے سٹیشن کے قریب ریلوے لائنوں کے پار تھا۔ اس سینما پر دوری کی وجہ سے لوگ بہت کم جاتے تھے۔ اس سینما کا مالک منیجر تبدیل کرتا رہتا تھا۔ اس کا پرانا نام ریوالی تھا پھر اس کا نام صنم رکھا گیا۔ بعد میں اس کو روہی سینما کا نام دیا گیا۔ سینما شہر سے باہر تھا اس لئے نقصان میں جا رہا تھا۔ خصوصاً سردیوں میں لوگ سردی کی وجہ سے اس طرف کا رخ کم ہی کرتے تھے۔

کسی دور میں مجھے یاد ہے ذرا ذرا اس پر بلیک اینڈ وائٹ فلمیں چلتی تھیں۔ سجن پیارا، جند جان وغیرہ۔ کسان سینما بستی جمائیاں جو اب جدید بجلی کالونی ہے، اس کے پار بغداد سٹیشن روڈ پر کھیتوں میں بنایا گیا تھا۔ قریب ہی شیشم کے درخت تھے۔ پہلے روز افتتاحی فلم چلی اور وہ بھی مغرب کے بعد جب اندھیرا ہو گیا کیونکہ سینما کی چھت نہیں تھی۔ روپے پیسے کی بھی لوگوں کے پاس کمی تھی اس لئے کئی جیالوں نے درختوں پر چڑھ کے پہلا شو مفت میں دیکھا۔ غالباً فلم نغمہ اور حبیب کی تھی۔ یہ جوڑی کسی دور میں مقبول تھی۔ کسان سینما تو چند روز ہی چلا پھر بند ہو گیا۔ درختوں کی وجہ سے لوگ بغیر ٹکٹ فلم دیکھ لیتے تھے جس کی وجہ سے سینما انتظامیہ کو خسارہ ہوا تو سینما بند کر دیا گیا۔ بعد میں آہستہ آہستہ دیو قامت دیواروں کی اینٹیں بھی غائب ہو گئیں۔ روہی سینما نے بعد میں چاننا کی ایکشن فلموں کا سہارا لیا۔ انگلش فلمیں بھی چلتی رہیں۔ پھر وہ بھی بند ہو گیا۔

کئی سینماؤں پر گیت مالا اور ہمراہ سائیڈ پروگرام بھی دکھائے گئے لیکن عوام کو آہستہ آہستہ ڈش انٹینا اور کیبل نے سینما بھلوا دیئے۔ فانوس سینما کو توڑ کے وہاں کاروباری پلازہ بنا دیا گیا۔ پیراڈائیز سینما بھی ختم ہو گیا۔ پلاٹ میں لنڈا بازار بن گیا۔ شمع سینما پر ایک ٹکٹ میں دو فلمیں دکھانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ اپریٹر تو ویسے بھی کاٹ چھانٹ کے ماہر ہوتے ہیں، کئی چھٹی فلموں نے عوام کا مزہ کرکرا کیا تو وہ ایک ٹکٹ میں دو فلموں سے بھی بدظن ہو گئے۔

اب عالم یہ تھا کہ ٹکٹ کھڑکی سے بند کر دیا گیا۔ سینما کے پوسٹروں والے برآمدے کے سامنے کرسیاں بچھا کر عملہ بیٹھ جاتا اور ٹکٹ کی کاپیاں تھال میں رکھ کے فروخت کرتے۔ اکا دکا تماشائی سینما ایریا میں داخل ہوتا، تماشائیوں کی عادت ہوتی ہے۔ ٹکٹ خریدنے سے پہلے پوسٹر جو جالیوں میں نصب ہوتے ہیں ان کو دیکھتے ہیں، بعد میں ٹکٹ خریدتے ہیں۔ ٹکٹوں والی تھال برادری ہر آنے والے تماشائی کو مجبور کرتی کہ فوراً ٹکٹ لے لو۔ لائٹ گرنے والی ہے۔ یعنی سکرین پر تصویریں آنے والی ہیں۔ اُن کی اس بات سے فوراً اوپر گھنٹی بجتی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوتا کہ فلم شروع ہونے والی۔ عجلت میں ٹکٹ لے کر اندر جانے والے اندر جا کے مایوس ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ سیٹوں پر چند سر ہی نظر آتے ہیں۔ دو تھرڈ کلاس میں بیٹھے ہیں تو تین فرسٹ کلاس میں اور ایک گیلری میں۔ جب کل چھ آدمی فلم دیکھنے والے ہوں گے تو جھو بجلی کا بل بھی سینما انتظامیہ کے گلے میں پڑ گیا۔ ایسے میں کون پوری فلم دکھاتا ہے۔ الٹی سیدھی چند تصویریں دکھا کے دی اینڈ، اختتام کے حروف سامنے آ جاتے۔

اس طرح یار لوگوں نے سینما کے عروج کا بیڑہ غرق کیا ہے۔ لوگ اب سینماؤں سے مکمل طور پر ہی بدظن ہو گئے ہیں۔ ویسے بھی ہم ماضی پر ایک نظر ڈالیں تو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگے گی کہ عوام پر خصوصاً غریب عوام پر سینما کی چاردیواری میں بڑے ظلم ہوئے ہیں۔ لاہور کے بڑے بڑے ایکٹروں اور کلاکاروں کی کوٹھیوں میں غریب عوام کا خون پسینہ لگا ہوا ہے۔ غریب عوام کو ٹکٹوں کے حصول کے لئے پولیس کے ادنیٰ سے سپاہی کے ڈنڈے

کھانے پڑتے تھے۔ غلیظ گالیاں برداشت کرنی پڑتی تھیں۔ رش کی وجہ سے لامحالہ قطار میں دھکم پیل سے بدنظمی پیدا ہوتی تھی۔ دھکے کھانے پڑتے تھے۔ مظر گر جاتے تھے۔ جوتیاں ٹوٹ جاتی تھیں۔ جیبیں کٹ جاتی تھیں۔ گھڑیوں کے چین ٹوٹ جاتے تھے۔ پولیس کے سپاہی ڈنڈے برساتے تھے۔ کھڑکی سے صرف دو ٹکٹ دیئے جاتے تھے۔ باقی ٹکٹ سرعام بلیک میں فروخت ہوتے تھے۔ پولیس کی موجودگی میں بلیک ٹکٹ فروخت کرتے تھے۔ پولیس والے اپنا حصہ وصول کرتے تھے۔ عوام کی خوب مٹی پلید ہو رہی تھی۔ خدا خدا کر کے عوام کی سینما انتظامیہ کے ظلم وستم سے جان چھوٹی ہے۔

اب وہ بڑے مزے سے کیبل کے مزے لوٹ رہے ہیں جبکہ فلمی نگارخانوں کے مالکوں اور بڑے ایکٹروں کا یہ دعویٰ ہے کہ عوام ایک بار پھر سینما کا رخ کریں گے۔ یہ صرف اُن کے خیالی پلاؤ کی دیگیں ہیں جو انہوں نے تصور ہی تصور میں عارضی چولہوں پر چڑھا رکھی ہیں۔ عوام اتنی بھی پاگل نہیں کہ دوبارہ پولیس کے ڈنڈے کھانے کے لئے اب سینما کا رخ کرے گی۔ کیبل کے ذریعے ہزاروں مختلف آئٹم دیکھنے کو ملتے ہیں۔ فلمیں، خبرنامے، گیت مالا، مزاحیہ پروگرام تو یہ سب چھوڑ کے عوام کو کیا پڑی ہے کہ صرف ایک فلم کی خاطر سینما پر ذلیل ہو۔

اب وہ دن ہوا ہو گئے جب سینما کے اشتہار پر لکھا ہوتا تھا ”ایڈوانس بکنگ جاری ہے“ اب کئی سینماؤں کو سٹیج ڈراموں کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ ہمارے شہر بہاولپور کا عباسیہ ٹاکیز بھی اب فلموں کی بجائے سٹیج ڈرامے دکھا رہا ہے۔ وہ بھی آہستہ آہستہ فلاپ ہوتے جا رہے ہیں کیونکہ ٹکٹ مہنگے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے افضل خان عرف ریمبو بھی ڈرامہ کرنے آیا تھا۔ معاوضہ نہ ملنے پر کانوں کو ہاتھ لگا کے بہاولپور سے گیا ہے کہ اب نہ آؤں

گا، بے وفا شہر میں۔

لگتا ہے بڑی نرمی ہے خدا کے قہر میں اس لئے تو ٹھیکیدار گھبراتے نہیں اور رقمیں پی جاتے ہیں۔ حقوق العباد کا خیال نہیں کرتے۔ آخرت کا دم نہیں بھرتے۔ مال کھا کے بھی ہارٹ اٹیک سے نہیں مرتے۔

آیئے! اب اصل موضوع کی طرف آتے ہیں کہ ایک سیانے شخص نے نیکیاں کمانے کا ایک انوکھا طریقہ اپنایا۔ قارئین کو یاد ہوگا جب سینماؤں پر مکمل عروج تھا تو محرم کے مہینے میں دو دن سینما بند ہوتے تھے۔ محرم کا مہینہ شروع ہوتا۔ فلمیں چلتی رہتی تھیں۔ محرم کی نو اور دس تاریخ کو اعلانیہ محرم کے احترام میں سینما بند کر دیئے جاتے تھے۔ گیارہ محرم کو پھر فلمیں چلنا شروع ہو جاتی تھیں جو پورے مہینے چلتی رہتی تھیں۔ ہمارے شہر بہاولپور میں بس اڈے کے قریب (پرانی سبزی منڈی) روڈ پر ایک سینما ہے جس کا نام گیریژن سینما ہے۔ اس سینما کے ٹکٹ زیادہ مہنگے نہیں ہوتے تھے اس لئے اس سینما پر عوام کا زیادہ رش ہوتا تھا۔ جتنا عرصہ بھی یہ سینما چلا ہے خوب بزنس ہوا ہے۔ آخر وہی ہوا پرانا سو دن نواں نو دن، جہاں پرانے سینما پٹ گئے گیریژن پر بھی زوال کا وقت آ گیا۔ موٹی موٹی طوائفوں کی ننگی رانوں والے پوسٹر بھی لگائے گئے، رقص بھی دکھائے گئے لیکن عوام بھی طوطا چشم ہے۔ آخر طوطے کی طرح پھُر سے اُڑ گئی۔ پھر انڈین فلمیں بھی چلائی گئیں لیکن کوئی حربہ کامیاب نہ ہوا۔ آہستہ آہستہ سموسوں اور بوتلوں والے دُکاندار بھی بھاگ گئے۔

میرا ایک دوست وحید ہے، وہ بھی وہاں کا ٹھیکیدار تھا، سموسوں کا۔ وہ بھی دُکان چھوڑ آیا ہے۔ اب فتح خان بازار کی چڑھائی پر فروٹ چاٹ کی دُکان کر رہا ہے۔ انیس جنوری 2014ء بروز اتوار میں سبزی منڈی روڈ پر آ رہا تھا۔ گیریژن سینما کے قریب سے گزرا تو بڑے گیٹ کے ساتھ دیوار پر موٹا موٹا لکھا ہوا تھا۔ محرم کے احترام میں محرم کے پورے مہینے سینما بند رہے گا۔ میں یہ تحریر پڑھ کے ٹھٹک گیا اور سوچنے لگا۔ واہ بھئی واہ، کیا بات ہے۔ محرم کا یہ احترام تو واقعی قابل ستائش ہے۔ وہ بھی دور تھا جب محرم میں صرف دو دن نو دس کو سینما بند ہوتے تھے۔ اب احترام کا یہ عالم ہے کہ سینما پورا مہینہ بند کر دیا گیا ہے۔ یہ تو بڑی ایمان افروز بات ہے۔ آخر غیرت تو ہوتی ہے۔ خوف خدا بھی کوئی چیز ہے۔ اگر اتنا خو کسی انسان کے دل میں جاگزیں ہو جائے تو یہ خوف ایمان دار ہونے کی دلالت کرتا ہے۔ یہ اشتہار محرم کے مہینے کا تھا۔ اب تو خیر سے ربیع الاوّل کی 17 تاریخ ہو چلی تھی۔ یعنی محرم کا مہینہ گزر گیا تھا۔ ظاہر ہے اب سینما کو کھل جانا چاہئے تھا۔

میں تھوڑا سا آگے ہوا اور کھلے گیٹ سے اندر جھانکا وہ برآمدہ سامنے ہی ہے جس میں پوسٹر لگے ہوتے ہیں، میری نگاہ برآمدے کی اُن جالیوں پر گئی جس میں پوسٹر لگے ہوتے تھے پوسٹر غائب تھے۔ جالیاں ویران تھیں۔ اندر تاریکی تھی۔ بندہ نہ بندے کی ذات۔ مجھے حیرت بھی ہوئی اور سینما منیجر کی نیکی پر رشک بھی آیا۔ اب سوال یہ تھا کہ محرم کا مہینہ تو ختم ہو چکا تھا جس کے احترام میں سینما بند کیا گیا تھا۔ اب ربیع الاوّل کی سترہ تاریخ تھی، اب تک سینما کو دوبارہ کھل جانا چاہئے تھا مگر وہ ابھی تک بند تھا۔ اندر ہُو کا عالم طاری تھا۔ میں نے ذہن پر ذرا سا زور دیا تو ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ سینما مالک نے جب دیکھا کہ فلمیں تو ویسے بھی فلاپ ہو رہی ہیں، لوگ آنے کا نام نہیں لے رہے تو اس نے بورڈ آویزاں کر دیا کہ محرم کے پورے مہینے سینما احترام میں بند رہے گا۔ یہ نیکی کمانے کے اس کے نیک خیالات تھے۔ اب لوگ تو ویسے نہیں آ رہے تھے۔ کاش سینما منیجر لکھوا دیتا "سینما محرم اور ربیع الاوّل اور رمضان شریف میں بند رہے گا" اس طرح اس کی جزا میں خاطر خواہ اضافہ ہو جاتا۔

❁❁❁

میں ذات کا چمرنگ ہوں۔ ایشور نے حکومت دی ہے تو
بھاگتے کیوں ہو اطمینان اور فراغت سے زندگی بسر کیے جاؤ
بھگوان جسے جیسا چاہتے ہیں بنا دیتے ہیں۔ ان کی لیلا اپرم اپار ہے۔

روپ بہروپ

مظفر حسین ملک ایم۔اے

مئی 1817ء کی ایک صبح کو جب بنارس کے بڑے بازار میں گنگا دین چمار پربھو کا نام جپتے ہوئے حسبِ معمول اپنی دُکان کھولنے کے لیے آیا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ پانچ چھ سال کا ایک خوبصورت لڑکا اس کی دُکان کے تھڑے پر پڑا سو رہا ہے۔ گنگا دین چمار پچپن سال کی عمر میں بھی بے اولاد تھا۔ اس کی بیوی لیلاوتی سن یاس کو پہنچ چکی تھی اور بظاہر دونوں میاں بیوی اپنی تقدیر پر قانع اور شاکر ہو چکے تھے لیکن پھر بھی رات کی تنہائیوں میں جب بھی وہ ایک دوسرے سے دلجوئی اور پیار کی باتیں کرتے تو اولاد سے محرومی کے تذکرے سے باز نہ رہ سکتے۔

"ایشور کے پاس کیا کمی تھی جو ایک چاند سا بچہ ہمیں بھی دے دیتا جو ہمارے گھر کی رونق اور ہمارے بڑھاپے کا سہارا ہوتا"۔ لیلاوتی نہایت مایوسی کے انداز

سے کہتی۔

گنگا دین کو لیلاوتی کی بے ثمری کا صدمہ اس سے کم نہ تھا لیکن پھر بھی وہ اپنی شریک حیات کی حوصلہ افزائی کے لئے "ایشور کی مرضی" کا جملہ دہرا دیتا اور پھر ایک ٹھنڈی آہ بھر کر بات کا رُخ کسی دوسری طرف موڑ دیتا۔ کبھی کبھی وہ کسی رشتہ دار یا ہمسائے کا بچہ لے کر پالنے کی تجویزیں بھی بناتے مگر یہ تجویزیں کسی نہ کسی بناء پر عملی جامہ سے محروم رہتیں۔

لڑکے کو دیکھتے ہی گنگا دین کے دل میں اولاد کی خواہش کے جذبات جاگ اٹھے اور اس نے نرمی سے بچے کو جگایا اور پوچھا کہ وہ کون ہے۔ لڑکا جاگا اور گنگا دین کی طرف سہمی ہوئی نظروں سے دیکھ کر بولا۔ "میں چاند ہوں، میری ماں مجھے چاند کہا کرتی تھی"۔

"کہاں ہے تمہاری ماں؟" گنگا دین نے بچے کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"وہ مرگئی ہے۔ چند دن ہوئے لوگوں نے اس کی لاش کو جلا دیا تھا"۔ بچہ اب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"اور تمہارا باپ کہاں ہے؟" گنگا دین نے ہمدردانہ لہجہ میں دریافت کیا۔

"میں نے اپنا باپ کبھی نہیں دیکھا۔ میری ماں کہا کرتی تھی کہ وہ بھگوان کے پاس میرے لئے کھلونے لینے گیا ہوا ہے"۔ لڑکے نے روتے ہوئے جواب دیا۔

"تمہارا کوئی اور بھی بہن بھائی ہے؟" گنگا دین کا لہجہ پہلے سے بھی ہمدردانہ تھا۔ لڑکے نے سسکتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔ اس کے آنسوؤں کے قطرے گالوں اور ٹھوڑی پر سے ہوتے ہوئے اس کی میلی کرتی پر گر رہے تھے۔

لڑکا روئے جا رہا تھا اور گنگا دین اپنا جھریوں بھرا ہاتھ اس کے سر پر رکھے خاموش کھڑا تھا مگر اس کا ذہن عجیب کشمکش میں مبتلا تھا۔ ایک خوبصورت یتیم بے یار و مددگار لڑکا ایک بے اولاد گھر کی رونق کا سامان تو ضرور بن سکتا ہے مگر وہ چمار ہے اور لڑکا کیا معلوم کسی اونچی جاتی سے تعلق رکھتا ہو۔ آج ممکن ہے کوئی برہمن یا کھتری اسے گھر میں پناہ نہ دے مگر اسے جب ایک چمار نے اپنا لیا تو یہ معاملہ فرقہ وارانہ کشمکش کا باعث بن کر خطرہ کا موجب ہو سکتا ہے۔ اس نے ارادہ کر لیا کہ لڑکے کو اس کے حال پر چھوڑ کر دُکان کھولے۔ وہ اس کے سر سے اپنا ہاتھ ہٹانا ہی چاہتا تھا کہ اس کی نگاہ دوبارہ لڑکے کے معصوم اور خوبصورت چہرے پر پڑی اور اس کے ساتھ ہی لڑکے کو اپنانے کی خواہش فرقہ وارانہ فساد کے خطرے پر غالب آ گئی اور گنگا دین دُکان کھولنے کی بجائے چاند کو لے کر اپنے گھر کی طرف ہو گیا۔

لیلاوتی گھر کے آنگن میں جھاڑو دے رہی تھی کہ خلاف معمول اپنے خاوند کو واپس آتے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اسے گنگا دین کے گھر میں آئے تیس سال سے زیادہ گزر چکے تھے، وہ کبھی دوپہر کے کھانے سے پہلے دُکان سے گھر واپس نہیں آیا تھا اور پھر یہ لڑکا کون ہے؟ اس نے اس سے پہلے تو اسے کبھی نہ دیکھا تھا۔ گنگا دین نے گھر میں قدم رکھتے ہی لیلاوتی کو صبح کے واقعہ سے آگاہ کیا اور لڑکا اس کے حوالے کر کے دُکان پر واپس چلا گیا۔ ٹھاکر ہردت کے لڑکے کی شادی نزدیک آ رہی تھی اور بہو کے پاؤں کی جوتیاں ابھی تیار ہونا باقی تھیں، ٹھاکر صاحب کے آدمی روزانہ یاددہانی کرا جاتے تھے۔

لیلاوتی نے بچے کو دلاسا دیا۔ لسی اور جوار کی روٹی کھانے کو دی اور پاس بیٹھ کر دلجوئی کی باتیں کرنے لگی۔ چاند سچ مچ لیلاوتی کے لئے چاند بن کر آیا وہ اس سے مادرانہ شفقت سے پیش آتی اور کبھی اپنی آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دیتی۔

دُکان پر واپس جا کر گنگا دین نے بچے کے خاندان اور ورثاء کی تحقیقات کی غرض سے اکثر گاہکوں اور

دوسرے دُکانداروں سے تذکرہ کیا مگر کوئی پتہ نہ چل سکنے پر خاموش ہو گیا۔ اس طرح چاند کی پرورش جو خدا جانے کس خاندان کا چشم و چراغ تھا، ایک چمار کے گھر ہونے لگی۔

گنگا دین کا کچا مکان ایک برہمن کے محل سے متصل تھا۔ محل کے ساتھ یہ کوٹھایوں معلوم ہوتا تھا جیسے کسی ملکہ کے سامنے کوئی بھکاری بچہ کھڑا بھیک مانگ رہا ہو مگر قدرت کی ستم ظریفی سے یہ محل اور جھونپڑا برسوں سے ہم نشین تھے۔ برہمن چمار کی ہمسائیگی کو ناپسند کرنے پر بھی برداشت کر رہا تھا کیونکہ گنگا دین اس کے کنبہ کے سب افراد کی جوتیوں کی مرمت کی کوئی اُجرت نہ لیتا تھا۔

برہمن کا ایک لڑکا تھا جو کند ذہنی میں اپنی مثال آپ تھا برہمن روزانہ اسے صبح سویرے بالا خانے میں بٹھا کر ویدوں سے منتر اور اشلوک یاد کرواتا۔ سو سو دفعہ کہلواتا مگر اس نالائق کو کچھ نہ یاد ہوتا اور برہمن تھک کر اس عمل کو دوسرے دن پر ملتوی کر دیتا۔ اس بالاخانے کی ایک کھڑکی گنگا دین کے صحن کی طرف کھلتی تھی جہاں بیٹھ کر چاند مرغیوں کی نگرانی کیا کرتا تھا۔ خالی الذہن ہونے کے باعث اس کے کان برہمن کی آواز کی طرف متوجہ ہو جاتے اور اس طرح وہ اسباق جو برہمن اپنے لڑکے کو دیتا تھا چاند اپنی خداداد ذہانت کی بناء پر اپنے ذہن میں مرغیاں ہنکاتے وقت یاد کر لیتا۔ کسی کو اس کا گمان بھی نہ تھا ورنہ اچھوت کے کانوں میں مقدس اشلوک کی سماعت کے جرم میں پگھلا ہوا سیسہ بھرنے والوں کی اس دور میں کمی نہ تھی۔

وقت گزرتا گیا گنگا دین نے کئی دفعہ اس خیال کا اظہار کیا کہ چاند دُکان پر جا کر مرمت کے کام میں اس سے ہاتھ بٹائے اور نئے جوتے بنانا سیکھ لے کیونکہ اب وہ بوڑھا ہو رہا تھا اور چاند کو وہ اولاد کی طرح اسی لئے پال رہے تھے کہ بڑا ہو کر ان کی ضعیفی کا سہارا بنے۔ مگر لیلاوتی ہمیشہ اس تجویز کی مخالفت کرتی۔ وہ کہتی کہ بھگوان جانے یہ لڑکا کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور ہم اسے چمار کیوں بنائیں۔ جوان ہو کر اس شہر سے نکل جائے گا اور کہیں دور جا کر محنت مزدوری سے اپنا پیٹ پال لے گا۔ ایشور کی دیا سے اگر اس کے بھاگ اچھے ہو گئے تو ہمارے احسان کو فراموش نہیں کرے گا۔ یہ اصیل معلوم ہوتا ہے۔

یہ گفتگو اکثر چاند کے سامنے ہوتی اور غالباً اسی کا اثر تھا کہ وہ برہمن کے اسباق میں روز بروز زیادہ دلچسپی لیتا غور سے سنتا اور محنت سے یاد کرتا۔

1808ء میں لارڈ ولیم بینٹنگ گورنر جنرل ہو کر ہندوستان میں تشریف لائے۔ انہوں نے آتے ہی ٹھگی کے انسداد کی مہم شروع کی۔ ٹھگی کے جرم کے لئے سزائے موت تجویز ہوئی اور شہر بہ شہر منادی کی گئی کہ جو کسی ٹھگ کو پکڑوائے گا اسے خاطر خواہ انعام دیا جائے گا۔

یہ اعلان چاند نے بھی سن لیا۔ اب وہ اٹھارہ انیس برس کا نوجوان تھا کچھ کرنے اور کمانے کے ولولے سے سرشار اور جوانی کی جرأت سے مالا مال تھا۔ برہمن نے یا تو اپنے لڑکے سے مایوس ہو کر یا اپنا سرمایہ علم ختم ہو جانے کی وجہ سے اسباق کا سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔ سوچا کہ اب وقت ہے کہ وہ اس شہر کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دے اور پردیس میں جا کر قسمت آزمائی کرے۔ لیلاوتی اور گنگا دین سے مشورے ہوئے اور چند دن بعد چاند ایک گڑوی، ڈوری اور چند کپڑوں کی گٹھڑی لئے ایک صبح لکھنؤ کی سڑک پر سفر کر رہا تھا۔

بنارس سے ابھی چند میل ہی دور گیا تھا کہ پیچھے سے رتھ پہیوں کی گھڑ گھڑ سنائی دی۔ چاند سڑک کو چھوڑ کر ایک طرف ہٹ گیا وہ کچھ تکان محسوس کر رہا تھا۔ ابھی تک اس کے ذہن کی حالت کچھ غیر یقینی سی تھی وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اسے کہاں جانا ہے۔ ٹھگوں کے متعلق جو حکایات اس نے سن رکھی تھیں وہ خاصی خوفناک تھیں اسے خطرہ تھا کہ

کہیں وہ بھی ان کا شکار نہ ہو جائے۔ اگرچہ اس کی خواہش یہ تھی کہ وہ کسی ٹھگ یا گروہ کا پتہ چلا کر اعلان کے مطابق انعام حاصل کرے مگر ظاہر ہے کہ اسے اس کام کا کوئی تجربہ نہ تھا وہ اس ذہنی کشمکش میں مبتلا سڑک کے کنارے کھڑا تھا کہ رتھ اس کے پاس آ کر رک گئی۔ رتھ میں گیروے کپڑے پہنے ایک سادھو سوار تھا اس نے چاند سے دریافت کیا کہ وہ کون ہے اور کہاں جا رہا ہے۔ چاند نے جواب دیا کہ وہ بیکار ہے اور تلاش معاش میں سرگرداں ہے۔ سادھو نے اسے رتھ میں بیٹھنے کا اشارہ کیا مگر اس پیشکش کو قبول کرنے پر چاند آمادہ نہ ہوا اور اپنی جگہ پر بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ وہ سہما ہوا دکھائی دیتا تھا۔ سادھو نے اپنی پیشکش کو دہرایا کہ اسے رتھ میں سوار ہو کر اپنا سفر جاری رکھنا چاہئے اور دوران سفر میں ملازمت کی شرائط طے کر لینی چاہئیں۔ اگر اسے سادھو کی پیش کردہ شرائط پر ملازمت منظور ہو تو بہتر ورنہ اسے اختیار ہوگا کہ اگلے شہر میں وہ رتھ سے اتر کر اپنی راہ لے، سادھو کو اس سے کوئی سروکار نہ ہوگا۔

اس تقریر سے چاند متاثر ہو کر نیم دلی سے رتھ میں سوار ہو گیا۔ سادھو نے اسے چاول کا مرنڈہ کھانے کے لئے دیا اور اس طرح گفتگو کا آغاز کیا۔

"تمہارے چہرے پر ذہانت نمایاں ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم میرے ساتھ فائدے میں رہو گے۔ میں تمہیں اتنی تنخواہ دے دوں گا جو نہ صرف تمہاری موجودہ ضروریات کے لئے کافی ہوگی بلکہ اگر عقلمندی سے کام لے کر پس انداز کرتے رہے تو مستقبل میں بھی آسائش سے بسر کر سکو گے"۔

چاند نے قدرے دلچسپی لیتے ہوئے دریافت کیا۔

"کام کیا ہوگا"۔ اور مرنڈہ کھانا شروع کر دیا۔ چاول اور گڑ کا امتزاج اسے بڑا لذیذ معلوم ہو رہا تھا۔

"جیسا کہ میرے لباس سے ظاہر ہے میں سنیاسی ہوں۔ میرے پاس چند مجرب نسخے ہیں جو مختلف ڈبوں میں بند اس صندوق میں رکھے ہیں جس پر میں بیٹھا ہوں۔ تمہارے ذمے یہ کام ہوگا کہ جب میں مجمع لگا کر ادویات فروخت کرنے لگوں تو مجھے مختلف ڈبے جن کی طرف میں اشارہ کروں پکڑاتے جاؤ۔ فرصت کے اوقات میں ادویات پیسنا اور رتھ کے بیلوں کی خبرگیری بھی تمہارے ذمہ ہوگی"۔

چاند کو یہ مشغلہ دلچسپ معلوم ہوا اور وہ یہ سوال کئے بغیر نہ رہ سکا کہ کیا وہ بھی دوائیاں کوٹتے کوٹتے سنیاسی بن جائے گا؟

سادھو نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا کہ میں نے بھی کسی زمانہ میں تمہاری طرح ایک سنیاسی سے یہی سوال کیا تھا اور جواب تمہارے سامنے ہے۔

مرنڈے اور سادھو کی گفتگو کی شیرینی چاند کے خدشات پر غالب آ چکی تھی اور وہ بخوشی سادھو کی ملازمت پر تیار ہو گیا۔

سادھو نے جسے اب چاند سنیاسی جی کے لقب سے مخاطب کر رہا تھا چاند کو شاباش دیتے ہوئے اس کی ذہانت اور معاملہ فہمی کی تعریف کی اور بتایا کہ اگلا قصبہ نزدیک ہی ہے جہاں پہنچ کر وہ قدرے آرام کرنے اور کھانا کھانے کے بعد مجمع لگائیں گے۔

باتوں باتوں میں وہ قصبے میں پہنچ گئے۔ ایک سستی سی سرائے میں اترے بیلوں کے چارے اور پانی کے بعد انہوں نے فراغت سے کھانا کھایا۔ تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد تیسرے پہر کے قریب سادھو نے اپنا صندوق کھولا اور چھ سات میلے میلے ڈبے اور ایک چھلنی نکالی۔ ایک چھوٹے سے کنستر سے سیاہ روغن نکال کر اس میں انڈیلا اور دو چار مرے اور کھال اترے ہوئے سانڈے اس میں ڈال دیئے ایک بقچہ کھولا اور اس میں سے خالی شیشیاں اور ڈبیاں نکالیں۔ پڑیاں باندھنے کے لئے ردی

کاغذ اور ڈبوں میں سے ادویات نکالنے کے لئے خالی ڈبے درست کئے اور سرائے کے باہر سڑک کے کنارے نے جا کر انہیں آراستہ کیا۔ چاند بھی ایک ہونہار شاگرد اور فرمانبردار نوکر کی طرح چیزیں اٹھا کر سڑک تک پہنچانے اور ان کی حفاظت میں بڑی مستعدی دکھاتا رہا۔

ادویات کو سجا کر رکھنے کے بعد سنیاسی اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور چند منتر چپنے لگا۔ چاند نے محسوس کیا کہ سادھو کا تلفظ اور لب و لہجہ بہت زیادہ غلط ہے مگر چونکہ اس کی اپنی تعلیم بھی باقاعدہ نہ تھی اس لئے چپ ہو رہا۔

راہ چلتے لوگ جن میں بچے، بوڑھے، جوان، تجارت پیشہ، ملازمین، طالب علم، امیر غریب غرض ہر قسم کے لوگ شامل تھے، سادھو کے گرد جمع ہو گئے۔ اب سادھو نے منتر بند کر کے لطیفے اور پہیلیاں کہنی شروع کر دیں اور پھر نابالغ لڑکوں کو مجمع سے چلے جانے کے لئے کہا۔ جن میں سے بعض تو چلے گئے اور بعض بڑی عمر کے لوگوں کی اوٹ میں ہو گئے۔

اب سادھو نے اپنی تقریر کا آغاز کیا۔

"صاحبو! میں سنیاسی ہوں۔ چودہ سال گورو گورکھناتھ کے ساتھ نیپال کی پہاڑیوں میں گھوما ہوں۔ اس سیر کے دوران میں دیوتاؤں کی سرزمین اور اگنی کنڈ میں بھی جانا ہوا۔ سرب ناگ دیوتا سے بھی ملاقات ہوئی۔ جڑی بوٹیوں کی دوا بھی شریمان گورو جی سے سیکھی اور اب کچھ خدمتِ خلق کی خاطر اور کچھ گورو جی کے فرمان کو پورا کرنے کے لئے شہر بہ شہر گھوم رہا ہوں تا کہ آپ کے دکھوں میں کمی ہو، بیماری اور کمزوری کی جڑ کٹ جائے اور روگ کا ناش ہو جائے۔"

اس کے بعد اس نے ہلدی کی قسم کی ایک گانٹھ ایک ڈبے سے نکالی اور مجمع کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ "یہ جڑی گورو جی نے سرب ناگ دیوتا سے لے کر دی تھی۔ اس کی خاصیت یہ ہے کہ ذرا سے پانی میں رگڑ کر رات کو

سوتے وقت آنکھ میں لگایئے تو اندھا نظر پائے کمزور بینائی والے کی بینائی تیز ہو اور تندرست آنکھ ہر روگ اور بیماری سے محفوظ رہے"۔

"صاحبو! میں اس کی کوئی قیمت نہیں لینا چاہتا مگر اس کو خالص حالت میں استعمال کرنا آپ لوگوں کے بس کی بات نہیں۔ آپ دنیادار لوگ پاپ اور کشٹ کے جنم بھوگ رہے ہیں اور اسے خالص استعمال نہیں کر سکتے۔ چنانچہ اس کی شدت کو کم کرنے کے لئے اسے سچے موتیوں اور جواہرات کے ساتھ ملا کر پیس لیا گیا ہے۔ پیستے وقت مقدس ویدوں کے منتر جپنے پڑتے ہیں اور پہاڑوں کی گپھاؤں میں چلہ کشی کرنی پڑتی ہے۔ اگر میں قیمت نہ لوں تو سچے موتی کہاں سے خریدوں۔ اس لئے میرے دوستو! اس کی لاگت وصول کرنے اور دنیا کی بھلائی کا سلسلہ جاری رکھنے کے لئے اس کی مناسب قیمت کمپنی بہادر کا ایک روپیہ فی شیشی رکھی گئی ہے جن دوستوں کو ضرورت ہو ہاتھ کھڑا کر دیں"۔

چھ سات آدمیوں نے ہاتھ کھڑے کئے اور چاند نے سنیاسی کی ہدایت کے مطابق چھ سات شیشیاں بھر کر ان کے ہاتھ میں دے دیں اور اسی قدر روپے جوگی کی جیب میں جھنکارتے ہوئے داخل ہو گئے۔

سرمے کے بعد چورن اور چورن کے بعد درد دوں کی دوا بیچی گئی۔ سنیاسی اور ودیا کے شاہکار سانڈے کے تیل کی باری آئی جس میں ریچھ اور شیر کی چربی کے علاوہ دیوتاؤں کی پسندیدہ اور مقبول بوٹیوں کا جوہر بھی شامل تھا وہ اس قدر بکا کہ معلوم ہوتا تھا کہ اس قصبہ کی تمام مرد آبادی کو اس تیل کی ضرورت ہے۔

دن گزرتے گئے، سنیاسی اور اس کا شاگرد ایک قصبے سے دوسرے قصبے اور ایک شہر سے دوسرے شہر میں گھومتے رہے۔ اس دوران میں چاند پر اس پیشہ کے کئی اسرار و رموز منکشف ہوئے مثلاً اگر چورن کی جگہ سرمہ اور سرمے کی جگہ چورن دے دیا جائے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یا ارنڈی کے تیل کو کالا کر کے اس میں چمڑہ اترا ہوا سانڈا ڈال دیا جائے تو وہ سانڈے کا تیل ہو جاتا ہے۔ یا سیپیاں اور گھونگھے طبی اصطلاح میں سچے موتی اور گریس ریچھ اور شیر کی چربی کہلاتی ہے۔ ہر دوا دوسری دوا کا بدل اور ہر مرض کے لئے باعث شفا ہو سکتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس شہر یا قصبہ میں دوبارہ نہیں جانا چاہئے جس میں کہ ایک دفعہ مجمع لگایا جا چکا ہو۔

لیکن ایک دفعہ یہ غلطی ہو گئی اور وہ کسی ایسے قصبے میں جا نکلے جہاں سنیاسی جی زیورات اور روپے دگنے کر چکے تھے۔ سنیاسی کو دیکھتے ہی لوگوں میں چہ میگوئیاں ہوئیں اور اس سے پیشتر کہ وہ راہ فرار اختیار کرتے دیہاتیوں نے رتھ اور بیلوں پر قبضہ کر لیا کچھ لوگوں نے سنیاسی جی کے کپڑے اتار لئے۔ کسی نے تھیلوں اور گٹھڑیوں کی تلاشی لینا شروع کی۔ وہ خوش معلوم ہوتے تھے کیونکہ نقدی اور زیورات کی شکل میں جوگی کی تھیلیوں سے اس قدر مال برآمد ہو گیا تھا کہ اس نقصان سے کئی گنا زیادہ تھا جو روپے دگنے کرانے کے شوق میں وہ برداشت کر چکے تھے۔ دیہاتیوں کو نقد و جنس کی تقسیم میں محویت سے مشغول دیکھ کر چاند اپنے مالک کی پروا کئے بغیر ایک طرف کھسک گیا اور جب دیکھا کہ وہ محفوظ فاصلہ پر پہنچ چکا ہے تو اطمینان سے دوسرے قصبے کی راہ لی۔ کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد اسے خیال آیا کہ شاید جوگی بھی ٹھگ تھا اور اگر وہ اسے پکڑوا دیتا تو انعام پاتا اور پھر اس نے یہ سوچا کہ اگر وہ خود بھی دیہاتیوں کے ہاتھ آ جاتا تو وہ دو ٹھگوں کے پکڑوانے کا انعام پاتے۔

وہ یہ سوچتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ لکھنؤ پہنچ گیا۔ یہاں اسے ایک بنئے کے پاس ملازمت مل گئی۔ بنیا وسیع کاروبار کا مالک تھا۔ اشیائے خوردنی کی تجارت کرتا تھا۔

یہ نصیر الدین حیدر بادشاہ کا عہد تھا۔ شاہی محل کے توشہ خانے کا سارا مال اسی بنئے کی معرفت منگایا جاتا تھا وہ اپنے پیشے کے اسرار و رموز کی بہت نگہداشت کرتا تھا۔ مگر چاند کو محنتی اور دیانتدار ملازم سمجھ کر اس نے اسے بہت کچھ سمجھا دیا مثلاً ہلدی میں اگر نصف سے زیادہ اینٹیں پسوا دی جائیں تو ایک چھٹانک فی من کے حساب سے پیلا رنگ ضرور ملا لینا چاہئے۔ اگر کسی جنس کو توشہ خانے کا داروغہ پسند نہ کرے تو اسے اس کی قیمت کا پانچ فی صدی پیشگی دے دینا چاہئے لیکن مال دیتے وقت وزن بے شک دس فی صد کم ہو کیونکہ ایسی صورت میں داروغہ صاحب مال تولنے میں زیادہ محتاط نہیں ہوتے۔ بڑے بڑے عہدہ داروں کی بھی بعض ضروریات ایسی ہوتی ہیں جو ہم لوگوں کی مدد کے بغیر پوری نہیں ہو سکتیں ایسے لوگوں کا خاص خیال رکھنا چاہئے۔

چاند کا وقت نہایت اطمینان سے گزر رہا تھا کہ ایک دن بنئے کو خرید و فروخت کے سلسلے میں باہر جانا پڑا اس کی عدم موجودگی میں باہر سے کافی مقدار میں گھی آ گیا۔ کارندوں کو غالباً اس کا پیشتر علم ہو گیا تھا کہ بنیا ان ایام میں لکھنؤ سے باہر ہو گا انہوں نے گھی میں پچاس فیصد ملاوٹ کر دی۔ چاند اس ملاوٹ شدہ گھی کو پہچان نہ سکا اور اپنے گودام میں اس نے بھی حسب معمول گھی کی مقدار کے برابر اس میں ملاوٹ کا اضافہ کر دیا۔ اس طرح سے جو مواد تیار ہوا اس میں خالص گھی کس قدر تھا اس کے اندازے کے لئے اس عہد میں کوئی مشین ایجاد نہیں ہوئی تھی۔

بدقسمتی سے یہی مواد توشہ خانہ سے ہوتا ہوا شاہی دسترخوان پر پہنچ گیا۔ توشہ خانے کا داروغہ تو ملازمت سے برخاستگی پر ہی چھوٹ گیا مگر بنئے کے لئے سزائے قید اور سب جائیداد کے بحق سرکار ضبط ہونے کا فیصلہ صادر ہو گیا۔ بنیا ابھی لکھنؤ تک نہ پہنچا تھا کہ سرکاری کارندے مال کی ضبطی اور بنئے کی گرفتاری کے لئے پہنچ گئے لیکن ان میں سے ہر ایک کی خواہش یہ تھی کہ مال بحق سرکار ضبط کرنے سے پہلے جس قدر قیمتی اسباب ان کے اپنے گھروں میں پہنچ جائے وہی غنیمت ہے۔ چنانچہ ہر ایک کو اپنی خواہش کی تکمیل میں محو پا کر چاند نے وہاں سے بھی راہ فرار اختیار کی اور بچتا بچاتا لکھنؤ سے باہر ہو گیا۔

اس کے بعد اسے جن واقعات سے دوچار ہونا پڑا اس کی تفصیل کسی آئندہ موقع پر اٹھا رکھتے ہوئے آج صرف اس قدر بتایا جا سکتا ہے کہ وہ گھومتا پھرتا وسط ہند کی ایک ریاست میں پہنچا۔ اس نے سوچا کہ دنیا میں جس قدر پیشے ہیں ان سب میں کسی نہ کسی حد تک تنگی ضرور ہے اور خطرہ سے خالی نہیں۔ بہتر ہے کہ اس علم کی تکمیل کی جائے جو بچپن میں اتفاقی طور پر حاصل ہوا تھا اور باقی عمر پوجا پاٹ میں بسر کر دی جائے چنانچہ اس نے برہمن کا روپ اختیار کیا اور کسی استاد کامل کا متلاشی ہوا۔

مختلف مندروں اور پاٹھ شالوں کا چکر لگاتے ہوئے اس کی رسائی شاہی دربار کے برہمن تک ہو گئی۔ درباری برہمن اب بڈھا ہو چکا تھا اس کے ہاں صرف ایک لڑکی تھی جو بڑی تیزی سے بچپن کی منزلیں طے کرتی ہوئی جوانی کی وادیوں میں داخل ہو رہی تھی۔ چاند کی

روشن باتیں

☆ فرمان رسول ﷺ: قیامت کے دن یقیناً اللہ کے نزدیک وہ شخص سب سے بُرا شمار ہو گا جسے لوگوں نے اس کی بدزبانی کی وجہ سے چھوڑ دیا ہو۔ (نبیلہ نازش)

☆ زمین کے اوپر عاجزی کے ساتھ رہنا سیکھ لو، زمین کے نیچے سکون سے رہ پاؤ گے۔

☆ دل میں برائی رکھنے سے بہتر ہے کہ ناراضگی ظاہر کر دو۔ (ممتاز۔ سرگودھا)

ذہانت، دیانت اور محنت نے برہمن کے دل پر اس قدر اثر کیا کہ اس نے نہ صرف اسے گوہر تعلیم سے مالا مال کیا بلکہ خانہ داماد بنا کر اپنے گھر رکھ لیا۔

چاند اب قسمت کی بلندیوں پر تھا۔ اس کے ایام نہایت اطمینان اور فراغت سے بسر ہو رہے تھے۔ اسے اگر کوئی دکھ تھا تو یہ تھا کہ وہ غریب چمار اور چمارن جنہوں نے اسے کمال محنت اور شفقت سے پالا تھا اس کی دولت میں کسی طرح حصہ دار نہ ہو سکتے تھے وہ انہیں بآسانی بلا سکتا تھا یا روپیہ بذریعہ ڈاک یا کسی اور واسطہ سے ارسال کر سکتا تھا مگر اس طرح راز افشا ہو جانے کا خطرہ تھا۔ اگر یہ ظاہر ہو جاتا کہ وہ نقلی برہمن تھا یا اس کی پرورش چماروں کے گھر ہوئی تھی تو مہاراجہ کا غضب نہ صرف اسے بلکہ اس کے سسرال کو بھی تباہ و برباد کر دیتا۔

وہ اسی فکر میں تھا کہ اس نے ایک دن ایک بڈھے چمار کو بازار میں "جوتا، بوٹ مرمت" کی صدا لگاتے ہوئے سنا۔ اسے اس کی آواز آشنا معلوم ہوئی۔ پاس جا کر دیکھا تو گنگا دین تھا۔ "ارے یہ کیا غضب ہوا" وہ دیکھ کر گھبرا گیا مگر اتنے میں گنگا دین بھی اسے پہچان چکا تھا۔ چاند اسے ایک طرف لے گیا۔ شاہی برہمن کے داماد کا ایک چمار سے گفتگو کرنا بہت معیوب امر تھا مگر مجبوری کا دوسرا نام صبر ہے وہ اسے ساتھ لے کر شہر سے باہر نکل آیا۔ خیریت دریافت کی تو معلوم ہوا کہ لیلاوتی کا انتقال ہو چکا ہے اور گنگا دین کی دکان تباہ ہو جانے کی وجہ سے وہ اب شہر شہر گھوم کر جوتے مرمت کر کے روٹی کماتا ہے اور ساتھ ساتھ چاند کی تلاش بھی کرتا ہے۔

اتنے میں وہ دریا کے کنارے پہنچ گئے۔ چاند نے گنگا دین کو وہاں بٹھایا اور کہا کہ وہ اپنے چماروں والے تمام ہتھیار دریا میں پھینک دے اور غسل کرے۔ اتنے میں وہ نئے کپڑے لے کر واپس آ جائے گا جنہیں پہن کر گنگا دین اپنے سمدھیوں کے گھر چلے اور اپنی بہو کو آشیر باد دے۔

پروگرام کے مطابق چاند نئے کپڑے لے کر دریا پر پہنچا اور دیکھا کہ گنگا دین نہا چکا ہے اور تھوڑے سے دھاگے اور ایک تلا چڑھانے اور باریک سلائی کرنے والی کنڈی کے سوا تمام ہتھیار دریا میں پھینک چکا ہے۔ چاند نے اسے نئے کپڑے پہنائے اور پوچھا کہ یہ کنڈی اور دھاگہ کیوں دریا میں پھینکنے سے گریز کیا گیا ہے۔ گنگا دین نے کہا کہ غلطی سے رہ گئے ہیں اور وہ جلد ہی پھینک دے گا لیکن کپڑے بدلتے ہوئے گنگا دین نے کنڈی اور دھاگہ پگڑی کے پلو میں چھپا لئے۔ عمر بھر کی رفیق اشیاء کی جدائی اسے ناقابل برداشت معلوم ہوئی۔

کپڑے بدل کر گنگا دین نے ماتھے پر تلک لگایا۔ چاند نے اسے غور سے دیکھا تو شکل وصورت اور انداز میں عام برہمنوں سے مختلف نہ پایا۔ کمی صرف ودیا کی تھی۔ اس کا یہ حل تلاش کیا کہ سوائے آشیر باد کی قسم کے عام الفاظ سے گفتگو آگے نہ بڑھنے پایا کرے اور یہ مشہور کر دیا جائے کہ سوامی جی گزشتہ کئی برس سے صرف گیان دھیان میں مگن رہتے ہیں اور کسی سے بلاوجہ اشد ضرورت گفتگو نہیں فرماتے۔

گنگا دین اپنے نئے روپ میں بظاہر مطمئن معلوم ہوتا تھا مگر اس کے دل میں خطرات کا بے پناہ سمندر موجزن تھا۔ وہ تمام عمر برہمنوں کی ہمسائیگی میں رہ کر اور ان کے جوتے بلا اُجرت مرمت کر کے بھی ان کی ڈیوڑھی کے اندر قدم رکھنے کی جرأت نہ کر سکا تھا اور آج وہ شاہی برہمن کے ہاں بطور سمدھی کے جا رہا تھا۔ بھگوان اس کی اس جرأت کی کیا سزا دیں گے آئندہ جنم میں اسے کون سی جون نصیب ہو گی اور اگر بھید کھل گیا تو اسی جنم میں جو سلوک اس کے ساتھ ہو گا وہ آئندہ جنم میں کتے کا روپ اختیار کرنے سے بھی کم نہ ہو گا۔ اس نے چاہا کہ وہ چاند سے معذرت کرے بلکہ اسے بھی ان خطرات سے نکال کر

اپنے ساتھ لے جائے۔

وہ ابھی اسی ذہنی کشمکش میں تھا کہ چاند کے چند دوست راستے میں مل گئے اس نے کہا۔ "پتا جی میرے دوستوں کو آشیرباد دیجیے"۔ اور گنگا دین نے طوطے کی طرح آشیرباد کا جملہ دہراتے ہوئے سب کے سر پر باری باری ہاتھ پھیر کر چپ ہو گیا۔ چاند نے جلدی سے کہا کہ پتا جی ایک عرصہ سے خاموش گیان دھیان میں مصروف رہتے ہیں اس لئے گفتگو سے انہیں پریشان نہ کیا جائے۔

گنگا دین دل میں سوچ رہا تھا کہ اس پر کلۂ آفت چھوکرے کی وجہ سے عجب مصیبت میں مبتلا ہوا اگر اسے معلوم ہوتا کہ یہ کمبخت یہاں برہمن کے روپ میں ہے تو اسے پہچان کر بھی نظر انداز کر دیتا۔

چند گلیوں سے گزرتے ہوئے وہ شاہی برہمن کے محل میں داخل ہو گئے جو شاہی محلات کی ہمسائگی میں تھا۔ چاند نے اپنے پتا جی کی آمد کا اعلان کیا تو سب سے پہلے اس کی بہو نے دوڑ کر اپنے سسر کے قدموں پر پرنام کیا۔ گنگا دین نے رٹے ہوئے جملے کو دہرایا اور پھر خاندان کے دیگر افراد سے ملا۔ چاند نے پتا جی کے گیان اور دھیان کا ذکر فلسفیانہ انداز میں کیا اور اس طرح گنگا دین کو مزید گفتگو کی زحمت سے بچا لیا۔ اپنی مالاؤں میں سے ایک مالا اس کے حوالے کرتے ہوئے چاند نے اسے ایک علیحدہ کمرہ میں بٹھا دیا جہاں وہ مالا سمرن کے ساتھ اپنے ہونٹ اپنے قدیم ہمسائے برہمن کی طرح ہلاتا رہتا۔

دن گزرتے گئے نئے بنارسی برہمن کے درشن کے لئے شہر کے عقیدتمندوں کا ہجوم روزانہ جمع ہو جاتا بعض صرف درشن پر ٹل جاتے۔ بعض مرادیں مانگتے اور نذرانے پیش کرتے۔ سوامی جی مہاراج کی خاموشی اور چپ کے برت نے سب کو متاثر اور خود سوامی جی کو سخت پریشان کر رکھا تھا اور وہ وہاں سے جان بچا کر واپسی کی فکر میں تھے مگر سمدھی اس قدر جلد انہیں اجازت دینے پر تیار نہ تھے۔

ایک دن جبکہ چاند کسی ضروری کام سے باہر گیا وہ تھا، اس کی بیوی جو خود اپنے ہاتھ سے سسر کو کھانا پکا کر پیش کرنے میں اپنی سعادت سمجھتی تھی اپنے بیاہ کا سنہرا جوتا جس کی زہ سے تھوڑا سا حصہ پھٹا ہوا تھا اس کے کمرے میں بھول آئی اور پھر اپنے گھریلو کام کاج میں مصروف ہو گئی۔ گنگا دین نے دیکھا کہ کتنا قیمتی جوتا معمولی سی لاپروائی سے خراب ہو رہا ہے اس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر یقین کر لیا کہ کوئی آدمی اس کی طرف متوجہ نہیں پھر آہستگی سے جوتا اٹھایا اپنی پگڑی میں سے کنڈی اور دھاگہ نکالا اور اسے مرمت کرنا شروع کر دیا۔

بہو کو کام کے دوران میں جوتے کا خیال آیا اور وہ دوڑی ہوئی اس کے کمرے میں آئی اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ بنارس کے سوامی جی نہایت اطمینان اور بے خیالی سے مرمت میں مصروف ہیں۔ کیا اس کی شادی ایک چمار سے ہوئی ہے؟ یہ خیال ایک بجلی بن کر اس پر گرا اور وہ چیخ چیخ کر رونے لگی۔

چیخ سن کر گنگا دین اس کی طرف متوجہ ہوا اور کنڈی دھاگہ گھبراہٹ میں اس کے ہاتھ سے نیچے گر پڑے۔ دوسری طرف لڑکی کے والدین دوڑے دوڑے اسے دیکھنے کے لئے آ گئے کہ اس پر کیا آفت آئی ہے اور صورت حال سے آگاہ ہو کر اسے علیحدہ لے گئے۔ اتنے میں چاند بھی آ گیا۔ اسے بھی صورت حال سے آگاہ کیا گیا اور یہ بھی بتایا گیا کہ یہ راز افشا ہونے پر نہ صرف چاند اور اس کے والد کو عبرت ناک عذاب میں مبتلا کر کے قتل کیا جائے گا بلکہ باقی خاندان کے افراد بھی محفوظ نہ رہیں گے کیونکہ چاند کی وجہ سے شاہی مندر اور درباری رسوم گاہ بھرشٹ ہو چکے ہیں۔

اس دردناک عذاب سے بچنے کے لئے صرف یہی

صورت تھی کہ رات کی تاریکی کا سہارا لے کر سارا کنبہ شہر سے نکل جائے کیونکہ یہ راز زیادہ عرصہ تک پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی وجہ سے ضرور افشا ہوگا۔ بہتر ہے کہ اس شہر کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیا جائے اور اس ریاست سے دور کسی دوسری ریاست میں جا کر تجارت کو ذریعہ معاش بنایا جائے اس کے سوا دوسری صورت ممکن نہ تھی۔

چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ رات کی سیاہی میں گھر کے سب افراد مع چاند اور گنگا دین کے بھرا ہوا گھر چھوڑ کر صرف نقدی اور زیورات وغیرہ لے کر شہر سے باہر نکل گئے۔

دوسرے دن جب برہمن پوجا پاٹ کی شاہی رسوم سے غیر حاضر رہا تو اس کا پتہ کروایا گیا معلوم ہوا کہ رات سے مکان کھلا پڑا ہے اور گھر کے سب افراد غائب ہیں۔ مہاراجہ نے یہ سمجھ کر کہا کہ انہیں کوئی تکلیف پہنچی ہے احکام جاری کر دیئے کہ برہمن اور اس کے کنبہ کو تلاش کر کے دربار میں حاضر کیا جائے کیونکہ مہاراجہ یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کا قدیم درباری برہمن اس سے ناراض ہو کر کسی اور ریاست میں چلا جائے۔

شاہی سوار ہر سمت روانہ ہوئے اور تیسرے دن برہمن کو مہاراجہ کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

مہاراجہ نے برہمن سے بھاگ جانے کی وجہ دریافت کی تو اس نے علیحدگی میں عرض حال کی منظوری چاہی درخواست منظور ہوئی اور مہاراجہ دربار برخاست کر کے برہمن کو ہمراہ لے کر محل میں چلا گیا۔

تنہائی پا کر برہمن نے عرض کیا کہ حضور! اگر جان کی امان پاؤں تو اپنے گناہ کا کچا چٹھا کھول کر سناؤں۔ میری خطا اس قابل نہیں کہ حضور معاف فرما سکیں مگر قدیم نمک خواری کی بنا پر رحم و کرم کا ملتجی ہوں۔

مہاراجہ کے دل میں برہمن کا بے حد احترام تھا اس نے حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا کہ شری جی آپ اس دربار کے قدیم نمک خوار اور مذہبی برہمن ہیں۔ وہ کون سی ایسی خطا آپ سے سرزد ہو گئی ہے کہ آپ جان کی امان مانگتے ہیں۔ آپ یقین رکھیے کہ آپ کی خطا خواہ کتنی ہی بڑی ہو گی آپ کو معاف کر دیا جائے گا۔ آپ خواہ مخواہ شرمندہ نہ کریں اور ان وجوہات سے آگاہ کریں جس کی بنا پر اس دربار سے تعلقات منقطع کرنے پر مجبور ہوئے۔

برہمن نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے عرض کیا کہ حضور میں برہمن نہیں ہوں بلکہ میرا تعلق سانسی نام کے ایک خانہ بدوش قبیلہ سے ہے۔ میں چھوٹی عمر میں اپنے قبیلہ سے جدا ہو کر ایک برہمن کے ہاتھ آ گیا تھا۔ جس نے میری داستان مصیبت سن کر مجھے نہ صرف اپنے گھر میں پناہ دی بلکہ اپنے بچوں کے ساتھ مجھے تعلیم سے بھی بہرہ ور کیا۔ میں جب جوان ہوا تو آپ کے دربار میں حاضر ہو کر ملازمت سے بہرہ یاب ہوا۔ میرا یہ فریب آپ تک منکشف نہ ہوا اور میں نہایت فراغت سے اپنا وقت کاٹتا رہا لیکن پاپ کو ایک دن ضرور ظاہر ہونا تھا اور اس کا ذریعہ میرا داماد ہوا جسے میں نے برہمن سمجھ کر اپنایا مگر حقیقت میں چمار نکلا۔ میرا گناہ معمولی نہیں لیکن اگر حسب وعدہ حضور میری اور میرے بال بچوں کی جاں بخشی فرمائیں تو میں ان کو لے کر اس ریاست سے باہر نکل جاؤں گا اور کوئی مزدوری یا تجارت کر کے اپنا پیٹ پال لوں گا۔

برہمن کی داستان سن کر مہاراجہ نے غضب میں آنے کی بجائے زور کا قہقہہ لگایا اور کہا کہ اے بے وقوف میں ذات کا چمرنگ ہوں۔ ایشور نے حکومت دی ہے تو بھاگتے کیوں ہو اطمینان اور فراغت سے زندگی بسر کیے جاؤ بھگوان جسے جیسا چاہتے ہیں بنا دیتے ہیں۔ ان کی لیلا اپرم اپار ہے۔

❀✿❀

بھارتی وزیراعظم مودی کا دورہ کشمیر

☆ 0301-3005908, 0345-8599944 گلزار اختر کاشمیری

بھارتی وزیراعظم نریندر مودی نے مورخہ 4 جولائی 2014ء کو مقبوضہ جموں و کشمیر کا دورہ کیا۔ کشمیر کے دونوں اطراف اس دن کشمیریوں نے ہڑتال کر کے اپنی نفرت کا اظہار کیا اور اس دن کو یوم سیاہ کے طور پر منایا۔ کشمیریوں کی جانب سے اس طرح کے اقدامات کا مقصد نریندر مودی کو حق خودارادیت کا حق یاد کرانا تھا اور کشمیریوں پر ظلم وستم کے واقعات کو روکنا ہے۔ کشمیری عوام نے مقبوضہ کشمیر اور آزاد کشمیر دونوں اطراف بھارتی وزیراعظم کی آمد پر جو کیا یہ ان کا جمہوری حق تھا۔ نریندر مودی کو ان کی صدا پر کان دھرنا فرق ہے لیکن بی جے پی کے عزائم سب پر عیاں ہیں۔ مودی کشمیر کو ہندو مسلم میں تقسیم کرنا چاہتا ہے۔ وہ کشمیر کی خصوصی حیثیت کا خاتمہ بھی چاہتے ہیں۔ وہ یہاں کے وسائل پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں ان سے کسی خیر کی توقع نہیں۔ کیا نریندر مودی برسر اقتدار ہونے کے بعد اپنے آپ پر لگے انتہاپسندی کے داغ دھو سکیں گے؟ لیکن یہ تصور غلط ثابت ہو رہا ہے۔ نریندر مودی ہر طرف پیش قدمی کر رہا ہے۔ وہ ہر محاذ پر جارحیت دکھا رہا ہے۔ چاہے وہ کشمیر کا محاذ ہو یا لائن آف کنٹرول کا اسلحہ خریدنے کا ہو۔

بھارت اس وقت دنیا میں اسلحے کا سب سے بڑا خریدار ہے اور حال ہی میں مودی نے اسلحہ بنانے کے لئے غیر ملکی کمپنیوں کو مالکانہ حقوق پر سرمایہ کاری کی پیشکش کی ہے۔ تازہ اطلاعات کے مطابق بھارت امریکہ سے بحری جہاز شکن ہارپون میزائل خرید رہا ہے۔ بھارت کے ان اقدامات کی وجہ سے چین ایران اور پاکستان کو بھی اپنے دفاعی اخراجات میں اضافہ کرنا پڑے گا۔ بھارت اس وقت جنگی جنون میں جتنا ہے جو پورے خطے کو اپنی لپیٹ میں لے سکتا ہے۔

نریندر مودی نے اپنی انتخابی مہم کا آغاز بھی جموں سے کیا تھا۔ اس وقت بھی اس نے جموں کے قریب کٹرہ کے مقام پر ٹرین سروس کے افتتاح اور مظفرآباد سری نگر شاہراہ پر جنگ بندی لائن کے قریب اوڑی بجلی پروجیکٹ کے دوسرے فیز کے افتتاح سے ترقیاتی مہم شروع کرنے کا اعلان کیا ہے۔ کٹرہ کی اہمیت اس لئے ہے یہاں ہندوؤں کا ایک مقدس مقام ہے۔ "ماتا وشنو دیوی" کی پوجا کے لئے تقریباً سالانہ ایک کروڑ ہندو یہاں آتے ہیں۔ یہ سب بھارت میں جن سنگھیوں کو مطمئن کرنے کے لئے ہے۔ اوڑی بجلی پروجیکٹ بھارت نے دریائے

جہلم پر جاری کیا ہے۔ یہاں سے بجلی پیدا کرنے کے لئے بھارت کے نادرن گرڈ میں شامل کی جاتی ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اس پروجیکٹ کی سویڈش کمپنی سکلسکا اور ایک برطانوی کمپنی 1984ء میں تعمیر کا آغاز کیا جبکہ اسی دوران سویڈش کمپنی سکلسکا نے آزاد کشمیر کی وادی نیلم میں جاگراں بجلی گھر بھی تعمیر کیا جو جنگ بندی لائن کے بالکل قریب ہے۔ اوڑی پروجیکٹ کو مکمل کرنے کے بعد اس کا دوسرا فیز شروع کیا گیا جو 16 سال میں مکمل ہوا ہے۔ وزیراعظم نریندر مودی نے اسی کا افتتاح کیا ہے۔ اس کی بجلی کشمیر کو نہیں بلکہ بھارت کو وقف کی ہے۔ مقبوضہ اور آزاد کشمیر میں دو مختلف بجلی گھر یورپ کی ایک ہی کمپنی کی جانب سے تعمیر ہوئے ہیں۔ نریندر مودی نے اس حالت میں کشمیر کا دورہ کیا ہے جب جنگ بندی لائن پر بھارتی فوج فائرنگ کر رہی تھی۔ اس سے آزاد کشمیر کے شہری زخمی ہو رہے تھے۔ مقبوضہ کشمیر میں پوری ریاست میں ہڑتال رہی مگر جموں میں ہندوؤں نے زبردست استقبال کیا۔

وادی کشمیر اور آزاد کشمیر میں یوم سیاہ منایا گیا۔ کشمیری بی جے پی کے عزائم سے خوب واقف ہیں یہ ہندو انتہا پسندی کا مرکز ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بی جے پی کشمیر میں پنڈتوں کے لئے الگ شہر بنا رہی ہے۔ یہ پنڈت 1988ء میں مسلح جدوجہد کے آغاز میں اس وقت کے انتہا پسند گورنر جگ موہن کی ہدایت پر کشمیر سے بھاگ کر بھارتی ریاستوں میں چلے گئے تھے۔ جگ موہن کا ارادہ ایک بڑے آپریشن کا تھا جس طرح شمالی وزیرستان سے آپریشن سے قبل لوگوں کو نکالا گیا ہے اسی طرح مقبوضہ کشمیر میں کسی بڑے آپریشن سے قبل صرف ہندو آبادی کو نکالا گیا تھا۔ راتوں رات انہیں ٹرکوں پر لاد کر جموں پہنچایا گیا۔

انہوں نے اپنے مسلم پڑوسیوں کو بھی آگاہ نہ کیا۔

یہ لوگ بھارت میں تحریک آزادی کے خلاف استعمال ہوئے۔ دنیا بھر کے سفارت خانوں میں انہیں بھیجا گیا تاکہ یہ کشمیر میں مسلح جدوجہد اور پاکستان کے خلاف پروپیگنڈہ کر سکیں۔ یہاں تک کے اسلام آباد میں بھی یہ تعینات رہے ہیں۔ نریندر مودی کشمیر کو ہندو مسلم میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کشمیر کی خصوصی حیثیت کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ یکساں سول کوڈ کا نفاذ ان کا مقصد ہے جبکہ ان کے سیاسی عزائم بھی ایسے ہیں کہ ان کی وجہ سے بی جے پی اقتدار میں آ گئی ہے۔

نریندر مودی نے گجرات میں مسلمانوں کا قتل عام کیا اور پارٹی میں جگہ بنائی۔ ایل کے ایڈوانی اور مرلی منوہر جوشی جیسے کٹر انتہا پسندوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا اس لئے وہ کشمیر میں بھی نیا کھیل کھیل سکتے ہیں۔ ہندو اور مسلم کمیونٹی کو تقسیم کرنے اور لڑانے کا کھیل ان کا پسندیدہ شغل ہے۔ بھارتی وزیراعظم کا دورہ کشمیر کے وسائل کے لوٹنے کی بھی ایک کڑی ہے۔ کشمیر اندھیرے میں ہے اور یہاں پیدا ہونے والی بجلی بھارتی ریاستوں کو سپلائی کی جاتی ہے۔ ریلوے لنک کے لئے بھی مقاصد ہیں، ریلوے کے ذریعے ہندوؤں کو "ویشنو دیوی" کی پوجا کے لئے آنے والے ہندوؤں کو سہولت دینے کے لئے بچھائی جا رہی ہے۔ اس کے علاوہ جموں کو الگ ریاست بنا دینے کا اور لداخ کو براہ راست دہلی کے انتظام میں دینے کے لئے یہ سارا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ اس کے لئے بھارت نواز کشمیری عمر عبداللہ، محبوب مفتی جیسے لوگ بھی استعمال ہوں گے۔

کشمیر میں آزادی پسندوں کی جائیدادوں کی ضبطگی

پرانے دور میں بادشاہ اپنے مخالفین کے عزیز و

اقارب کو انتقام کا نشانہ بناتے ہوئے انہیں گرفتار کرتے تھے۔ کبھی قتل کروا دیتے تھے، ان کی جائیدادیں ضبط کرلی جاتی تھیں، ان کی فصلیں جلا دی جاتی تھیں اور ان جائیدادوں پر قبضہ کرلیا جاتا تھا۔ یہ جنگل کا قانون مقبوضہ کشمیر میں آج پھر نافذ کردیا گیا ہے۔ آزادی کی جدوجہد کرنے والے مجاہدین کے رشتہ داروں کی زمینیں اور ان کے مکان بحق سرکار ضبط ہو رہے ہیں۔ سب سے پہلے حریت کانفرنس (گیلانی) کے رہنما اور پیپلز لیگ کے سربراہ غلام محمد خان سوپوری کا مکان سربمہر کردیا گیا۔ (D.G.P) کلدیپ کھودا کے حکم پر یہ کارروائی کشمیر پولیس نے کی۔

یہ 30 جون 2012ء کا واقعہ ہے سری نگر کے مائمہ کالونی نٹی پورہ علاقے میں پولیس نے غلام محمد خان کے اہل خانہ کو زبردستی گھر سے باہر نکال کر اس کو سربمہر کردیا۔ پولیس نے پہلے نہ کوئی گھر خالی کرنے کا نوٹس دیا اور نہ مہلت دی۔ ان پر حرکت جہاد اسلامی کے ساتھ تعاون کرنے کا الزام لگایا۔ پولیس کے اس اقدام کو ظالمانہ قرار دیا گیا، اس کی مزاحمت کی گئی۔ یہ اصل میں ریاست کی حکومت کا حکم تھا۔ اگرچہ یہ تین مرلے کا مکان سوپوری صاحب کی اہلیہ کے نام پر تھا لیکن اسے ضبط کرلیا گیا یہ مکان 1997ء میں بنایا گیا تھا ان کا آبائی علاقہ سوپور ہے جہاں ان کا مکان اور دکانیں جلا دیئے گئے تھے۔ انہیں ہراساں کیا گیا ان کو جیلوں اور اذیت خانوں میں ٹارچر کیا گیا۔ اسی وجہ سے اس خاندان نے روز بروز کے چھاپوں اور گرفتاریوں سے بچنے کے لئے سوپور سے سکونت ترک کر کے عمر بھر کی پونجی سے یہ ایک منزلہ مکان بنایا تھا جو حکومت نے ضبط کرلیا۔

اسی طرح کا دوسرے واقعہ 2001ء میں سری نگر کے ڈاؤن ٹاؤن صفا کدل کے علاقے میں کالے قانون کے تحت ایک مکان کو سربمہر کیا گیا۔ یہ غلام محمد ڈار کا مکان تھا۔ ان کو حزب المجاہدین سے وابستہ مجاہدین کو پناہ دینے کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔ عوام کے بھرپور احتجاج پر اس وقت کے وزیراعلیٰ فاروق عبداللہ کو یہ مکان مالکان کو واگزار کرنا پڑا۔ فاروق عبداللہ کو عوامی ردعمل سے بچنے کے لئے اس کارروائی کو پولیس کے کھاتے میں ڈالنا پڑا اور تحقیقات کا حکم دیا جو آج چودہ سال گزرنے پر بھی مکمل نہ ہو سکی۔

جون 2012ء کو ہی پولیس نے سوپور کے واقب علاقہ میں حزب المجاہدین سے تعلق کے الزام میں عبدالرزاق اور ان کے بیٹے عبدالحمید لون سمیت آزادی پسند لوگوں کے باغات اور پندرہ کنال اراضی پر قبضہ کرلیا جبکہ عبدالرزاق کی کار بھی ضبط کرلی۔ اس کے خلاف عمر عبداللہ کی حکومت کے خلاف شدید احتجاج ہوا۔ اس ردعمل کی وجہ سے کشمیر میں عمر عبداللہ کی حکومت نے وقتی طور پر آزادی پسندوں، مجاہدین اور ان کے رشتہ داروں کے مکان باغات اور زمینیں ضبط کرنی ترک کردیں۔ یہ زمینیں پوٹا جیسے کالے قانون کی رُو سے ضبط کی گئیں۔ یہ غیر قانونی سرگرمیوں سے بچاؤ کا ایکٹ ہے۔ اس کے تحت وقت کی حکومت اور فوج کو مخالفین کو جھکنے پر مجبور کرنا تھا۔

2001ء میں پوٹا قانون نافذ ہوا تھا لیکن آج یہ پہلا موقع ہے مقبوضہ کشمیر کی حکومت نے بھارت کی نیشنل انٹیلی جنس ایجنسی (NIC) کے حکم پر حکومت نے ایک مجاہد تنظیم سے وابستہ ایک مجاہد کے اہل خانہ کے نام پر زرخیز زمین کو ضبط کرلیا ہے۔ (NIC) نام نہاد بمبئی حملے کے بعد تشکیل دی گئی تھی۔ اس نے مقبوضہ کشمیر کے علاقہ پہلگام کے غلام نبی خان عرف سیف اللہ خالد اور عامر خان ولد غلام رسول خان کو مطلوبہ افراد کی فہرست میں شامل کیا۔ اس بھارتی خفیہ ایجنسی نے نام نہاد عدالتیں بھی قائم کیں۔

خفیہ ایجنسی کے حکم پر ہی عامر خان کی اہلیہ کے نام پر 9 کنال اراضی مقبوضہ کشمیر کی حکومت نے سرکاری تحویل میں لے لی جبکہ پہلگام میں امرناتھ یاترہ پر بھارتی حکومت کی طرف سے بھارتی شہریوں کو لیز پر زمینیں الاٹ کی جا رہی ہیں۔ یہ اس علاقہ سے مقامی آبادی کو زبردستی بے دخل کرنے کا آغاز ہے۔ عامر خان کو اس علاقہ میں عزت اور احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ عامر خان کے کم سن تیرہ سالہ بیٹے کو بھارتی فورسز نے گرفتار کر کے انٹیروگیشن سینٹر میں تفتیش کے دوران شہید کر دیا تھا لیکن عامر خان نے سرنڈر نہ کیا۔

بھارتی حکومت اور اس کی کٹھ پتلی ریاستی انتظامیہ نے بھائی کے بدلے بھائی اور باپ کے بدلے بیٹے کو گرفتار کیا۔ بچوں اور عزت مآب خواتین کو بھی نہ بخشا گیا لیکن اس سارے دباؤ کے بعد بھی کسی نے سرنڈر نہ کیا تو حکومت نے ایک بار پھر جائیدادیں ضبط کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ فاروق عبداللہ کی حکومت بھارتی قوانین کو کشمیر میں نافذ کر کے دفعہ 370 کی خلاف ورزی کر رہی ہے۔

نریندر مودی ایک انتہا پسند لیڈر

یوں تو پاکستان کی مخالفت میں کانگریس بھی کم نہیں رہی، مسئلہ کشمیر جواہر لعل نہرو نے پیدا کیا۔ مہاراجہ کو قبائلیوں سے ڈرا کر کشمیر کے عارضی الحاق کی دستاویز پر نہرو نے ہی دستخط کروائے تھے۔ 1947ء میں ہی اس وقت کے وزیر داخلہ سردار ولبھ بھائی پٹیل اور وزیر دفاع نے دہلی میں مسلمانوں کا قتل عام کرایا۔ وزیر اعظم پنڈت نہرو نے بے بسی کا ڈرامہ رچایا۔ مسلمانوں پر فساد کے لئے اسلحہ جمع کرنے کا الزام لگایا اور جو اسلحہ برآمد کیا گیا اس پر خود وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کہا تھا کہ اگر مسلمان اس اسلحہ سے لڑنا چاہتے ہیں تو ان کی جنگی حکمت عملی پر تعجب کا اظہار کیا جا سکتا ہے کیونکہ یہ کچن میں استعمال ہونے والے چھری کانٹے تھے۔

کانگریس ہی کے دور میں مراد آباد اڑیسہ، جبل پور اور جمشید پور میں مسلم کش فسادات ہوئے، مسلمانوں کی دکانوں اور گھروں کو لوٹا گیا اور آگ لگائی گئی۔ جمشید پور کے فسادات نے تو کانگریس نواز عبدالغفار خان کو بھی مضطرب کر دیا تھا۔ جب بی جے پی کے کارکنان نے بابری مسجد پر حملہ کیا تھا۔ تب کانگریس کی حکومت تھی۔ نرسیماراؤ اگر چاہتا تو فوج بھیج کر مسجد کا انہدام روک سکتا تھا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ نریندر مودی نے 2002ء میں جب گجرات میں مسلم کش فسادات کرائے تب بھی بھارت میں کانگریس کی حکومت تھی اور اہم ترین بات یہ کہ مسئلہ کشمیر سمیت پاکستان کے خلاف تمام مسائل کانگریس نے پیدا کیے جس میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی ساری منصوبہ بندی کانگریس کے دور میں ہوئی۔

1965ء میں پاک بھارت جنگ بھی کانگریس کے دور میں ہوئی اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو سیکولر جماعت کہتے تھے۔ "حکایت" میں تحریک پاکستان کے دور کے ہزاروں واقعات لکھے گئے دیگر رسائل "اردو ڈائجسٹ"، "سیارہ ڈائجسٹ"، "قومی ڈائجسٹ" اور دیگر اخبارات اس وقت کے ہندو مظالم سے بھرے پڑے ہیں۔ یہ سب کانگریس کے دور کے واقعات ہیں جو اپنے آپ کو سیکولر کہتے تھے۔ مگر بی جے پی کے نریندر مودی نے تو ہندوستان میں مسلم دشمنی سے شہرت پائی ہے۔ ہندو قوم پرستی اور ہندو مذہبی تشخص رکھنے والے نریندر مودی کے حوالے سے اگر بعض لوگوں میں تشویش انگیز خدشات جنم لیں تو یہ غیر فطری بات نہیں ہے۔ نریندر مودی کے شدت پسندانہ رجحانات اور ہندو تعصب خطے میں عدم استحکام اور جنوبی ایشیا میں امن کے لئے شدید خطرات کو جنم دے سکتے ہیں۔

نریندر مودی نے الیکشن جیتنے کے لئے پاکستان مخالف بڑھکیں ماریں۔ انہوں نے کہا تھا کہ بھارت کو مطلوب داؤد ابراہیم کو اسامہ بن لادن کو اٹھانے کی طرز کا ایکشن کر کے بھارت لے آؤں گا۔ شیوسینا، بجرنگ دل اور راشٹریہ سیوک سنگھ جیسی انتہا پسند تنظیمیں اتحادی جماعتوں کی حیثیت سے بھارت میں مسلمانوں کی تطہیر کے مطالبات نہیں کریں گی؟ اس نے جو کچھ گجرات میں کیا تھا۔ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس کی حکومت میں وہ سرحد پار "دہشت گردی" کے نام پر اپنی خارجہ پالیسی مرتب کرے گا۔ وہ کسی بھی وقت آزاد کشمیر پر محدود حملے شروع کروا سکتا ہے۔ گجرات کے متعصب اور خونخوار مودی نے للکار کہا تھا۔ "ہم نے چوڑیاں نہیں پہن رکھی ہیں"۔ اس کے بعد گجرات میں ایسے خونی فسادات پھوٹ پڑے جس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

گجرات کی حکومت کے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق 790 مسلمانوں کو ذبح کر کے گردن الگ کر دی گئی تھی، 2500 کو شدید زخمی کیا گیا۔ ایک لاکھ مسلمان اپنے بھرے گھر چھوڑ کے جانے پر مجبور ہوئے۔ بی جے پی کے جتھوں کو کھلی چھوٹ دے دی گئی تھی کہ وہ مسلمانوں کے گھروں، دکانوں اور جائیداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں۔ گجرات چیمبر آف کامرس کے مطابق گجرات کے مسلمانوں کے 110 ارب روپے کے کاروبار کو ملبے کا ڈھیر بنا دیا گیا تھا۔ اس دوران پولیس مسلمانوں کو تحفظ دینے کے بجائے بلوائیوں کی مدد کرتی رہی۔ بہار میں بی جے پی کے ایک امیدوار راج سنگھ نے جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا۔ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ بھارت میں جو بھی دہشت گرد گرفتار ہوتا ہے وہ مسلمان ہی ہوتا ہے۔ اس نے اپنی تقریر میں کہا۔ جو مودی کو ووٹ نہیں دے گا اس کو پاکستان بھیج دیا جائے گا۔ اس نے کہا کہ پاکستان نہیں چاہتا کہ مودی اقتدار میں آئے۔ عالمی برادری بھی مودی کو ہندوستان میں مسلمانوں کے قاتل کی حیثیت سے جانتی ہے۔

543 رکنی بھارتی لوک سبھا میں 34 فیصد ممبران سنگین جرائم میں ملوث ہیں۔ بی جے پی کے کل ممبران کی ایک تہائی تعداد فوجداری مقدمات میں ملوث ہے۔ اس طرح کابینہ میں بھی اکثریت جرائم پیشہ لوگ ہیں۔ اس دفعہ لوک سبھا میں کوئی اپوزیشن جماعت نہیں ہے۔ بھارتی آئین کے مطابق اپوزیشن جماعت کے لئے دس فیصد نشستیں جیتنی ضروری ہیں اور کانگریس صرف 42 سیٹیں جیت سکی ہے۔ لوک سبھا کے 34 فیصد ارکان پر قتل، اقدام قتل، فرقہ وارانہ فسادات اور نسلی فسادات میں ملوث ہونے کے مقدمات ہیں۔ صوبہ اتر پردیش سے بی جے پی کے 80 ممبر منتخب ہوئے، ان میں سے 28 ارکان مقدمات میں ملوث ہیں 22 پر اغوا، قتل اور اقدام قتل جیسے سنگین جرائم ہیں۔

بی جے پی کے 282 نو منتخب ارکان میں سے ایک بھی مسلمان نہیں ہے۔ کیا ایسی متعصب اور بدکردار لوگوں سے بھری پارلیمنٹ سے امن کی توقع رکھی جا سکتی ہے؟ بڑے افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ ایسے کردار کا وزیراعظم جس کی اٹھان ہی پاکستان کی مخالفت پر ہوئی ہے ہمارے امن کی آشا رکھنے والے میڈیا والے بھی اپنے بھارتی آقاؤں اور مغربی آقاؤں سے مل کر پاکستانی افواج اور آئی ایس آئی کو بدنام کر کے خوشی محسوس کر رہے ہیں۔

بھارتی میڈیا نے اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ انہوں نے پاکستان کو دہشت گردی کا اڈا ثابت کرنے میں پورا زور لگا رکھا ہے۔ کرنل مہتا، کرنل آر ایس سنگھ، جی ڈی بخشی، جنرل اجیت سنگھ اور راجیو ڈوگرہ نے ہندوستانی ٹی وی چینل پر حامد میر اور جیو چینل کے خلاف کارروائی کو براہ راست افواج پاکستان اور آئی ایس آئی سے جوڑ

دیا۔ انہوں نے حوالہ دیا کہ جیو نے خود کہا ہے کہ یہ ساری کارروائی جنرل ظہیر السلام نے کروائی ہے۔ بھارتی میڈیا نے نواز شریف کو امن کا داعی اور پاک فوج کو امن کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ قرار دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ جنگ اور جیو گروپ اس لئے ان کا نشانہ بنے ہیں کیوں کہ وہ امن کی آشا کی بات کرتے ہیں اور افواج پاکستان کے ظلم اور زیادتیوں کی بات کرتے ہیں۔

کیا پاکستانی میڈیا بھارتی کردار کو واضح کرنے کے لئے مشرقی پاکستان کی علیحدگی میں بھارت کے کردار پر بات نہیں کر سکتا؟

بلوچستان اور کراچی کے حالات میں بھارتی مداخلت بھارتی اسلحہ اور سامان سیاسی جماعتوں کے دفاتر سے پکڑا جاتا ہے اس کو ہمارا میڈیا بھارتی اسلحہ کی بجائے غیر ملکی اسلحہ کہتے ہیں۔ افغانستان میں بھارتی قونصلیٹ کے کردار کو ہمارا میڈیا کیوں اجاگر نہیں کرتا؟ ہم ماضی کو دفن کرنے اور مودی کے کردار کو زندہ کرنے اور احکامات دینے میں لگے ہوئے ہیں۔ بھارتی میڈیا جمہوریت کے مقابلے میں افواج پاکستان کو من مانی کرنے والی قوت قرار دینے میں پورا زور لگا رہا ہے جبکہ ہندوستان نے آج کشمیر کا خصوصی درجہ ختم کرنے پر کام شروع کر رکھا ہے۔ ہم لوگ اس پر حیران ہیں کہ وزیراعظم نواز شریف ہندوستان سے اتنے دبے ہوئے کیوں ہیں۔ ہمارا یہ مقصد نہیں کہ وزیراعظم نواز شریف ہندوستان سے جنگ کی باتیں کریں مگر ایک ایٹمی ملک کا وزیراعظم بھارت جا کر فقط چارج شیٹ حاصل کرتا ہے جس کے تین نکات درج ذیل تھے:

(1) کراس بارڈر دہشت گردی روکیں اور جس طرح اندر کمال گجرال سے تعاون کیا تھا اسی طرح کا تعاون کریں۔ کشمیری مجاہدین کی حمایت سے باز رہیں۔

(2) بمبئی حملے میں ملوث افراد کی پیش رفت سے ہم مطمئن نہیں ہیں۔ ان منصوبہ سازوں کے خلاف کارروائی کی یقین دہانی کرائی جائے۔

(3) ان کے نامزد لوگوں کی وائس سمپل یعنی ان کی آواز کے نمونے مہیا کئے جائیں۔

کاش میاں صاحب ان کو بھارت کی اعلیٰ عدلیہ میں ان کی سیکرٹ سروس کے ایڈیشنل سیکرٹری کا حلف نامہ دکھاتے جس میں اس نے اپنی تحقیقی رپورٹ میں خود سیکرٹ سروس کو گوا اور بمبئی کے واقعات کا ذمہ دار ٹھہرایا تھا۔ کاش ہندوستان سے سمجھوتہ ایکسپریس کو تباہ کرنے والے کرنل پروہت جس نے Cr4 مقبوضہ کشمیر سے چوری کر کے ٹرین کو تباہ کیا تھا جس میں 50 پاکستانی مارے گئے تھے۔ اس پر بات کی ہوتی یا کشمیر کے لاکھوں مسلمانوں کو بے گناہ شہید کرنے پر بات کی ہوتی۔ کاش کشمیر قیادت سے چند منٹ ہی بات کر لی ہوتی جو صرف ان کی ملاقات کے لئے کشمیر سے پاکستانی ہائی کمیشن میں بیٹھے انتظار کر رہے تھے۔ نواز شریف صاحب نے نہ تو کشمیر پر بات کی اور نہ ہی بلوچستان میں بھارتی مداخلت پر بات کی۔ ان حقائق کی روشنی میں کوئی غلط فہمی میں نہ رہے کہ ہندوستان میں نریندر مودی جیسے مسلم دشمن کی حکومت کے دور میں دوستی ہوگی یا امن کی آشا چلے گی یا امن قائم رہے گا۔

حکومت پاکستان کو فوری طور پر ہنگامی بنیادوں پر کام کر کے آزاد کشمیر پر ممکنہ حملے یا کسی بڑی کارروائی کو روکنے کی منصوبہ بندی کرنی چاہئے۔

مجاہدین کشمیر جن کو نریندر مودی پاکستان کی ریزرو فورس قرار دیتا ہے، ان کی امداد کرنی چاہئے اور ان کے ہاتھ پیر کھول دینے چاہئیں تا کہ وہ ثابت کر دیں کہ وہ واقعی پاکستان کی ریزرو فورس ہیں۔

❁❁❁

دھوپ کے پگھلنے تک

اُس سرپھرے کی کہانی جو اندھیر نگری میں اُجالا کرنے نکلا تھا۔

قسط: 8 ☆ امجد جاوید

ناور

والوں سے ملنے کے بعد فہد اپنی کار میں سلمیٰ کے گھر پہنچا اور اسے اپنے ساتھ لے کر سکول کے سامنے جا پہنچا۔ جہاں کبھی وہ پڑھا تھا۔ ایک لمحے کے لئے اس کے دل میں ٹیس اٹھی۔ ماضی اسے اپنی لپیٹ میں لے لینا چاہتا تھا۔ مگر فوراً ہی اس نے خود پر قابو پالیا۔

اس نے دیکھا سکول کی عمارت پر زنگ آلود تالا پڑا ہوا تھا۔ فہد کی گاڑی وہاں آ کر رکی اور اس میں سے فہد اور سلمیٰ باہر آ گئے۔ انہی لمحات میں اطراف میں سے سراج اور چھاکا نکلے۔ سراج کے ہاتھ میں گن تھی۔ اس کے ساتھ کافی سارے اسلحہ بردار لوگ تھے۔ سلمیٰ بہت جذباتی ہو رہی تھی۔ اس کے گالوں پر آنسو رواں تھے۔ فہد نے کار میں سے ہتھوڑا نکالا۔ وہ ہاتھ میں ہتھوڑا لئے آگے بڑھا اور تالے پر ضرب لگانے لگا۔ تالا ٹوٹ گیا تو فہد نے سلمیٰ کو ساتھ لیا اور سکول میں داخل ہو گیا۔ چھاکا اور سراج ان کے ساتھ تھے۔ اندر جا کر انہوں نے گھنٹی لی اور سلمیٰ کے ہاتھ میں دے دی۔ سلمیٰ اس گھنٹی کو اپنے ہاتھ میں لئے چند لمحے دیکھتی رہی۔ پھر بڑے جذباتی انداز میں گھنٹی بجانے لگی۔ ایک ضرب، دوسری ضرب تیسری ضرب۔

گھنٹی کی آواز پورے قسمت نگر میں پھیل گئی۔ لوگ چونک اٹھے۔ سکول بیل بج رہی تھی۔ گھر، بازار، گلی، کھیت، راستے سب جگہ آواز سنی جا رہی تھی۔ لوگ حیران ہو کر سن رہے تھے۔ ماسٹر دین محمد وہ آواز دھیمی مسکراہٹ سے یوں سن رہا تھا جیسے کوئی نغمہ ہو۔ چوراہے میں بھی سکول کی گھنٹی سنائی دے رہی تھی۔ حنیف دوکاندار اور چاچا سوہنا بھی سن رہے تھے۔

حنیف دوکاندار نے حیران کن انداز میں پوچھا۔

"یہ ہمارے گاؤں کے سکول کی گھنٹی بج رہی ہے نا؟"۔

"حقیقت تو یہی ہے حنیف لگتا ہے قسمت نگر کی بدلتی ہوئی قسمت کو اب کوئی نہیں روک سکتا۔" چاچے سوہنے نے خوشگوار انداز میں اپنی رائے دی۔

"او چاچا کوئی خدا کا خوف کرو۔ اتنے برس ہو گئے چوہدریوں نے یہ سکول نہیں کھلنے دیا۔ اب گاؤں میں ایک نئی مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔ یہ گھنٹی تو کسی نئے فساد کی آواز ہے"۔ حنیف دوکاندار نے خوف زدہ ہوتے ہوئے کہا تو چاچا سوہنا بولا۔

"نہیں، بالکل نہیں، یہ شر کی نہیں، خیر کی آواز ہے۔ تعلیم ہر بچے کا بنیادی حق ہے۔ چوہدری کون ہوتے ہیں، ان معصوم بچوں کو ان کے حق سے محروم کرنے والے"۔

"یہ بھی فہد کی نئی شرارت ہے۔ دیکھنا اب خون خرابہ ہوگا۔ یہ بندہ کسی کو چین سے نہیں بیٹھنے نہیں دے رہا۔ جب سے یہ گاؤں میں آیا ہے۔ کوئی نہ کوئی فساد ہی پڑا رہتا ہے"۔ حنیف دوکاندار نے کہا۔

"وہ تم جیسے بے ضمیروں کو جھنجھوڑ رہا ہے کہ نیند سے اٹھو اور اپنا حق پہچانو۔ وہ ظالموں کو للکار رہا ہے مگر ظالم بجائے اس کا سامنا کرنے کے کمزوروں پر ہاتھ اٹھا رہے ہیں اور کمزور خواہ مخواہ خوف سے دبے جا رہے ہیں۔ یہ تبدیلی ہے۔ اب وقت نہ بدلا تو کبھی نہیں بدلے گا"۔ چاچے سوہنے نے اسے حقارت سے کہا

"یہ تیرے جیسے چند بے عقل اُسے شہہ دے رہے ہیں۔ اس وقت تمہارا پتہ بھی نہیں چلنا جب چوہدری اپنی آئی پر آگئے"۔ حنیف دوکاندار نے ڈرایا تو چاچا سوہنا بولا۔

"تو آ جائیں نا اپنی آئی پر، کس نے روکا ہے، فہد کا سامنا کرتے ہوئے کیوں ڈرتے ہیں۔ سکول کھل گیا ہے۔ اب اس میں بچے پڑھیں گے۔ اب چوہدری جو مرضی کر لیں یہ بند نہیں ہوگا"۔

"دیکھو کیا ہوتا ہے، سکول بند ہوتا ہے یا اس کے کھولنے والے۔" حنیف دوکاندار کہتے ہوئے خاموش

ہو گیا اور پلٹ کر اپنی دوکان کی طرف چلا گیا۔
سکول کی گھنٹی بج رہی تھی اور اس وقت تک بجتی رہی جب تک سارے قسمت نگر نے نہ سن لیا۔
فہد اور ماسٹر کھانا کھا چکے تو سلمٰی چائے کا مگ لے کر آ گئی اور پھر ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ تبھی ماسٹر دین محمد نے کہا
''سکول کا تالا تو توڑ دیا ہے تم لوگوں نے، ایک خواب تھا وہ پورا ہو گیا، لیکن یہ چوہدری اسے برداشت نہیں کر پائیں گے۔ وہ ضرور.....؟''
''سکول کا تالا توڑنے سے پہلے میں نے سب سوچ لیا تھا اور اس کا بندوبست بھی کر لیا تھا۔ آپ کوئی فکر نہ کریں میں نے محکمہ تعلیم کے آفیسرز سے بھی بات کر لی ہے۔ بلکہ آج کل میں آپ کے پنشن کیس کا فیصلہ بھی ہو جائے گا۔ آپ بس دیکھیں، ان چوہدریوں کی بے بسی۔ اب آپ بالکل فکر نہ کریں''۔ فہد نے انہیں حوصلہ دیتے ہوئے کہا تو ماسٹر دین محمد بولا
''فہد پتر! اب تشویش والی بات یہ ہے اگر صفیہ مکر گئی تو اب تک جو تمہاری کوششیں ہیں۔ وہ سب رائیگاں جائیں گی۔ دشمنی بھی بڑھ جائے گی۔ یہ تم لوگوں کو پہلے سوچنا چاہئے تھا نا کہ اس کا اثر و رسوخ بہت زیادہ ہے۔''
''بات اثر و رسوخ کی نہیں اور نہ ہی دشمنی کی ہے۔ بات یہ ہے کہ اگر صفیہ دباؤ میں آ کر ان کی بات مان لیتی ہے تو پھر چوہدری کے جبر کا جال توڑنا مشکل ہو جائے گا لیکن یہ ناممکن تو پھر بھی نہیں ہے''۔ فہد نے سنجیدگی سے کہا
''میں تمہارے حوصلے کی داد دیتا ہوں فہد! اس قدر مشکل حالات میں بھی تم حوصلہ نہیں ہارے ہو۔ جبکہ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے بیٹا کہ بندہ اپنی لڑائی تو لڑ سکتا ہے۔ کسی کی لڑائی کیا لڑے۔ اب صفیہ جیسی کمزور عورت ان کا دباؤ کب تک برداشت کرے گی''۔ ماسٹر دین محمد نے کہا تو سلمٰی بولی۔
''ہم اس کا سہارا ہیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ جتنا مرضی وہ اس پر دباؤ ڈالیں۔ صفیہ نہیں مانے گی۔ وہ ان کے لالچ میں بھی نہیں آئے گی''۔
''کسی کا کیا اعتبار! فرض کیا وہ لالچ یا دباؤ میں آ جاتی ہے تو ہم اس کا کیا کر سکتے ہیں؟ جبکہ چوہدری تو ہر ممکن کوشش کریں گے نا معاملہ اس کے بیٹے کا ہے۔ اب معاملہ صفیہ پر ہے۔ اس کا کوئی بھی فیصلہ حالات کا رخ موڑ سکتا ہے۔'' ماسٹر دین محمد نے کہا تو فہد بولا
''آپ ٹھیک کہتے ہیں استاد جی، میں مان لیتا ہوں کہ وہ لالچ یا دباؤ میں آ کر اپنا فیصلہ تبدیل کرے گی۔ تو پھر کیا ہوا۔ چوہدری کے ساتھ ہمارے حالات تو ویسے ہی رہیں گے۔ اور اگر دشمنی بڑھتی ہے تو پھر بڑھ جائے''۔
''ابا جی! آپ گھبرائیں مت۔ میں ابھی اس سے ملتی ہوں۔ اسے حوصلہ دوں گی۔ جس طرح کا سہارا چاہے گی میں اسے دوں گی''۔ سلمٰی نے کہا تو ماسٹر دین محمد پوچھا۔
''کیا سہارا دو گی۔ کیا دے سکتی ہو تم۔ چوہدری تو اسے روپے پیسے اور زمین کا لالچ دے رہے ہیں۔ تم کیا دے سکتی ہو۔ کیا ہے تمہارے پاس؟''
''کیا نہیں ہے سلمٰی کے پاس استاد جی۔ گھر، روپیہ پیسہ، زمین سب کچھ ہے سلمٰی کے پاس''۔
اس کے یوں کہنے پر ماسٹر دین محمد چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔
''میں تو اپنی رائے دے رہا تھا۔ باقی تم لوگ جانو کہ کیا فیصلہ کرتے ہو''۔
''آپ پریشان نہ ہوں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میری ساری کوششوں کا محور فقط صفیہ نہیں ہے اور بہت کچھ ہے''۔ فہد نے کہا تو ماسٹر دین محمد بولا۔
''تم جو بہتر سمجھتے ہو کرو۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں''۔
''آپ ناراض ہیں؟'' فہد نے اچانک پوچھ تو

ماسٹر دین محمد نے جلدی سے کہا۔

''او نہیں پتر! میں تم سے کیوں ناراض ہونے لگا۔ میں آئندہ آنے والے حالات کی سختی سے آگاہ کر رہا تھا''۔

اس پر فہد نے اپنے استاد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر حوصلہ مند لہجے میں کہا

''آپ پریشان نہ ہوں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اچھا، اب میں چلتا ہوں''۔

ماسٹر دین محمد نے اپنا سر ہلایا تو فہد اٹھ کر چل دیا۔ جہاں ملک نعیم اس کے انتظار میں تھا۔

فہد اور ملک نعیم دونوں کمرے میں خوشگوار موڈ میں بہت دیر تک علاقے اور اس کی صورت حال پر باتیں کرتے رہے۔ تبھی ملک نعیم نے کہا۔۔

''آپ سے اتنی ڈھیر ساری باتیں کر کے مجھے بڑا حوصلہ ملا ہے۔ خیر! باتیں اور ملاقاتیں تو اب ہوتی رہیں گی''۔

''کیوں نہیں ملک صاحب! آپ جیسا سیاسی بندہ، سیاست کے بغیر بھلا کہاں رہ سکتا ہے اور پھر جدوجہد تو اس جاگیردار کے خلاف ہے جس نے جبر سے علاقے پر حکمرانی کر رکھی ہے۔ میرا مقصد تو اس جبر کے خلاف لڑنا ہے''۔ فہد نے گہری سنجیدگی سے کہا تو ملک نعیم صاف انداز میں بولا۔

''سیاست یا الیکشن جیتنا ہی میرا مقصد نہیں ہے، مجھ سے یہ ظلم نہیں دیکھا جاتا۔ میں نے پہلے بھی اپنی بساط مطابق کوشش کی تھی، اب بھی کر رہا ہوں''۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ میں آپ کے ساتھ ہوں''۔ فہد نے زوردار لہجے میں کہا تو ملک نعیم حتمی لہجے میں بولا۔۔

''تو پھر یہ طے ہوا کہ نذیر کا خون رائیگاں نہیں جائے گا۔ ہم اس مظلوم عورت کی ہر ممکن مدد کریں گے۔ اور اس کے لئے چاہے جو بھی کرنا پڑے۔ ظاہر ہے اسے سیاسی ایشو بنائیں گے تو ہی اس مظلوم عورت کی فریاد سنی جائے گی''۔

''اسے قانونی مدد بھی تو فراہم کرنی ہے''۔ فہد نے یاد دلایا تو ملک نعیم نے کہا۔۔

''میں ہوں نا۔ اس میں جو خرچ وغیرہ ہوگا، وہ میں کروں گا۔ آپ کو اس معاملے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ بہترین وکیلوں کی مدد لیں گے''۔

''چلیں یہ تو طے ہو گیا۔ اس کے علاوہ جو آپ کہیں میں حاضر ہوں''۔ فہد نے خوش ہوتے ہوئے کہا

''میں تو یہاں تک سوچ رہا ہوں کہ یہاں لوگوں کو روزگار کے زیادہ سے زیادہ مواقع دوں تاکہ وہ ساری زندگی کی کمین نہ رہیں اپنے پاؤں پر خود کھڑے ہو جائیں''۔ ملک نعیم نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

''میں بھی اس نہج پر سوچ رہا ہوں دیکھیں، جاگیر دار ہو یا سرمایہ دار دونوں کو اپنے منافع سے غرض ہے۔ لیکن مزدور کو وہ فائدہ کہاں ہے، روزگار کے مواقع کون پیدا کرتا ہے''۔ فہد نے بھی اپنا خیال بتایا تو ملک نعیم بولا۔ ''میں سمجھ رہا ہوں آپ کی بات فہد آپ ملے ہو تو مجھے نئی توانائی مل گئی ہے۔ اس علاقے کا سیاسی سیٹ اپ بھی نئے سرے سے دیکھیں گے۔ ظاہر ہے، کچھ وقت بعد ہم نے الیکشن میں تو جانا ہی ہے۔ اس وقت تک ہمیں سیاسی طور پر مضبوط ہونا ہے''۔

''عوام اب باشعور ہے ملک صاحب! عوامی فائدے کی بات تو بہت ہوتی ہے لیکن عملی طور پر کچھ نہیں ہوتا عوام اب تنگ آ گئے ہیں ان خالی خولی وعدوں سے اب وقت آ گیا ہے کہ ان کے لئے کچھ کرنا ہوگا ورنہ آپ اور ہم انقلاب کی چاپ تو سن رہے ہیں''۔ فہد نے اسے آنے والے وقت کا احساس دلایا۔

''بالکل! تب پتہ نہیں۔ اس انقلاب کے بعد جو

سیٹ اپ بنے گا۔اس میں ہم کہاں ہوں گے۔یہ شاید ہم ابھی سوچ نہیں رہے ہیں۔خیر انی الحال مجھے اجازت دیں، گاؤں تک پہنچتے کافی وقت ہو جائے گا۔اب ملاقات تو ہوتی رہے گی"۔ملک نعیم نے اجازت چاہی تو فہد خوش دلی سے بولا۔

"کیوں نہیں ،ضرور ہوگی ملاقات"۔

یہ کہتے ہوئے وہ کھڑا ہو گیا۔دونوں نے ہاتھ ملایا، پھر ملک نعیم دروازے کی جانب بڑھ گیا۔جاتے ہوئے اس کے چہرے پر خاصی خوشی تھی۔

☆......☆......☆

حویلی کے ڈرائنگ روم میں بشریٰ بیگم گہری سوچوں میں گم بیٹھی ہوئی تھی۔ کچھ دیر پہلے رانی اسے جائے دے گئی تھی جواب تک ویسے پڑی ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ رات کی باتیں اسے بھول نہیں رہی تھیں۔ پہلی بار اس نے چوہدری جلال کو بدلا ہوا محسوس کیا تھا۔اس وقت بھی وہ لان میں اکیلا بیٹھا ہوا تھا۔

رات چوہدری جلال خواب گاہ میں تھا۔بشریٰ بیگم نے اس کی محویت دیکھ کر پوچھا۔

"کیا سوچ رہے ہیں آپ؟"

"سوچنا کیا بیگم! دنیا داری کے مسائل تھوڑے ہیں۔ایک کو حل کرو تو دوسرا سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔ اردگرد پھیلے ہوئے تھوڑے جھنجٹ ہیں۔ان کے لئے سوچنا تو پڑتا ہے۔" چوہدری جلال نے عجیب سے لہجے میں کہا تو بشریٰ بیگم نے اس کے لہجے پر غور کرتے ہوئے بولی۔

"آپ پہلے کبھی اتنے فکر مند دکھائی نہیں دیے، آپ مجھے ٹال رہے ہیں؟"

"بیگم! تمہیں معلوم ہی ہے کہ معاملہ کیا چل رہا ہے۔میں نے کبیر کو بہت سمجھایا کہ حالات اب پہلے جیسے نہیں رہے ہیں۔مگر وہ مانتا ہی نہیں۔یہ وقت بھی آنا تھا کہ ایک معمولی عورت ہمارے سامنے آ کھڑی ہو گی۔اور وہ ہماری مجبوری بن جائے گی"۔ چوہدری جلال نے کہا۔

"میں نے وکیل کی ساری باتیں سن لی تھیں۔ چوہدری صاحب!اس سے پہلے کہ حالات مزید ہمارے ہاتھ سے نکل جائیں۔ ہمیں انہیں سنبھالنا ہوگا۔صفیہ اگر مان جاتی ہے تو پھر معاملہ ختم ہو سکتا ہے نا؟" بشریٰ بیگم بولی

"مشکل تو یہی ہے۔ وہ ہمارے مخالفین کے ہاتھوں میں ہے۔معاملہ اگر اپنے ہی علاقے میں رہتا تو کوئی بات نہیں تھی لیکن مخالفین اسے بہت دور تک لے جانا چاہتے ہیں۔اس کے اثرات ٹھیک نہیں ہوں گے"۔ چوہدری جلال نے سوچتے ہوئے لہجے میں کہا

"کیا فہد اس قدر مضبوط ہو گیا ہے کہ آپ اسے نہیں روک پا رہے ہیں؟" اس نے تشویش سے پوچھا تو چوہدری جلال نے نخوت سے کہا۔

"فہد اُسے تو میں ابھی ایک چیونٹی کی طرح مسل دوں لیکن اس وقت وہ ایسی عورت کے پیچھے کھڑا ہوا ہے۔ جسے وہ مظلوم بنانے پر تلا ہوا ہے۔اگر اس وقت اسے کچھ کہتے ہیں تو وہ بھی مظلوم بن جائے گا"۔

"لے دے کر بات صفیہ پر ہی آن ٹکی ہے نا چوہدری صاحب! اگر آپ اجازت دیں، تو میں کوشش کر کے دیکھتی ہوں۔ میں چلی جاتی ہوں اس کے پاس"۔ بشریٰ بیگم نے مان سے کہا تو چوہدری جلال نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں، ابھی ہم پر ایسا وقت نہیں آیا۔لوگ کیا کہیں گے۔ کیا میں اتنا کمزور ہو گیا ہوں کہ اپنے معاملات کے لئے تمہیں کسی کے پاس بھیجوں۔نہیں، ایسا کبھی نہیں ہوگا"۔

"چوہدری صاحب! یہ معاملہ میرے بیٹے کا بھی ہے۔ میں اگر آپ کی بیوی ہوں تو ایک بیٹے کی ماں بھی

ہوں کیا میں اپنے بیٹے کے لئے اتنا بھی حق نہیں رکھتی ہوں کہ اس کے لئے کچھ کر سکوں"۔ وہ جذباتی انداز میں بولی تو چوہدری جلال نے کہا۔

"میں ہوں نا۔ اور اس معاملے کو دیکھ رہا ہوں۔ تمہیں فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا سب کچھ"۔

"نہیں چوہدری صاحب! مجھے اپنے بیٹے کے لئے ایک کوشش کر لینے دیں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ نے بھی کوششیں کی ہیں لیکن وہ نہیں مانی میں ایک بار......" بشریٰ بیگم نے کہنا چاہا تو چوہدری جلال نے سختی سے کہا۔

"بیگم! تم مجھے مجبور کر رہی ہو۔ مجھے یہ احساس دلا رہی ہو کہ میں کچھ نہیں کر پاؤں گا۔ میں کوشش کر رہا ہوں نا"۔

"مجھے یقین ہے کہ وہ میری بات مان جائے گی"۔ بشریٰ بیگم نے بحث کرتے ہوئے کہا تو چوہدری جلال نے چڑتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ چاہے یقین بھی ہے لیکن میں نے جب کہہ دیا ہے تو بس کہہ دیا اب تم سو جاؤ"۔ چوہدری یہ کہہ کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ بشریٰ بیگم غم زدہ سی کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔ وہ تب سے سوچ رہی تھی۔ پھر اسے بات کرنے کا موقعہ ہی نہ ملا تھا۔ چوہدری جلال باہر لان میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے رانی کو بلایا اور اسے باہر لان میں چائے لانے کا کہہ کر چوہدری جلال کے پاس جانے کے لئے اٹھ گئی۔

چوہدری جلال اور بشریٰ بیگم لان میں تھے اور رانی انہیں چائے سرو کر رہی تھی۔ بشریٰ بیگم نے ادھر ادھر کی باتوں میں چوہدری جلال کا موڈ بہتر کرنے کی کوشش کی تھی۔ ایسے میں چوہدری کبیر کی گاڑی پورچ میں آ کر رکی۔ وہ گاڑی میں سے نکلا اور تیزی سے ان کی جانب آ گیا۔ اس کے چہرے پر انتہائی غصے کے آثار تھے۔ بشریٰ بیگم نے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"آؤ کبیر، چائے پیو گے؟"

چوہدری کبیر نے ماں کی بات سن کر غصے میں کہا

"بابا! پہلے تو فہد ہی یہاں کے لوگوں کو ہمارے خلاف بھڑکاتا پھر رہا تھا۔ لیکن اب ماسٹر دین محمد کی بیٹی سلمیٰ اور صفیہ دونوں مل کر واضح طور پر ہمارے خلاف اعلان جنگ کر رہی ہیں"۔

اس کے یوں کہنے پر چوہدری جلال اور بشریٰ بیگم نے چونک کر اسے دیکھا۔ چوہدری جلال چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔

"ہوا کیا کبیر بیٹا۔ کچھ بتاؤ گے بھی؟"

"اتنے برس سے جو سکول ہم نے بند کروا دیا ہوا تھا۔ وہ آج سلمیٰ اور فہد نے جا کر کھول دیا ہے اور انہوں نے اعلان کیا کہ اب یہ سکول روزانہ کھلے گا۔ بولیں اب کیا کرنا چاہیے؟"

یہ خبر چوہدری جلال کے لئے کسی تازیانے سے کم نہیں تھی، یہ اس کی انا کے لئے بہت بڑا جھٹکا تھا۔ وہ خاموش ہی تھا کہ بشریٰ بیگم نے کہا

"مگر اس میں اتنا غصے میں آنے کی کیا ضرورت ہے۔ تیرے بابا دیکھ لیتے ہیں۔ تم ذرا صبر سے کام لو"۔

"نہیں بیگم! یہ صبر کرنے والا کام نہیں ہے، سکول کی گھنٹی، ہماری شکست کی صدا ہے۔ یہ برداشت نہیں ہوگی"۔ چوہدری جلال نے دبے دبے غصے میں کہا تو چوہدری کبیر بولا۔

"اتنے برس سے جو ہمارا رعب و دبدبہ یہاں کے لوگوں پر طاری ہے، وہ انہوں نے چیلنج کر دیا ہے۔ کب تک انہیں نظر انداز کرتے رہے گے"۔

"سکول چلائے گا کون، ہماری مرضی کے بغیر یہاں عملہ نہیں آ سکتا۔ پہلے کیا یہاں عملہ آیا ہے سب اپنے گھروں میں بیٹھے تنخواہیں لے رہے ہیں۔ میرے

پتر جہاں تک چیلنج کرنے کی بات ہے، اس کی انہیں سزا بھگتنا پڑے گی"۔

"لیکن بابا، انہیں روکنا تو ہوگا؟" چوہدری کبیر نے غصے میں کہا۔ پھر لمحہ بھر خاموشی کے بعد بولا۔ "بابا آپ وقت حالات اور سیاست کے قیدی بن کر رہ گئے ہیں۔ میں آپ کو فقط یہ بتانے آیا ہوں، میں انہیں روکوں گا۔ ابھی اور اسی وقت......"

"تم کچھ بھی نہیں کرو گے اور تمہیں کوئی ضرورت نہیں اس بارے میں سوچو بھی"۔ بشریٰ بیگم نے تیزی سے کہا تو چوہدری کبیر نے سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا

"دن بدن ان کا حوصلہ بڑھتا جا رہا ہے۔ آپ کی مصلحت حالات خراب کر رہی ہے، ایک دن سب کچھ ہاتھ سے نکل جائے گا۔ میں یہ تماشہ نہیں دیکھ سکتا۔"

"تم صرف تماشہ دیکھو، کہا نا تمہیں کچھ نہیں کرنا"۔ بشریٰ بیگم نے درشتی سے کہا تو چوہدری کبیر نے حیرت سے اپنی ماں کو دیکھا اور اٹھ کر وہاں سے چل دیا۔ دونوں نے اس کی طرف دیکھا اور خاموش رہے۔ رانی نے کچھ برتن اٹھائے اور وہاں سے چل دی۔

☆......☆......☆

شام ڈھل کر رات میں بدل چکی تھی۔ صفیہ اپنے گھر کے اکلوتے کمرے میں زمین پر بیٹھی رو رہی تھی۔ اس کا دھیان نہ جانے کہاں تھا۔ اس کے قریب اس کے بچے چارپائی پر پڑے سو رہے تھے۔ وہ شام ہی سے رو رہی تھی۔ ایسا دکھ اس کے اندر سرائیت کر گیا تھا کہ آنسو خشک ہی نہیں ہو رہے تھے۔ جیسے جیسے وہ سوچتی، اس کا دکھ مزید بڑھ جاتا۔ جیسے اس کے اندر ساون برستے برستے رک ہی نہ رہا ہو، انتقام کی آگ ہی اتنی زیادہ تھی۔

ڈھلتی ہوئی شام کے وقت صفیہ چارپائی پر بیٹھی تھی۔ وہ سوئی سے کوئی کپڑا سی رہی تھی۔ باہر سے بابا نعمت علی آیا تو وہ اسے دیکھ کر اٹھ گئی۔ بابا خاموشی سے آ کر بیٹھ گیا۔ تبھی صفیہ نے دھیرے سے پوچھا۔

"خیر تو ہے بابا! سارا دن کہاں تھے۔ پلٹ کر گھر ہی نہیں آئے؟ کچھ کھایا پیا بھی نہیں ہے صبح سے"۔

"کھانا پینا کیا ہے بیٹی! جب ہر طرف خوف کا اندھیرا چھا جائے تو پھر کھانے پینے کا خیال کہاں رہتا ہے۔ بھوک پیاس تو جیسے اُڑ گئی ہے۔ کچھ سوچ سمجھ ہی نہیں آتی۔ کیا کروں اور کیا نہ کروں؟" بابا نعمت علی نے بے بسی سے کہا تو صفیہ نے پوچھا۔

"کیا کرنا چاہتا ہے تُو بابا؟"

"سو دفعہ تمہیں سمجھایا ہے بیٹی۔ ہم غریب لوگ چوہدریوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے، اب تو ہم یہاں سے کہیں اور بھی نہیں جا سکتے کہ چلو اپنی جان بچا کر کسی طرف نکل جائیں"۔ بابا نعمت علی روہانسا ہوتے ہوئے بولا تو صفیہ نے حیرت سے پوچھا۔

"ایسی کیا بات ہو گئی ہے بابا۔ تُو ایسے کیوں سوچ رہا ہے۔"

"میں تو کچھ بھی نہیں سوچ رہا۔ میری اب سوچ کہاں رہی ہے۔ مجھے تو حکم کا پابند کر دیا گیا ہے"۔ بابا نعمت علی نے صاف انداز میں کہہ دیا

"کیسا حکم! ضرور انہوں نے تمہیں ڈرایا دھمکایا ہو گا۔ پر تُو انہیں بتا دے میں مر تو سکتی ہوں لیکن میں بدلہ ضرور لوں گی"۔ اس نے صاف کہہ دیا تو بابا نعمت علی نے غصے سے کہا۔

"کیسے لے گی بدلہ، اتنی رقم ہے تیرے پاس جو تُو خرچ کر سکے، جن لوگوں کے سر پر تُو بڑی بڑی باتیں کر رہی ہے نا۔ وہ کل تیرے ساتھ نہ رہے تُو کیا کرے گی۔ کون دے گا اتنی دیر تک تیرا ساتھ، تیرے ساتھ کون تھانے کچہریوں کے دھکے کھائے گا۔ کل کو جو تو تھک ہار کر چوہدریوں کے سامنے ہاتھ جوڑے گی، اچھا نہیں ہے کہ تُو آج ان کی بات مان لے"۔ بابا نعمت علی نے اسے

سمجھایا تو صفیہ نے مضبوط لہجے میں کہا۔
"ان کی بات ماننے سے پہلے میں مرجانا قبول کر لوں گی"۔
"تو پھر مرنے کے لئے تیار ہو جا۔ انہوں نے کہہ دیا ہے کہ اگر تو نہیں مانی نا تو پھر......" وہ بے بسی سے کہتے ہوئے خاموش ہو گیا تو صفیہ نے کہا۔
"وہ یہ بھی کر کے دیکھ لیں۔ جیتے جی تو انہوں نے مجھے اور میرے بچوں کو مار ہی دیا ہے اب جان سے بھی مار دیں۔ میں نہیں ڈرتی ان سے"۔
"دیکھ تو سمجھ جا، وہ جو دے رہے ہیں۔ لے کر صبر شکر کر لے۔ ورنہ بہت پچھتانا پڑے گا۔ کیوں عذاب کو دعوت دے رہی ہے۔ کون ہے تیرا جو تجھے سنبھال لے گا۔ اپنے مستقبل کا سوچ، اپنے بچوں کا سوچ"۔ رحمت علی نے غصے میں کہا اور چارپائی سے اٹھ کر باہر کی طرف نکل گیا۔ صفیہ ایک دم سے افسردہ ہو گئی۔ اسے کوئی بھی حوصلہ دینے والا نہیں تھا۔ کیا وہ اپنا حق بھی نہیں لے سکتی؟ جس نے جرم کیا، اسی کی طرف داری ہو رہی ہے۔ کیسا نظام ہے۔ اس نے آسمان کی جانب دیکھا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ پھر آنسو تھے کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

رات ڈھلتی چلی جا رہی تھی۔ صفیہ اپنے کمرے میں افسردہ بیٹھی رو رہی تھی۔ اس کے بچے سو گئے ہوئے تھے اتنے میں دروازہ پر دستک ہوئی۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا، پھر دروازہ کھولنے کے لئے اٹھی۔ اس نے لالٹین اٹھائی اور صحن پار کر کے دروازہ کھولا تو سامنے بشریٰ بیگم کو کھڑی دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی۔ اس کے ساتھ حویلی کی ایک ملازمہ رانی تھی۔ صفیہ کے منہ سے سرسراتے ہوئے نکلا

"چوہدرانی جی۔ آپ؟"
چوہدرانی نے اس کی طرف دیکھا اور نرم لہجے میں بولی۔
"اندر آنے کے لئے نہیں کہوں گی صفیہ؟"
"آں، آؤ آؤ چوہدرانی آؤ"۔ صفیہ نے کہا اور دروازے میں سے ہٹ گئی۔ چوہدرانی بشریٰ بیگم اندر آ گئی۔ بچے سوئے پڑے تھے۔ وہ دونوں آمنے سامنے تھیں اور رانی ایک جانب کھڑی تھی۔ بشریٰ بیگم خاموش تھی
"کہو چوہدرانی جی، کیسے آنا ہوا اور وہ بھی اس وقت؟" باوجود کوشش کے صفیہ کے لہجے میں طنز در آیا تھا، اس پر بشریٰ بیگم نے نرم لہجے میں کہا۔
"رات کے اندھیرے میں کسی کے دروازے پر یا تو کوئی چور جاتا ہے یا پھر بہت مجبور، تمہارے سامنے ایک مجبور ماں کھڑی ہے۔ تم چاہو تو اس کی جھولی بھر سکتی ہو"۔
"چوہدرانی۔ میرا اللہ تو کسی کے ساتھ بے انصافی نہیں کرتا پھر یہ جھولیاں بھرواتے رہنا، تم لوگوں کا ہی مقدر کیوں ہے۔ ہے کوئی اس کا جواب؟" صفیہ نے غصے میں پوچھا تو بشریٰ بیگم بولی
"میں مانتی ہوں کہ میرے بیٹے سے ظلم ہو گیا۔ اس کے لئے میں تمہارے دروازے پر اس لئے چل کر آئی ہوں کہ تم بھی ماں ہو۔ میرے دکھ کو سمجھو گی اور......"
"میں بھی تو ماں ہوں۔ کیا میرے یہ بچے مٹی کے کھلونے ہیں یا ان میں جان ہی نہیں ہے۔ ان کے سر سے تمہارے بیٹے نے باپ کا سایہ چھین لیا تو میں ماں ہو کر ان کا دکھ محسوس نہیں کرتی، کیا ہم غریبوں کے جذبات نہیں ہوتے۔ ہم سانس نہیں لیتے، ہمیں دکھ نہیں ہوتا؟" صفیہ غصے کی شدت میں کہتی چلی گئی تو بشریٰ بیگم نے اسی نرم لہجے میں کہا۔
"میں تمہارا دکھ سمجھتی ہوں لیکن جو ہونا تھا وہ ہو گیا صفیہ! اب نذیر واپس تو نہیں آئے گا، تم ان بچوں کے مستقبل کے لئے جو مانگو میں دینے کو تیار ہوں بس میرے

بیٹے کو معاف کر دو"۔

"نہیں! تم نہیں دے پاؤ گی، اور نہ ہی تمہیں ہمارے دکھ کا احساس ہے۔ اگر احساس ہوتا تو یوں میرے زخموں پر نمک چھڑکنے نہ آ جاتی۔" وہ انتہائی دکھ سے بولی تو بشریٰ بیگم نے مان سے پوچھا۔

"تم مانگ کر تو دیکھو صفیہ! میں دوں گی۔ بولو؟"

"کیا تم اپنا بیٹا مجھے دے سکتی ہو یا میرے بچوں کی طرح اس کے باپ کا سایہ دے سکتی ہو اسے بھی یتیم کر سکتی ہو"۔ صفیہ نے غصے میں کہا تو بشریٰ بیگم بھی غصے میں بولی۔ "یہ کیا بک رہی ہو؟"

"ابھی تو میں نے بات کی ہے اور چوہدرانی تم اپنے آپ میں نہیں رہی۔ دکھ جھتی ہو میرا؟ تم لوگ کیوں نہیں سمجھے ہو کہ غریب بھی حق پر ہو سکتا ہے۔ تم میرے سر کے سائیں کا خون خریدنے آئی ہو"۔ صفیہ نے نفرت سے کہا تو بشریٰ بیگم غصے میں بولی۔

"ہوش کی دوا کر صفیہ! تم جس کی زبان بول رہی ہو۔ وہ تمہیں کچھ نہیں دے سکتی؟"

"کون کسی کو کچھ دے سکتا ہے، ابھی تم نے بھی دعویٰ کیا تھا۔ سنو چوہدرانی! مجھے اس دنیا میں انصاف ملے یا نہ ملے لیکن قیامت کے دن تم لوگوں کا گریبان میرے ہاتھ میں ہوگا میں اپنے شوہر کے قاتل کو سزا دلوا کر رہوں گی۔ اس دنیا میں کوشش کروں گی۔ اگلے جہان میرا ربّ مجھے انصاف دے گا"۔ وہ غصے بھرے لہجے میں تیز انداز میں بولی تو بشریٰ بیگم نے حقارت سے کہا

"ابھی تم ہوش میں نہیں ہو۔ جب ہوش میں آؤ تو میرے پاس آ جانا۔ میں تمہیں تمہارے تصور سے بھی زیادہ دے دوں گی"۔ یہ کہتے ہوئے اس نے رانی کو چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں باہر کی جانب چلی گئیں تو صفیہ بے بس ہو کر رونے لگ گئی۔ پھر نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

صبح کے وقت صفیہ چولہے کے پاس بیٹھی آگ جلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ تبھی بابا نعمت علی گھر میں آیا اور آتے ہی پوچھا

"صفیہ! یہ میں کیا سن رہا ہوں رات چوہدرائن آئی اور تُو نے اسے خالی ہاتھ لوٹا دیا۔ تیرا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا۔ جانتی ہو وہ ہمارے ساتھ کیا کر سکتے ہیں؟"

"کیا کر سکتے ہیں۔ یہی نا کہ وہ ہمیں مار دیں گے۔ تو مار دیں۔ ایسی زندگی جی کر ہم کیا کریں گے۔ جس میں ہمیں کوئی پوچھنے والا نہ ہو۔" اس نے نفرت سے جواب دیا تو بابا نعمت بولا

"اصل میں تیرا دماغ خراب کیا ہے ماسٹر دین محمد کی بیٹی نے، دیکھ لینا وہ تیرا ساتھ نہیں دے سکے گی۔ وہ خود ساری زندگی چوہدری کے سامنے اونچی سانس نہیں لے سکے۔ وہ تیرا کیا ساتھ دیں گے؟"

"جب خون کے رشتے ہی سفید ہو جائیں تو پھر کوئی ساتھ دے یا نہ دے نذیر تیرا بھی تو بیٹا تھا بابا۔ تُو ان سے بدلہ لینے کی بجائے مجھے خوف زدہ کر رہا ہے؟" صفیہ نے جتایا تو بابا نعمت نے سمجھایا۔

"بدلہ تو وہاں لیا جاتا ہے جہاں طاقت ہو۔ ہم بے طاقت بے بس لوگ بھلا ان سے کیا بدلہ لے سکتے ہیں۔ ہم لوگ تو سکون سے سانس لے لیں یہی غنیمت ہے۔"

"تو پھر ہمیں جینے کا بھی کوئی حق نہیں ہے بابا"۔ صفیہ غصے میں بولی

"تُو پہلے ایسی تو نہیں تھی۔ بات مان جایا کرتی تھی۔ لیکن جب سے ماسٹر دین محمد کی بیٹی نے تیرا دماغ خراب کیا ہے۔ تُو آگ اگل رہی ہے۔ میری بات مان جا کیوں اس بڑھاپے میں میری زندگی خراب کر رہی ہے۔ مان جا۔ ورنہ....." وہ غصے میں کہتا ہوا رک گیا۔

"ورنہ کیا بابا تو کہنا کیا چاہتا ہے"۔ وہ ایک دم

بھڑک اٹھی تو وہ بھی غصے میں بولا۔

''میں بھی کہنا چاہتا ہوں تو اگر میری بات نہیں مانے گی۔تو پھر تیرا ہمارا تعلق کیا رہ جائے گا۔تو پھر جہاں جانا چاہئے چلی جا''۔

''بابا! تو بھی اتنا کمزور تو نہیں تھا۔میں ان بچوں کو لے کر چلی جاؤں گی۔نہیں رہوں گی،چلی جاؤں گی''۔ اس نے بھی کہا

''ہاں ہاں چلی جا ہماری جان تو عذاب میں نہیں رہے گی نا'' بابا نعمت نے تنگ آتے ہوئے کہا تو وہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔

''چلی جاؤں گی''۔

یہ کہتے ہوئے وہ ایک دم سے رو دی۔بابا چند لمحے کھڑا رہا پھر باہر کی۔طرف نکل گیا۔صفیہ دھاڑیں مار کر رونے لگی۔

صفیہ اپنے گھر کے صحن میں دھری چارپائی پر بیٹھی رو رہی تھی۔ایسے میں سلمٰی اس کے گھر میں داخل ہوئی۔اس نے دور سے دیکھا اور پریشان ہو گئی۔وہ اس کے قریب گئی تو صفیہ نے اس کی طرف دیکھا اور مزید شدت سے رونے لگی۔تب سلمٰی نے تشویش سے کہا

''کیا ہوا صفیہ! کیوں رو رہی ہو۔کیوں بلایا مجھے۔خیریت تو ہے نا''۔

''بابا نے مجھے اس گھر سے نکل جانے کو کہہ دیا ہے''۔صفیہ نے سسکتے ہوئے کہا اور شدت سے رو پڑی تو سلمٰی نے چونکتے ہوئے کہا۔''اوہ! وہی ہوا نا جس کا ڈر تھا۔پر تم گھبراتی کیوں ہو،کیوں حوصلہ ہار رہی ہو۔میں ہوں نا''۔

''تم کب تک میرا اور میرے بچوں کا بوجھ اٹھاؤ گی۔میں محنت مزدوری کر کے اپنے بچوں کا پیٹ پال لوں گی لیکن یوں میرے سر سے چھت چھین لی جائے گی۔میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔کہاں جاؤں گی؟''

صفیہ نے روتے ہوئے کہا

''تو حوصلہ کر اور چل میرے ساتھ کہتے ہیں،ایک در بند سو در کھلے۔اپنا سامان اگر لینا چاہتی ہے تو لے لو اور سیدھی میرے پاس آجا،اپنے بچوں کو لے کر۔میں تمہارا سہارا بنوں گی''۔سلمٰی نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا

''تم کیسے؟''صفیہ نے حیرت سے پوچھا

''میں نے کہا نا فکر کرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔یہ رونا دھونا بند کرو اور چلو میرے ساتھ''۔سلمٰی نے کہا۔

''سلمٰی! کیا مجھے انتظار نہیں کرنا چاہئے۔بابا غصے میں کہہ گیا ہے۔شاید اسے اپنے پوتوں کا خیال آجائے۔مجھے جلد بازی نہیں کرنی چاہیے''۔اس نے سوچتے ہوئے کہا تو سلمٰی بولی۔

''تم چاہو تو انتظار کر لو مگر ایک دن تجھے اس گھر سے جانا ہوگا۔یہ چوہدریوں کی ملکیت ہے۔بہر حال تم جب چاہو اور جس وقت چاہو میرے پاس آسکتی ہو۔میں تمہاری ہر ضرورت کا خیال رکھوں گی''۔

''تو پھر میں دیکھ لوں بابا کو؟''صفیہ نے پوچھا۔

''ہاں دیکھ لو جیسے تمہارا دل چاہے''۔سلمٰی نے اس کی بات مانتے ہوئے کہا۔صفیہ نے حسرت بھری نگاہوں سے اس گھر کے در و دیوار پر نگاہ ڈالی اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔سلمٰی اسے دلاسا دینے لگی۔

ماسٹر دین محمد اور فہد دالان میں بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔فہد نے کہا

''استاد جی۔آپ ایک دو دن میں تیار رہیں۔آپ کو میرے ساتھ نور پور جانا ہوگا۔وہ آپ کا پنشن کیس منظور ہو گیا ہے۔وہاں سے چیک لینا ہوگا''۔

''او پتر۔میں جانتا ہوں ان محکمے والوں کو۔اتنی جلدی کہاں وہ چیک دینے والے ہیں۔ابھی مہینہ ڈیڑھ مہینہ تو لگ ہی جائے گا۔یہ محکمے فرض شناسی سے کام کریں نا تو اس ملک کے آدھے مسائل خود بخود حل ہو

جائیں"۔ ماسٹر دین محمد نے کہا۔ اسی وقت سلمیٰ باہر گیٹ سے اندر آ گئی۔ دونوں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ قریب آ کر رک گئی تو ماسٹر دین محمد نے اس سے پوچھا۔ "خیر تو تھی صفیہ نے بڑی جلدی میں تمہیں بلایا تھا؟"

"وہ بابا نعمت علی نے اسے اپنے گھر سے نکل جانے کو کہا ہے چوہدریوں کی بات نہ ماننے پر"۔ سلمیٰ نے افسردگی سے کہا

"تو پھر۔ تم نے کیا کہا؟" ماسٹر دین محمد نے پوچھا۔

"میں نے کہا آ جاؤ۔ میرے گھر میں اس کی ذمہ داری لیتی ہوں۔ آپ کہیں......" یہ کہتے ہوئے اس نے سوالیہ انداز میں ان دونوں کی طرف دیکھا تو فہد نے تیزی سے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک کہا تم نے۔ وہ جب بھی آئے تم اسے چاچے عمر حیات کے گھر ٹھہرا دو۔ اگر وہ وہاں خطرہ محسوس کرے تو یہاں۔ جیسا تم چاہو"۔

"اب اگر اس کی ذمہ داری لی ہے تو پوری طرح سے نبھانا۔ یاد رکھنا، اس کے آنے کے ساتھ تمہیں دکھ اور پریشانیاں بھی مل سکتی ہیں"۔ ماسٹر دین محمد نے سمجھایا۔

"مجھے احساس ہے ابا جی، میں نے یہ ذمے داری صرف ایک مظلوم کا ساتھ دینے کے لئے لی ہے"۔ سلمیٰ نے کہا تو ماسٹر دین محمد نے سکون سے حاصلہ دیا۔

"تو پھر گھبرانا نہیں، وہ اوپر والا تیرا ساتھ ضرور دے گا"۔

"آپ نے چائے وغیرہ پی، میں لاؤں؟" سلمیٰ نے پوچھا تو فہد نے کہا۔

"نہیں! ضرورت نہیں۔ میں بھی ذرا سراج کی طرف جا رہا ہوں۔ تمہاری وجہ سے استاد جی نے مجھے بلوا لیا۔ اچھا، میں اب چلتا ہوں"۔ یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کر چل دیا۔ سلمیٰ نے اسے محبت بھری نگاہوں سے دیکھا اور اندر چلی گئی۔

☆......☆......☆

چوہدری کی حویلی میں در آنے والی وہ صبح اتنی خوشگوار نہیں تھی۔ چوہدری جلال گہری سنجیدگی کے ساتھ دالان میں بیٹھا گہری سوچ میں گم تھا۔ چہرے پر غصے کے تاثرات پھیلے ہوئے تھے۔ ایسے میں بشریٰ بیگم چائے لے کر دھیرے دھیرے قریب آئی اور میز پر چائے رکھ کر اس کی سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ چوہدری جلال نے اس کی طرف دیکھا اور پھر سرد لہجے میں پوچھا

"تمہیں جب میں نے بولا تھا کہ اس نیچ ذات کی عورت کے پاس نہیں جانا تو پھر تم کیوں گئیں؟"

"چوہدری صاحب! میں نے پہلے بھی آپ سے کہا ہے کہ میں ماں ہوں۔ اور میں اپنے بیٹے کے لئے......" بشریٰ بیگم نے کہنا چاہا مگر وہ اس کی بات ٹوک کر بولا۔

"مگر شوہر کی حکم عدولی کر چکی ہو۔ کیا میں سمجھ لوں کہ اب تمہیں شوہر سے زیادہ اپنا بیٹا عزیز ہو گیا ہے۔ جو کہ اصل گناہ گار ہے"۔

"میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی سرتاج کہ میں آپ کی حکم عدولی کروں"۔ یہ کہتے ہوئے وہ اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔ "مجھے معاف کر دیں۔ پہلی اور آخری بار معاف کر دیں"۔

"تم جانتی ہو بیگم، ان نیچ ذات کے لوگوں کے بارے میں۔ ان لوگوں سے نرم لہجے میں بھی بات کر لو تو یہ سر پر چڑھ جاتے ہیں۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ اس نے تمہاری بات نہیں مانی"۔ چوہدری جلال نرم پڑتے ہوئے بولا تو بشریٰ بیگم نے اپنے دونوں ہاتھوں سے چائے کی پیالی اٹھا کر اسے دیتے ہوئے کہا۔

"اس کے دماغ میں تو بہت آگ بھری ہوئی ہے۔ وہ کوئی بات سننا ہی نہیں چاہتی"۔

"وہ اس وقت پوری طرح دشمنوں کے ہاتھ میں ہے۔ وہ اسے ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہے ہیں لیکن

نہیں جانتے۔ان کا سامنا کس سے ہے۔وہ کچھ بھی نہیں کر سکے گی"۔ چوہدری جلال نے حقارت سے کہا اور پیالی پکڑلی۔

"کہیں میرے بیٹے کبیر کو کچھ......" بشریٰ بیگم نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"میرا بھی وہ بیٹا ہے اگر اسے کچھ ہوتا ہے تو پھر ہماری سیاست کا کیا فائدہ؟میں تو ان کی اچھل کود دیکھ رہا ہوں۔کبیر محفوظ ہے۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے چائے کی پیالی اٹھائی اور ہلکا سپ لیا۔ بشریٰ بیگم حسرت و یاس سے اپنے شوہر کی جانب دیکھتی رہی،جو سوچ میں کھویا ہوا سپ لے رہا تھا۔ تبھی بشریٰ نے چونکتے ہوئے پوچھا

"کہاں ہے میرا کبیر وہ حویلی میں تو نہیں ہے۔"

"ڈیرے پر ہے بلوا لو اسے، اگر بلا سکتی ہو تو، کیونکہ آج سکول کی گھنٹی پھر بجے گی اور وہ لوگ یہ گھنٹی یونہی نہیں بجا رہے ہیں۔میں نے اسے بہت سمجھایا،وہ نہیں مان رہا"۔ چوہدری نے بے بسی سے کہا۔

"مطلب ، دشمن یہ چاہتے ہیں کہ تصادم ہو اور......"بشریٰ بیگم نے کہا اور پریشانی کے عالم میں اٹھ کھڑی ہوئی،چوہدری جلال نے پیالی واپس میز پر رکھ دی۔

چوہدری کبیر اضطرابی انداز میں ڈیرے کے کوریڈور میں ٹہل رہا تھا۔اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی اور غصے کے تاثرات نمایاں تھے۔ اتنے میں ماکھا آ گیا تو چوہدری کبیر نے پوچھا۔

"ہاں بول ماکھے،کیا خبر ہے۔آج بھی انہوں نے سکول کھولنا ہے یا پھر بس تالا توڑنے ہی کا شوق تھا اور ایک دن ہی گھنٹیاں بجا کر غائب ہو گئے؟"

"نہیں چوہدری صاحب،سلمیٰ کچھ بچوں کے ساتھ سکول کی طرف ہی جا رہی ہے اور اس کی حفاظت کے لئے فہد اور اس کے ساتھ بندے بھی موجود ہیں"۔ ماکھے نے بتایا تو چوہدری کبیر نے چونکتے ہوئے پوچھا۔"کتنے بندے لئے پھرتے ہیں؟"

"تھوڑے سے ہیں"۔ماکھے نے بتایا

"او خیر ہے، جتنے بھی ہوں۔تیاری کرو سکول تو بند ہونا ہی ہے۔آج اس فہد کی زندگی کی کتاب بھی بند کر دیتے ہیں۔دیکھتا ہوں کون سکول چلاتا ہے؟" چوہدری کبیر نے غصے میں کہا تو ماکھا بولا۔

"جو حکم چوہدری صاحب"۔

چوہدری کبیر کاریڈور سے نکلا،میز پر پڑے ہولسٹر سے ریوالور نکالا اور پھر اپنی کار میں جا بیٹھا۔چوہدری کبیر نے گاڑی سٹارٹ کر لی۔اس دوران اس کے ملازمین بھی ایک دوسری جیپ میں بیٹھنے لگے۔ایسے میں ڈیرے کے پھاٹک میں گاڑی آ کر رک گئی۔اس میں سے منشی نے نکل کر مودب انداز میں دروازہ کھولا۔تو بشریٰ بیگم باہر نکل آئی۔چوہدری کبیر جہاں تھا وہیں رک گیا۔وہ حیرت سے اپنی ماں کو دیکھتے ہوئے جلدی میں اپنی گاڑی میں سے باہر آ کر غصے میں اپنی ماں سے بولا۔

"آج تک حویلی کی کوئی عورت ڈیرے پر نہیں آئی۔ یہ بات آپ جانتی ہو ماں،ایسا کیا ہو گیا ماں کہ......"

"کہاں جا رہا ہے تو؟"بشریٰ بیگم نے پوچھا۔

"جن لوگوں نے سکول کھولا ہے نا انہیں سبق دینے جا رہا ہوں"۔ چوہدری کبیر نے طنزیہ لہجے میں کہا تو بشریٰ بیگم سکون سے بولی۔

"چل میں بھی تیرے ساتھ چلتی ہوں"۔

"او کیا ہو گیا ہے ماں، میں کوئی کانچ کی گولیاں کھیلنے نہیں جا رہا۔میرا راستہ مت روک"۔ چوہدری کبیر نے احتجاجاً کہا تو بشریٰ بیگم اسی سکون سے بولی۔

"میں تیری گاڑی میں بیٹھ رہی ہوں۔تو چاہے تو

مجھے سکول لے جایا واپس حویلی۔ میں نے میرے باپ سے وعدہ کیا ہے کہ اب تجھے کوئی خون نہیں کرنے دوں گی"۔

وہ اپنا آنچل سنبھالتے ہوئے چوہدری کبیر کی گاڑی میں جا بیٹھی۔ وہ بے بسی میں چند لمحے سوچتا رہا پھر ملازمین کو واپس جانے کا اشارہ کر کے اپنی گاڑی میں جا بیٹھا۔

حویلی کے ڈرائینگ روم میں چوہدری جلال، وکیل اور چوہدری کبیر تینوں صوفوں پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ منشی کھڑا تھا۔ چوہدری کبیر غصے میں کہہ رہا تھا۔

"بابا میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ یہ جو اچانک یہاں تماشے ہونا شروع ہو گئے ہیں، یہ کوئی فہد کا کمال نہیں بلکہ اس کے پیچھے ملک نعیم ہے۔ وہی سب کچھ کروا رہا ہے"۔

"نکے چوہدری جی آپ کے پاس اس بات کا کوئی ثبوت ہے؟ یا فقط آپ کا اندازہ ہے؟" وکیل نے پوچھا۔

"دوسری بار الیکشن ہارنے کے بعد وہ اچانک خاموش ہو گیا اور ہم نے اس کی خاموشی کو نظر انداز کر دیا مگر وہ اندر ہی اندر ہمارے خلاف سازشیں کرتا رہا۔ یہاں تک کہ صفیہ کے لئے اس نے پریس کانفرنس کر دی تو وہ کھل کر سامنے آیا۔ اب وہ باقاعدہ فہد سے مل گیا ہے، یہاں اس گاؤں میں آ کر، اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے"۔

"یہ ثبوت نہیں ہیں نکے چوہدری صاحب"۔ وکیل نے کہا تو چوہدری جلال بولا۔

"آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں وکیل صاحب"۔

"ذرا غور کریں چوہدری صاحب، ریونیو آفیسر نے فہد کے حق میں فیصلہ دیا تو آپ نے اس کا تبادلہ کروا دیا۔ ڈی ایس پی کا تبادلہ کروا گیا، اس نے سیاسی دباؤ برداشت نہیں کیا۔ مطلب آپ کی بات نہیں مانی اور جو اس کی جگہ اے ایس پی آیا ہے اس کا موڈ کوئی آپ کے حق میں نہیں لگتا۔ وہ سیدھے سیدھے فہد کی بات کرتا ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے چوہدری صاحب، کیا ملک نعیم، انتظامی طور پر اتنی اپروچ رکھتا ہے؟" وکیل نے سمجھایا تو چوہدری جلال نے سوچتے ہوئے کہا۔

"لگتا نہیں ہے کہ وہ اتنی اپروچ رکھتا ہو گا"۔

"نہیں آپ یقین سے بات کریں"۔ وکیل نے پوچھا۔

"نہیں، نہ اس کی ہمت ہے اور نہ اس کے اس قدر تعلقات ہیں"۔ اس نے حتمی لہجے میں کہا تو وکیل بولا

"تو پھر سوچئے چوہدری صاحب، کہیں آپ سیاسی طور پر ناکام تو نہیں ہو رہے؟ آپ کا اثر و رسوخ کدھر گیا؟ یا پھر مان لیں کہ ملک نعیم اپروچ رکھتا ہے اور وہ سیاسی طور پر مضبوط ہو گیا ہے"۔

"میرا ذہن نہیں مانتا کہ وہ اتنا بڑا کھیل، کھیل سکتا ہے۔ جہاں دشمن کی کمزوریوں اور خامیوں پر نظر رکھی جاتی ہے، وہاں اس کی خوبیوں پر بھی نگاہ ہوتی ہے۔ وہ اتنی ہمت نہیں کر سکتا"۔ چوہدری جلال حتمی لہجے میں بولا۔

"کیا وہ ہمت کر بھی نہیں سکتا؟" وکیل نے پوچھا۔

"اگر اس نے حوصلہ کر ہی لیا ہے تو اس کا راستہ روکنا بہت ضروری ہو گا"۔ اس نے بات سمجھتے ہوئے کہا۔

"کب راستہ روکیں گے آپ جب اس کے مہرے مضبوط ہو کر آپ کو شہ مات دینے کے لئے آپ کے سر پر آ پہنچیں گے؟" وکیل نے کہا تو چوہدری کبیر تڑپ کر بولا۔

"بابا، اجازت دیں ملک نعیم کا ہی پتہ صاف کر دیتے ہیں سارے مہرے خود ہی پٹ جائیں گے"۔

"پتہ صاف کر دینا بہت آسان ہوتا ہے نکے چوہدری جی۔ مگر پھر اسے سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے، یہ احساس ہو گا آپ کو۔ میں کبھی بھی یہ مشورہ نہیں دوں گا۔"

وکیل نے کہا تو چوہدری کبیر انتہائی طنزیہ لہجے میں بولا۔

"تو پھر کیا کریں وکیل صاحب، اب ان کی منت تو کرنے سے رہے"۔

"یہ وقت جوش کا نہیں ہوش کا ہے۔ کچھ لو کچھ دو کا اصول اپنا کر سیاست کریں۔ علاقے کے لوگوں کو اعتماد میں لیں۔ ان پر نوازشیں کریں۔ ڈرانے دھمکانے کی بجائے ان کو یہ باور کرائیں کہ آپ ان کے ہمدرد ہیں۔ ان کے چھوٹے چھوٹے کام کروا دیں۔ اپنی سیاسی جماعت میں اثر ورسوخ بڑھائیں"۔ یہ کہہ کر وہ ایک لمحہ کے لئے رکا اور پھر چوہدری جلال کی طرف دیکھ کر بولا۔

"آپ نے ساری زندگی سیاست کی ہے کیا آپ نہیں جانتے؟"

"میں تو جانتا ہوں وکیل صاحب، لیکن کبیر کو کون سمجھائے۔ یہ جو چند لوگ یہاں کھیل تماشے کر رہے ہیں ان کی کوئی اوقات ہی نہیں ہے۔ بس اصل وجہ تک پہنچنا ہے۔ اس کی سمجھ آ گئی تو یہ سب خود بخود ختم ہو جائے گا"۔ چوہدری جلال نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"یہی بات اس وقت سمجھ آئے گی جب یہ نکے چوہدری سیاست سیکھیں گے، تو پتہ چلے گا"۔ وکیل نے سمجھایا تو چوہدری جلال بولا۔

"وہ تو میں نے آپ سے کہا ہے۔ آپ اسے سمجھائیں۔ باقی میں سب دیکھ لوں گا"۔ یہ کہہ کر اس نے منشی کی طرف دیکھ کے پوچھا۔

"دیکھو کھانا لگ گیا ہے؟"

"جی لگ گیا ہے، آپ آئیں"۔

اس نے کہا تو سبھی اٹھ گئے تو منشی فون کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے تھانے کے نمبر ڈائل کیے اور انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد تھانیدار نے فون اٹھا لیا۔ اس نے منشی کو پہچانتے ہوئے پوچھا

"اوئے منشی جی کیا حال ہے تیرا؟ کیسے کیا فون؟"

"میں ٹھیک ہوں، بس، تیرے ذمے ایک کام لگانا ہے"۔

"کام، کیسا کام؟" اس نے پوچھا۔

"تو ہے کہ نہ حویلی آیا ہے اور نہ ڈیرے پر، اور نہ ہی تو فون پر ملتا ہے۔ لگتا ہے نئے اے ایس پی نے تجھ سے کوئی زیادہ ہی کام لینا شروع کر دیا ہے"۔ منشی نے طنزیہ لہجے میں کہا تو تھانیدار چڑتے ہوئے بولا۔

"اوئے کام کیا منشی، اس نے اے ایس پی نے تو پڑھنے پا دیا ہے۔ یہ پہلا افسر ہے جس کی ابھی تک مجھے سمجھ نہیں آئی۔ اور جس دن اس کی مجھے سمجھ آ گئی اس کی ساری افسری گھما کر رکھ دوں گا۔ خیر، تُو کام بول"۔

"کام یہ ہے کہ وہ جو چھاکا ہے نا، اسے کچھ دن اس طرح اندر رکھنا ہے کہ وہ باہر نہ آ پائے۔ بس اتنا سا کام ہے، جو تُو نے کرنا ہے"۔ منشی نے بتایا

"کچھ دن، مطلب؟" اس نے پوچھا

"ہاں، اگر بات نہیں مانتا تو پھر اسے لمبا بھیج دے مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے"۔ منشی نے کہا۔

"اوئے مدعا کیا ڈالنا ہے اس پر؟ دیکھ تجھے پتہ ہے نئے افسر کا، جو کام بھی ہونا ہے وہ پھر پکا ہی ہونا ہے"۔ تھانیدار نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"میں کون سا کہہ رہا ہوں کہ تُو کچا کام کر۔ کام تو پکا ہی ہونا چاہئے۔ وہ خود کو چشم دید گواہ بنائے پھرتا ہے نا نذیر کا"۔ منشی نے اسے سمجھایا تو تھانیدار نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔

"اوئے ایک تو یہ چشم دید گواہوں نے میری مت ماردی ہے۔ ویسے چوہدری کبیر کو بھی چاہئے کہ ہتھ ہولا رکھے وہ بھی نا"۔

"او یہ وڈے لوگ جانے کہ وہ کیا کرتے ہیں۔ چھاکے پر جو مدعا ڈالنا ہے اور جیسے ڈالنا ہے وہ بتا دینا میں سارا بندوبست کر دوں گا"۔ منشی نے اس کی بات نظر انداز

کرتے ہوئے کہا

"وہ تو ٹھیک ہے بتا دوں گا۔ پر ہم جو چوہدریوں کی اتنی غلامی کر رہے ہیں اِدھر اُدھر جو دینا ہے وہ بھی ہم پلے سے ہی دیں"۔ تھانیدار نے کہا

"کتنا چاہئے ہوگا اس کام لے لئے؟" منشی نے پوچھا۔

"کام دیکھ لو، رقم بھی خود طے کرلو تم نے کون سا نئی رقم دینی ہے۔ مجھے پتہ تو ہے کہ گاڑی بنا پیٹرول کے نہیں چلتی"۔ اس نے واضح انداز میں کہا تو منشی بولا۔

"تو مدعا دا، رقم تجھے پہنچ جائے گی"۔

"بس تو کوئی کام کا بندہ تلاش کر کے رکھ باقی فکر نہ کر"۔ تھانیدار نے بھی یقین دہانی کروادی تو منشی بولا۔

"بندے بڑے، اب میں فون رکھتا ہوں"۔

منشی نے رسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

☆.....☆.....☆

بشریٰ بیگم افسردہ سی بیٹھی سوچ رہی تھی کہ رانی آ گئی۔ اس نے پاس بیٹھ کر ہولے سے پوچھا۔

"بیگم صاحبہ، آپ تو بہت زیادہ ہی پریشان ہو گئی ہیں"۔

"معاملہ میرے پتر کا ہے۔ کیا مجھے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ یہ کوئی میرے بس کی بات ہے پتہ نہیں کیا ہو گا"۔ بشریٰ بیگم نے حسرت سے کہا تو رانی قالین پر صوفے کے ساتھ بیگم کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔

"بیگم صاحبہ! بھلا مجھے بتائیں۔ آپ اگر یونہی پریشان رہیں تو کیا یہ معاملہ حل ہو جائے گا۔ نہیں نا"

"تم کہتی تو ٹھیک ہو لیکن یہ میرا دل جو ہے نا، بہت ڈر رہا ہے۔ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔" بشریٰ بیگم نے سوچتے ہوئے کہا تو رانی بولی۔

"آپ ماں بن کر سوچ رہی ہیں نا لیکن پریشانی سے کچھ نہیں ہوگا"۔

"تو پھر اور کیا کروں میں۔ اس صفیہ کو منانے گئی تھی لیکن اس نے تو کوئی اُمید بھی نہیں چھوڑی"۔ بشریٰ بیگم نے حسرت سے کہا۔ اس دوران چوہدری کبیر نے کمرے میں آتے ہوئے اپنی ماں کی بات سن لی۔ تبھی اس نے دبے دبے غصے میں کہا

"آپ نے وہاں جا کر اچھا نہیں کیا ماں! انہیں جانا چاہئے تھا وہاں"۔

"تم! میں تو اس کے پاس....." بشریٰ بیگم نے چونک کر کہا تو چوہدری کبیر حقارت سے بولا۔

"یہ ہماری شان اور مرتبے کے خلاف ہے کہ آپ اس کی کمین عورت کے دروازے پر چل کر گئی ہو۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہوتا پولیس پکڑ کر لے جاتی مجھے سزا ہو جاتی۔ میں مر جاتا"۔

"اللہ نہ کرے پتر! یہ تُو کیسی باتیں منہ سے نکال رہا ہے۔ برا ہو دشمنوں کا تمہارے سر پر تو میں نے ابھی سہرے دیکھنے ہیں"۔ بشریٰ بیگم نے تیز لہجے میں کہا۔

"ہاں۔ یہ بات کی ہے نا آپ نے کام کی، میں یہی بات کرنے کے لئے آپ کے پاس آیا ہوں"۔ اس نے کہا تو بشریٰ بیگم نے چونک کر کہا۔

"یہی بات۔ ! کیا مطلب، تم کہنا کیا چاہ رہے ہو"۔

"آپ نے ایک دفعہ مجھ سے پوچھا تھا نا کہ میری پسند کون ہے؟" چوہدری کبیر نے کہا۔

"ہاں پوچھا تھا کون ہے وہ بتاؤ مجھے، میں اسے ہی تمہاری دلہن بناؤں گی۔ بتا پتر؟" بشریٰ بیگم نے خوش ہو کر کہا تو چوہدری کبیر بولا۔

"تو سنو ماں، میری پسند، ماسٹر دین محمد کی بیٹی سلمیٰ ہے، وہی میری دلہن بنے گی"۔

"یہ..... یہ کیا کہہ رہے ہو تم سلمیٰ، وہ کیوں؟" بشریٰ بیگم نے شدید حیرت سے کہا تو چوہدری

کبیر مسکراتے ہوئے بولا۔

''اس کیوں کا جواب، میں اس وقت دوں گا، جب وہ میری دلہن بن گئی''۔

''بیٹا، کہاں وہ کہاں تم؟ یہ جوڑ بنتا ہی نہیں ہے۔ تم خواہ مخواہ ضد کر رہے ہو۔ ایسا مت سوچو تمہارا معاملہ جلدی ختم ہو جائے گا تو ہم تمہیں بہت اونچے گھرانے سے دلہن لا کر دیں گے۔ پھر ایسا نہیں سوچنا''۔ بشریٰ بیگم نے انکار کرتے ہوئے کہا

''ماں! میں نے کہہ دیا اور بہت سوچ سمجھ کر یہ کہا ہے۔ وہ ہر حال میں میری دلہن بنے گی۔ اور بس''۔ چوہدری کبیر نے فیصلہ کن انداز میں کہا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ بشریٰ بیگم حیرت زدہ سی بیٹھی رہ گئی۔ رانی نے اس کی طرف دیکھا اور گھبرا کر پلٹ گئی۔

رات کا دوسرا پہر ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ چوہدری جلال حویلی کے دالان میں بیٹھا گہری سوچ میں کھویا ہوا تھا۔ بشریٰ بیگم نے اسے یوں دیکھا تو دھیرے قدموں سے اس کے پاس آئی تو چوہدری نے اس کی طرف دیکھ کر ایک طویل سانس لیا۔

''آپ نے سونا نہیں۔ رات اتنی گہری ہو گئی ہے''۔ بشریٰ بیگم نے پوچھا تو چوہدری جلال اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

''بیگم! یہ جو تو نے کبیر کی ضد بارے مجھے بتایا ہے، یہ ٹھیک نہیں ہے۔ ماسٹر دین محمد کو ساری زندگی ہم نے دبا کر رکھا ہے اس کی بیٹی سلمٰی بارے کبیر کی خواہش...... یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے؟''

''میں نے اپنے طور پر معلوم کیا چوہدری صاحب! اپنا کبیر۔ اس سلمٰی کے لئے اپنے دل میں محبت پال چکا ہے۔ جس کا اظہار وہ کرتا رہا ہے۔ ہم ہی غافل رہے ہیں''۔ بشریٰ بیگم نے اس پر واضح کر دیا تو چوہدری جلال نے چونکتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب! یہ محبت کیا ہوتی ہے۔ فضول ضد ہے کبیر کی یہ۔ اسے یہیں ختم کرنا ہو گی یہ ضد۔ بتا دینا اسے میں ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گا''۔

''میں بھی نہیں چاہتی کہ کبیر ایسی خواہش کرے لیکن اگر سختی سے روکیں گے تو ممکن ہے وہ ہماری بات نہ مانے اور....'' بشریٰ بیگم نے کہنا چاہا تو وہ بات کاٹ کر بولا۔

''وہ کچھ بھی کر لے۔ ایسا ممکن نہیں ہو گا''۔ پھر ایک دم سے خاموش ہو کر لمحہ بھر کے لئے سوچا اور بولا ''بیگم! تم نے یہ معلوم نہیں کیا کہ اس لڑکی سلمٰی نے ہی کبیر پر ڈورے ڈالے ہوں؟''

''وہ کبیر سے نفرت کرتی ہے''۔ بشریٰ بیگم نے ہولے سے کہا تو چوہدری جلال سمجھتے ہوئے بولا۔

''تو پھر وہ ایسا صرف اپنی ضد اور انا کے لئے کرنا چاہتا ہے۔ اسے سمجھا دو وہ ایسی فضولیات میں نہ پڑے۔ بلکہ اس جاگیر کو سنبھالنے کے لئے خود کو تیار کرے۔ اگر میں نہ رہا تو وہ کچھ نہیں کر پائے گا''۔

''اللہ نہ کرے، آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میں آپ کو یہی بتانا چاہ رہی کہ آپ پریشان نہ ہوں۔ میں اسے آہستہ آہستہ منا لوں گی۔ اس کے ذہن سے سلمٰی نکال دوں گی۔ آپ اس کے لئے جلدی دلہن دیکھ لیں۔ پھر وہ سب بھول جائے گا''۔ بشریٰ بیگم نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

''ایسا ہی کرنا ہو گا۔ بس یہ نذیر والے معاملے کی دھول کم ہو جائے۔ پھر اس کی شادی کر دیتے ہیں''۔ چوہدری جلال نے حتمی انداز میں کہا تو بشریٰ بیگم بولی۔ ''یہی بہتر رہے گا۔ آپ آئیں۔ آرام کریں۔ رات بہت ہو گئی ہے''۔

''چلو''۔

چوہدری جلال اٹھ گیا۔ وہ دونوں چلتے ہوئے اپنے

کمرے کی جانب بڑھ گئے۔

☆......☆......☆

صبح کی نماز کے بعد فہد اور سراج چہل قدمی کے بعد گھر کے صحن میں آکر بیٹھ گئے۔ وہ باتیں کررہے تھے کہ چھاکا آگیا، اس نے آہستہ سے سلام کیا اور کچن کی طرف جانے لگا۔ تبھی سراج نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے خوشگوار موڈ میں پوچھا۔

"اوئے چھاکے! بڑا چپ چاپ ہے۔ خیر تو ہے ابّے نے تو نہیں مارا؟"

"کیا ہوا ہے تجھے، کیوں پریشان ہے؟" فہد نے بھی اس کا چہرہ دیکھ کر پوچھا تو چھاکا بولا۔

"پریشانی تو ہے، چوہدری کا منشی آیا تھا ابّے کے پاس دھمکی لگانے"۔

"کہیں وہ نذیرے والے کیس میں تو نہیں؟" سراج نے تیزی سے پوچھا

"ہاں! کہہ رہا تھا کہ میں اپنا بیان واپس لے لوں"۔ چھاکے نے جواب دیا تو فہد نے کہا۔

"ہوں، یار انہوں نے تو ایسا کرنا ہی ہے اب، لگتا ہے چوہدری قانونی جنگ ہار کر بدمعاشی پر اتر آئے ہیں"۔

"وہ پہلے کون سا قانونی جنگ لڑتے ہیں۔ غنڈہ گردی ہی تو کرتے ہیں، جس کی وجہ سے لوگ ان سے خوف زدہ ہیں اور اس غنڈہ گردی کے لئے انہوں نے بدمعاش پالے ہوئے ہیں۔ خیر چھاکے، وہ جو کچھ بھی کہیں ان کی چھوڑ انہوں نے تو کہنا ہی ہے یہ بتا، تُو اور تیرا ابا کیا کہتے ہیں؟" فہد نے پوچھا۔

"کچھ نہیں، ابّے نے تو صرف مجھے بتایا ہے اور کوئی بات نہیں کی اور میں تو وہی کہوں گا نا جو آپ لوگ کہیں گے"۔ چھاکے نے کہا تو فہد بولا۔

"کیوں، تم ہماری زبان کیوں بولو گے؟ نہیں،

منافقت

☆ انسان اپنی غلطی پر اچھا "وکیل" بن جاتا ہے اور دوسروں کی غلطی پر سخت "جج" بن جاتا ہے۔

☆ اگر اپنے رزق اور مسائل کے فیصلے اللہ پر چھوڑے ہیں تو پریشان کیوں ہو؟ اور اگر لوگوں پر چھوڑے ہیں تو پھر حیران کیوں ہو؟

☆ دنیا سے ایسا تعلق رکھو جیسا کہ تم آگ سے رکھتے ہو۔ اس سے اپنے آپ کو بچاتے بھی ہو اور نفع بھی حاصل کرتے ہو۔ (حکیم محمود۔ ساہیوال)

چھاکے، ہم لوگوں کے کہنے پر نہ جا، اپنے اندر سچ بولنے کی ہمت پیدا کر۔ وہی سچ کہنے کا حوصلہ کر جو اصل حقیقت ہے۔ چوہدری زیادہ سے زیادہ جان سے مروا دے گا، اس سے آگے وہ کیا کرسکتا ہے، یہ سوچ لے۔" یہ کہہ کر فہد چھاکے کے دل پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "یہ جو کہتا ہے وہ کر"۔

"نہیں فہد! میں نے فیصلہ کرلیا ہوا ہے۔ میں نے تو وہی کہنا ہے جو حقیقت ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھا ہے۔ میں آنکھیں بند نہیں کرسکتا"۔ چھاکے نے صاف لہجے میں کہا تو سراج بولا۔

"تو پھر کیا غم ہے۔ یہ رونی صورت کو ختم کر۔"

"میں پریشان اس لئے نہیں ہوں کہ انہوں نے مجھے دھمکی دی یا وہ میرے کسی فیصلے پر اثر انداز ہوں گے۔ میں پریشان اس لئے ہوں کہ اگر میری وجہ سے نئے چوہدری کو سزا ہوتی ہوئی نظر آئی تو وہ مجھے مارنے کی پوری کوشش کریں گے۔ اس طرح صفیہ کو انصاف تو نہیں مل سکے گا۔" چھاکے نے اپنی پریشانی کی وجہ بتائی تو فہد نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اب وہ وقت ختم ہو چکا ہے چھاکے۔ کبیر جس طرح پہلے اس علاقے میں بدمعاشی کررہا تھا نا، اب ویسا

نہیں کر سکے گا۔ اسے اب ہم سے چھپ کر ہی رہنا ہوگا۔"

"تو حوصلہ کر چھاکے ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ کیا ہم نہیں ہیں۔ اور پھر تجھے کیا، تیری تو پورے علاقے میں دس پچھ ہوگئی ہے"۔ سراج نے خوشگوار انداز میں ہنستے ہوئے کہا تو وہ تینوں ہنس دیئے۔ تبھی فہد نے کہا۔

"چل اب جلدی چائے ہی پلا دے۔ تیرے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ تیرے ہاتھ کی چائے کا تو چسکا ہی لگ گیا ہے"۔

"سیدھا ناشتہ ہی بنا میری جان، وہ تیرا شیخ آفتاب بھی تو آتا ہوگا"۔ سراج نے یاد دلایا تو فہد نے کہا۔

"او ہاں یار، کچھ کھانے کو دے دے۔ اس کے ساتھ پتہ نہیں کتنا وقت لگتا ہے"۔

"ابھی لو"۔ چھاکے نے کہا اور کچن میں گھس گیا۔

فہد، سراج اور شیخ آفتاب کھیتوں کے درمیان پھرتے ہوئے زمین دیکھ رہے تھے۔ ان کے انداز سے بھی ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ زمین کا سروے کر رہے ہوں۔ وہ چلتے ہوئے سڑک کنارے آ گئے، جہاں گاڑیاں کھڑی تھیں اور ان کے پاس شیخ آفتاب کا ڈرائیور اور گن مین کھڑے تھے۔ شیخ آفتاب نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

"زمین تو میں نے دیکھ لی فہد صاحب! یہ فیکٹریوں کے لئے انتہائی مناسب جگہ ہے۔ میں ایسی ہی جگہ چاہتا تھا اور چوہدری جلال میری راہ میں رکاوٹ بنا ہوا تھا"۔

"یہ چاچے عمر حیات کی زمین تھی جو میں نے خریدی ہے۔ چوہدری جلال میری بھی راہ میں آیا تھا۔ مگر اب نہیں، اب آپ یقین رکھیں۔ وہ کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کرے گا"۔ فہد نے اسے یقین دلایا تو شیخ آفتاب بولا۔

"فہد صاحب، ان سیاست دانوں کا کوئی بھروسہ نہیں۔ کیا آپ نہیں جانتے، ہمارے ہاں سیاست کسے کہتے ہیں؟"

"جانتا ہوں شیخ صاحب! دھوکا دینا، جھوٹ بولنا اور دوسروں کو کچل کر اپنے مفادات حاصل کرنے ہی کو سیاست سمجھا جاتا ہے"۔ فہد نے کہا۔

"ہمارا سیاسی کلچر ہی یہی بن چکا ہے کہ دولت لگاؤ اور دولت کماؤ حلال حرام، قومی مفاد، اور عوام کی خدمت ان کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ سیاست بھی ایک کاروبار کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ سرمایہ لگا کر ایم پی اے، ایم این اے بن جاؤ، خوب کرپشن کرو، لوٹ مار کرو اور دولت بناؤ۔ غریب آدمی تو الیکشن کے اخراجات پورے نہیں کر سکتا"۔ شیخ آفتاب نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا تو فہد سکون سے بولا۔

"لیکن، بات تو ووٹ پر آ کر ختم ہوتی ہے نا شیخ صاحب! غریب اگر اپنے جیسے کسی بندے کو ووٹ دے دیں تو وہ ایم این اے بن جائے گا"۔

"مگر، غریب کو ووٹ کی طاقت کا شعور نہیں۔ وہ بے چارہ ان سیاست دانوں کی غلامی میں پھنسا ہوا ہے"۔ شیخ آفتاب نے حقیقت بتائی تو فہد حوصلہ افزا لہجے بولا۔

"اب غریب نکلے گا، کم از کم اس علاقے سے تو نکلے گا۔ خیر، ہم اپنی بات کریں"۔

"میرے پاس یہاں زمین نہیں تھی۔ ورنہ میں چوہدری کی پیدا کردہ رکاوٹیں ختم کر دیتا۔ خیر، اُسے چھوڑیں، آپ بتائیں یہ سارے معاملات طے کرنے کے لئے آپ کب آ رہے ہیں ہمارے پاس؟" شیخ آفتاب نے پوچھا تو فہد نے کہا۔

"آپ جب چاہیں۔ ویسے تو ملک نعیم صاحب نے آپ سے بات کر لی ہوگی"۔ فہد نے اپنا عندیہ دیا تو اس نے لمحہ بھر سوچا اور بولا۔

"میں تو کہتا ہوں آج ہی ملاقات ہو جائے، کچھ منظر نکھرے تو باقی باتیں بھی ہو جائیں گی"۔

"چلیں آج ہی سہی، آپ ملک صاحب کے ہاں

پہنچیں، میں بھی وہیں آجاتا ہوں"۔

"میں دو گھنٹے بعد آپ کا وہیں انتظار کروں گا"۔ یہ کہہ کر شیخ آفتاب نے اپنا ہاتھ بڑھایا تو دونوں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ ڈرائیور گاڑی میں بیٹھا۔ وہ بھی، گن مین بھی اور ہاتھ ہلاتے چلے گئے۔ فہد اور سراج نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گئے۔

ملک نعیم کے گھر میں فہد، شیخ آفتاب، ملک نعیم اور سراج بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ شیخ آفتاب کہہ رہا تھا۔ "یہ تو طے ہے ملک صاحب کہ اس علاقے میں فیکٹریاں لگانی ہیں۔ چوہدری جلال نے ہمیشہ مخالفت کی ورنہ میں تو سرمایہ لگانے کو بالکل تیار بیٹھا ہوں"۔

"شیخ صاحب! یہ ٹھیک ہے کہ آپ سرمایہ اپنے منافع کے لئے لگا رہے ہیں۔ لیکن یہ اس علاقے کے لئے ضروری بھی ہے۔ کیونکہ یہاں غربت ہے، بے روز گاری ہے، ہسپتال نہیں، کوئی بڑا سکول نہیں۔ فیکٹریاں لگانے کے ساتھ آپ کو یہ سہولیات دینا ہوں گی"۔ فہد نے کہا تو ملک نعیم بولا۔

"بے شک۔ ابھی تو پہلی ترجیح ہے۔ سرمایہ دار کا منافع عوام میں سے ہو کر آتا ہے"۔

"میں نے سوچا ہے کہ میں نے وہاں سے کئی برس تک منافع نہیں کمانا، سیدھی بات ہے میں نے اپنی ضد پوری کرنی ہے۔ میری زندگی میں صرف چوہدری جلال ہی ایسا شخص آیا ہے، جس نے میری راہ میں رکاوٹیں پیدا کیں۔ خیر! آپ جو بھی اور جیسی بھی شرائط رکھیں جو طے کرنا چاہیں کریں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا"۔ شیخ آفتاب نے واشگاف انداز میں کہہ دیا تو فہد بولا۔

"میری صرف ایک شرط ہے۔ اس علاقے کے لوگوں کی خوشحالی، اور بس۔"

"ہم بھی تو یہی چاہتے ہیں۔ آپ نے سکول کھول کر علاقے پر بہت احسان کیا ہے۔ اب یہ بند نہیں ہونے دیں گے۔ میں نے خود محکمے والوں سے بات کی ہے"۔ ملک نعیم نے کہا۔

"تو پھر طے ہو گیا۔ آپ جیسے چاہیں پیپرز بنوالیں۔ مجھے منظور ہوگا"۔ یہ کہتے ہوئے شیخ آفتاب نے فہد کی جانب ہاتھ بڑھا دیا۔ فہد نے ہاتھ ملایا تو ملک نعیم اور سراج کے چہرے پر مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

☆......☆......☆

صفیہ اپنے گھر میں چارپائی پر بیٹھی دال چُن رہی تھی کہ نعمت علی گھر میں آ گیا۔ وہ اسے گھر میں دیکھ کر مسکرا دیا۔ صفیہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ قریب پڑی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولا

"مجھے معلوم تھا کہ تم کہیں نہیں جاؤ گی۔ تیرا ہمارے سوا ہے کون؟ اچھا کیا تُو نے میری بات مان لی۔ اب تُو چاہے تو یہ گھر اپنے نام لکھوا لینا۔ چوہدری ہمیں یہ گھر دے دیں گے۔"

"بابا! یہ تو کیسی باتیں کر رہا ہے۔ یہ سچ ہے کہ تمہارے سوا ہمارا ہے کون مگر میں یہاں اس لئے نہیں ہوں کہ میں نے اپنے شوہر کے قاتلوں کو معاف کر دیا ہے"۔ صفیہ نے واشگاف انداز میں کہا تو بابا نعمت علی کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ وہ غصے میں بولا۔

"تو پھر تُو یہاں کیوں ہے۔ میں نے تمہیں یہاں سے چلے جانے کو کہا تھا"۔

"چلی جاؤں گی اور اگر چلی گئی تو پلٹ کر بھی واپس نہیں آؤں گی"۔ صفیہ نے کہا۔

"دیکھو صفیہ! تمہارے پاس دو ہی راستے ہیں یا تو چوہدریوں کی بات مان لے اور یہاں پُرسکون زندگی گذار یا پھر در بدر کی ٹھوکریں کھانے کے لئے چلی جا۔ میں بھی مجبور ہو گیا ہوں۔ میں چوہدریوں کے سامنے بہانے بنا بنا کر تھک چکا ہوں۔" بابا نعمت علی نے ہار مانتے

ہوئے کہا تو صفیہ بولی۔

"تو مجبور نہ ہو بابا! میں چلی جاتی ہوں"۔

"تو پھر چلی کیوں نہیں جاتی ہو، یہاں بیٹھی کیا کررہی ہو؟ تم اب میری ذمے داری نہیں ہو"۔ بابا نعمت علی نے چیخ کر کہا۔ آخری لفظ کہتے ہوئے بابا کا گلا رندھ گیا۔ صفیہ نے اس کی جانب دیکھا۔ وہ اٹھ کر باہر کی جانب چلا گیا۔ صفیہ نے اپنے بچوں کی طرف دیکھا پھر دکھ اور حسرت سے بولی۔

"چلو بیٹا! اب ہم یہاں سے چلیں۔ اب ہم یہاں نہیں رہ سکتے"۔

اس نے آنکھوں میں آئے آنسو صاف کیے اور اپنے بچوں کو لے کر باہر نکل گئی۔ وہ سیدھی سلمٰی کے گھر جا پہنچی۔ اس وقت ماسٹر دین محمد صحن میں بیٹھا ہوا تھا جب دروازے میں صفیہ آن کھڑی ہوئی۔ اس کے ساتھ بچے تھے۔ ماسٹر دین محمد کی نگاہ اس کی طرف اٹھی تو بولا۔

"آجاؤ بیٹی، آؤ۔ آجاؤ، وہاں کیوں کھڑی ہو"۔ یہ کہا پھر سلمٰی کو آواز دی، "سلمٰی او پتر سلمٰی"۔

دروازے کی طرف سے صفیہ آگئی تو اندر کی جانب سے سلمٰی وہاں آگئی۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے صفیہ نے کہا۔

"میں آگئی ہوں سلمٰی۔ ہمیشہ کے لئے وہ گھر چھوڑ کر آگئی ہوں"۔

"میں یہ تو نہیں کہتی کہ تم نے اچھا کیا یا برا لیکن یہاں تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ آؤ بیٹھو"۔ سلمٰی نے کہا

"میں محنت مزدوری کروں گی۔ اپنے بچوں کا پیٹ پال لوں میں کوشش کروں گی کہ جلدی......" اس نے کہنا چاہا تو ماسٹر دین محمد نے تحمل سے کہا۔

"او بیٹی! تو بیٹھ کچھ کھا پی لے، پھر یہ باتیں سوچتی رہنا۔ اللہ نے تیرے لئے چھت کا بندوبست بھی کر دیا ہے۔ وہ رزق دینے والا ہے، وہی دے گا۔ تو بیٹھ سب ٹھیک ہوجائے گا"۔

"میرے لئے چھت کا بندوبست؟" صفیہ نے حیرت سے پوچھا تو سلمٰی نے بتایا۔

"ہاں، وہ چاچے عمر حیات والا گھر خالی ہے نا، تُو اپنا سامان اُدھر ہی رکھ لینا۔ اِدھر رہنا چاہو تو بھی ہمیں پریشانی نہیں۔ بس اب تم نے ان باتوں کو نہیں سوچنا۔ تُو بیٹھ میں ان بچوں کے لئے کچھ کھانے کو لاتی ہوں"۔

صفیہ نے تشکر بھرے انداز میں ان دونوں کی طرف دیکھا اور وہیں ایک چارپائی پر بچوں کو لے کر بیٹھ گئی۔

اس وقت سلمٰی دالان میں میز پر کافی سارے کاغذ پھیلائے بیٹھی تھی۔ صفیہ اس کے پاس زمین پر بیٹھی ہوئی اسے دیکھ رہی تھی۔ جب فہد گھر میں آیا۔ اس نے بڑے غور سے اسے دیکھا اور خوشگوار موڈ میں پوچھا

"کیا ہو رہا ہے۔ یہ اتنا بڑا دفتر کیوں لگایا ہوا ہے"۔

"آپ بیٹھیں تو میں آپ کو بتاؤں"۔ اس نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ فہد قریب پڑی کرسی پر بیٹھ کے بولا۔

"بیٹھ گیا اب بولو"۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ صفیہ اپنا گھر چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے اپنے پاس آگئی ہے۔ میں نے اسے سب سمجھا دیا۔ جدھر چاہے رہے"۔

"ٹھیک ہے اور دوسری بات؟" فہد نے پوچھا۔

"میں نے اپنا کام شروع کردیا ہے۔ پہلے میں گاؤں کے ان غریب لوگوں کی لسٹ بنا رہی ہوں جو کسی نہ کسی حوالے سے مدد کے مستحق ہیں۔ بعد میں یہ فیصلہ کریں گے کہ انہیں اپنے پاؤں پر کیسے کھڑا کیا جاسکتا ہے تاکہ وہ اپنی کمائیں اور خود کھائیں"۔ سلمٰی نے بتایا تو فہد

بولا۔

"یہ تو بہت اچھا ہے، جب تک ہم خود انحصار نہیں ہوں گے۔ ان جاگیرداروں کے چنگل سے تو نہیں نکل سکتے"۔

"مسئلہ بھی تو یہیں ہے نا۔ ان کے چنگل سے نکل کر خود انحصاری تک کے درمیان سہارے کی ضرورت ہے، اس پر ہمیں سوچنا ہے اور ان کے لئے کچھ کرنا ہے"۔ سلمیٰ نے گہری سنجیدگی سے کہا تو صفیہ نے پوچھا۔

"میں چائے بناؤں آپ کے لئے؟"

"ہاں بناؤ لیکن ذرا جلدی۔ میں نے ابھی نور پور کے لئے نکلنا ہے۔ یہ استاد جی کدھر ہیں؟"

"ساتھ والے گاؤں، اپنے کسی دوست کے پاس گئے ہیں۔ آپ کہاں گئے ہوئے تھے"۔ سلمیٰ نے پوچھا تو صفیہ ان کے پاس سے اٹھ کر کچن کی طرف چلی گئی۔

"جیسا کام تم کر رہی ہو، ویسا ہی میں کر رہا ہوں۔ دیکھو میں نے چاچے عمر حیات کی زمین اس لئے خریدی ہے کہ اس پر فیکٹری لگاؤں۔ تاکہ لوگوں کو روزگار ملے اور وہ خود انحصار ہو کر چوہدریوں کے چنگل سے نکل آئیں"۔ فہد نے کہا تو سلمیٰ بولی۔

"فیکٹری لگانا کوئی معمولی بات ہے، اس کے لئے بڑا سرمایہ چاہئے؟"

"میرے پاس اتنا سرمایہ ہے کہ ایک کی بجائے دس فیکٹریاں یہاں لگا لوں۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ یہاں کے لوگ بھی میرے ساتھ شامل ہو جائیں"۔

فہد نے جواب دیا تو سلمیٰ نے جلدی سے پوچھا۔

"وہ کیوں؟"

"شیخ آفتاب نے بہت کوشش کی فیکٹری لگانے کی مگر چوہدری نے اس کی چلنے نہیں دی۔ وہ سرمایہ اٹھا کر پھرتا رہا لیکن کسی نے زمین نہ دی۔ اب میں نے زمین خریدی ہے تو وہ میرے ساتھ پارٹنر بننا چاہتا ہے۔ میرے ساتھ مقامی لوگ ہوں گے تو میری ہی قوت میں اضافہ ہو گا نا۔ صبح سے اسی کے ساتھ تھا۔ اب بات آئی سمجھ میں"۔

"جی سمجھ گئی"۔ سلمیٰ نے مسکراتے ہوئے کہا تو فہد لسٹ اٹھا کر پڑھنے لگا۔

☆......☆......☆

حویلی کے ڈرائنگ روم میں بشریٰ بیگم بیٹھی ہوئی تھی۔ رانی اس کے لئے چائے کا مگ لا آئی تو رانی نے وہ مگ اسے تھماتے ہوئے کہا۔

"یہ لیں بیگم صاحبہ!"

"کبیر کہاں ہے؟ ابھی تیار نہیں ہوا؟" بشریٰ بیگم نے مگ پکڑتے ہوئے پوچھا تو رانی بولی۔

"وہ جی، تیار ہو کر ادھر ہی آ رہے ہیں"۔

لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ چوہدری کبیر اندر سے وہیں آ گیا۔ بشریٰ بیگم نے چائے کا سپ لے کر مگ رکھ دیا اور کبیر کی طرف دیکھ کر بولی۔ "کدھر جا رہے ہو؟"

"ڈیرے پر"۔ اس نے کہا اور پھر اپنی ماں کی طرف دیکھ کر بولا۔ "کیوں خیر ہے ماں، جو آپ ایسے پوچھ رہی ہیں آج؟"

"میں نے تم سے بات کرنی ہے۔ بیٹھو"۔

"کہیں!" یہ کہہ کر وہ پاس پڑی کرسی پر بیٹھ گیا تو بشریٰ بیگم نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تیرے بابا سے میری بات ہوئی تھی۔ وہ تمہاری اس سلمیٰ کا نام بھی نہیں سننا چاہتے۔ وہ جانتے ہیں کہ تم صرف ضد میں آ کر اسے اپنی دلہن بنانا چاہتے ہو۔ اس لئے......" بشریٰ بیگم نے کہنا چاہا تو چوہدری کبیر مسکراتے ہوئے ہولے سے بولا۔

"ماں! میں نے ضد کی ہے یا خواہش، میری دلہن سلمیٰ ہی بنے گی، کوئی دوسری نہیں"۔

"تم کون ہوتے ہو اکیلے فیصلہ کرنے والے؟ جو فیصلہ چوہدری صاحب کریں گے وہی ہو گا"۔ بشریٰ بیگم

نے غصے میں پوچھا تو چوہدری کبیر سکون سے بولا۔
"ماں تُو بہت بھولی ہے، شادی اس سے میں نے کرنی ہے فیصلہ بھی میرا ہی ہوگا"۔
"تُو پاگل ہو گیا ہے۔ جو میں کہہ رہی ہوں۔ تم اسے سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کر رہے ہو۔ کیوں فضول بحث کرتے ہو"۔ وہ اکتاتے ہوئے بولی تو چوہدری کبیر نے جذباتی انداز میں کہا۔
"ماں آپ نہیں جانتی ہو۔ وہ میرے لئے کیا ہے"۔
"کیا ہے وہ تمہارے لئے، ذرا مجھے بھی تو معلوم ہو میں اس......" بشریٰ بیگم نے حیرت سے پوچھا تو وہ مزید کہنا چاہتی تھی تو اس نے انگلی کھڑی کر کے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا۔ وہ حیرت اور غصے میں اسے دیکھتی رہی۔ چوہدری کبیر مسکراتا ہوا اٹھ کر بیرونی دروازہ عبور کر گیا۔ رانی اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔

دوپہر سے ذرا پہلے چوہدری جلال صوفے پر بیٹھا سوچ رہا تھا۔ چند لمحے بعد منشی فضل دین وہاں آ گیا۔ وہ چوہدری کی جانب متوجہ ہو کر بولا۔
"چوہدری صاحب! آپ تک جو خبر پہنچی ہے وہ ٹھیک ہے۔ میں نے تصدیق کر لی ہے۔ سیٹھ آفتاب نے وہ جگہ اپنی فیکٹریوں کے لئے پسند کر لی ہے۔ جو فہد نے عمر حیات سے خریدی ہے"۔
"اس کا مطلب ہے سیٹھ آفتاب اب بھی اپنی ضد پر قائم ہے۔ وہ یہاں فیکٹریاں لگانا اب تک نہیں بھولا"۔ چوہدری جلال نے حقارت سے کہا تو منشی بولا۔
"لگتا تو یہی ہے۔ کیونکہ اس نے زمین پسند کر کے فہد سے بات کر لی ہے"۔
"منشی! جب تک یہ فہد یہاں نہیں آیا ان لوگوں کی ہمت نہیں پڑی کہ وہ میری مرضی کے بغیر یہاں فیکٹریاں لگانے کا سوچ سکیں۔ اس فہد نے انہیں رستہ دے دیا ہے۔ یہ ہمارے لئے اچھا نہیں ہے"۔ چوہدری جلال نے سوچتے ہوئے کہا۔
"یہی بات تو یہ ہے چوہدری صاحب! آپ نے شروع ہی سے فہد کے بارے میں غلط اندازہ لگایا۔ نکا چوہدری ٹھیک کہتا تھا۔ اسے یہاں پیر جمانے ہی نہ دینا چاہئے تھے۔ وہ کھلے عام لوگوں کو آپ کے بارے میں بھڑکا رہا ہے۔ اس کا وجود ہمارے لئے بہت بڑا خطرہ بن گیا ہے چوہدری صاحب!" منشی نے اسے باور کرایا۔
"تم ٹھیک کہتے ہو۔ وہ ہمیں ہر طرح سے زچ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں اب سمجھا ہوں کہ وہ ہم سے کس طرح انتقام لینا چاہتا ہے۔ اب اسے یہاں نہیں رہنا چاہئے"۔ چوہدری جلال نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔
"تو پھر جتنی جلدی ہو سکے اس کا کام ہو جانا چاہئے ورنہ مشکل پیدا کرتا چلا جائے گا، وہ ہمارے لئے"۔ منشی نے بڑی خطرناک صلاح دی تو چوہدری جلال اس کی ہاں میں ہاں ملاتا ہوا بولا۔
"ہاں! اب اس کا بندوبست کرنا ہی پڑے گا اس پر ایسے ہاتھ ڈالنا ہے کہ وہ بھڑک نہ سکے"۔
"لیکن آپ پہلے نکے چوہدری والا معاملہ دیکھ لیں"۔ منشی نے یاد دلایا تو چوہدری جلال کو یاد آ گیا۔
"وہ نعمت علی سے پوچھو، اگر اس کی بہو نہیں مانتی تو......"
"میں سمجھ گیا، ان کا یہی حل ہے لیکن اگر میں کہوں کہ فہد ہی ہے جو اس مسئلے کی جڑ ہے۔ تو......" منشی نے سوالیہ نشان چھوڑ دیا تو چوہدری جلال لمحہ بھر توقف کے بعد بولا۔
"اس کے بارے میں میں نے سوچ لیا ہے، بس چند دن مزید ہیں۔ ہاں، ڈرائیور سے کہو گاڑی نکالے، نور پور جانا ہے"۔
منشی نے حکم سن کر اپنا سر ہلایا اور جلدی سے باہر

جانب چلا گیا۔

☆......☆......☆

سہ پہر کے وقت چوہدری جلال اور بشریٰ بیگم دونوں لان میں تھے۔ چوہدری کبیر دھیرے دھیرے چلتا ہوا ان کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ ان دونوں کے چہرے پر تاثر یہی تھا کہ وہ اس سے کوئی اہم ترین بات کرنا چاہ رہے ہیں۔ اس لئے چوہدری کبیر نے پوچھا۔ "جی بابا! آپ نے مجھے بلایا۔ خیریت تو ہے نا"۔

"ہاں، خیریت ہے اگر تم چاہو تو ورنہ شاید نہ ہو سکے"۔ چوہدری جلال نے کسی تاثر کے بغیر کہا۔

"کیا مطلب، ایسی کیا بات ہو گئی ہے؟" چوہدری کبیر سکون سے بولا تو بشریٰ بیگم نے کہا۔

"بات یہ ہے کبیر! وقت ایسا آ گیا ہے جب ہمیں کچھ فیصلے کر لینے چاہئیں ورنہ حالات ہمارے ہاتھ سے ریت کی طرح نکل جائیں گے"۔

"ایسا کیا ہو گیا ہے بابا! آپ لوگ کیوں اتنے پریشان ہیں"۔ چوہدری کبیر نے حیرت سے پوچھا۔

"یہی بات کرنے تمہیں بلایا ہے اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ ابھی نذیر کا معاملہ ختم نہیں ہوا اور تم نے ایک نئی ضد شروع کر دی ہے اور ایسی ضد جسے نہ عقل تسلیم کرتی ہے اور نہ ہماری خاندانی روایات۔" چوہدری جلال نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ بولا۔

"تو میں کون سا اس ماسٹر کی بیٹی کو اس حویلی کی زینت بنانا چاہتا ہوں۔ جس سے ہماری خاندانی روایت ٹوٹ جائے گی"۔

اس نے کہا تو دونوں میاں بیوی چونک گئے۔ تبھی چوہدری جلال نے الجھتے ہوئے پوچھا۔

"کیا مطلب! تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"میں تو فہد کو ذہنی اذیت دینا چاہتا ہوں میں سلمٰی کو اس حویلی میں نہیں لاؤں گا بلکہ نوکرانی بنا کر نور پور میں رکھوں گا۔ اس کی جرأت کیسے ہوئی میرے خلاف نذیر کی بیوی کو بھڑکانے کی"۔ چوہدری کبیر نے حقارت سے کہا تو چوہدری جلال نے سوچتے ہوئے کہا۔

"ہوں، تو یہ سوچ ہے تمہاری؟"

"کیونکہ آپ فہد کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں کو صرف فہد کی وجہ سے اتنا حوصلہ ملا ہے کہ وہ ہمارے خلاف سر اٹھا سکیں۔ اور یہ جو حالات ہمارے خلاف ہو رہے ہیں۔ صرف اور صرف اسی وجہ سے ہیں"۔ چوہدری کبیر نے اپنے باپ کو دلیل دی۔

"کبیر! تم نہیں سمجھتے ہو۔ وقت کا تقاضا یہ ہے کہ اگر اسے راستے سے ہٹاتے ہیں نا تو پھر ہمارے پاس حالات سدھارنے کا بھی موقعہ نہیں رہ جاتا۔ شاید تم نہیں جانتے اس نے بچپن سے لے کر اب تک ہمارے خلاف ہی قوت جمع کی ہے"۔ چوہدری جلال نے کہا۔

"تو پھر فیصلہ کر لیں۔ ہمیں کیا کرنا ہے۔ یوں حالات کو ہاتھ سے نکلتے دیکھتے رہیں یا پھر ان پر قابو پا لیں"۔ چوہدری کبیر نے پوچھا چوہدری جلال دھیمے سے لہجے میں بولا۔

"ان حالات پر قابو پانا ہی ہو گا کبیر!"

"تو بس پھر، میں جو کرتا ہوں، مجھے کرنے دیں"۔ چوہدری کبیر نے مسکراتے ہوئے کہا تو بشریٰ بیگم تیزی سے خوف زدہ لہجے میں بولی۔

"خدارا کچھ ایسا نہ کرنا جو ہمارے لئے نئی مصیبت بن جائے میرے بیٹے، پہلے ہی ہم بہت اذیت سے گزر رہے ہیں بہت ہو چکا یہ خون خرابہ"۔

"ماں! فیصلہ ہو چکا ہے"۔ چوہدری کبیر نے حتمی لہجے میں کہا اور اٹھ کر اندر کی جانب بڑھ گیا۔ بشریٰ بیگم کے چہرے پر اذیت بھرے جذبات ابھر آئے تھے، اسے یہ فیصلہ پسند نہیں آیا تھا۔

☆......☆......☆

اسی شام وکیل جمیل اختر حویلی کے ڈرائنگ روم میں تھا۔ چوہدری جلال نے اسے بلوایا تھا کہ یہ اچانک ملک نعیم کیسے سر اٹھانے لگا ہے، یہاں تک کہ اس کے ساتھ فہد اور شیخ آفتاب جیسے لوگ بھی آن ملے تھے؟ وہ اس سوال کا جواب چاہتا تھا کہ آخر ایسا کیا ہو گیا ہے کہ وہ مضبوط ہو رہے ہیں۔ وہ قدرے غصے میں بات کر رہا تھا۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے وکیل صاحب! ہم پُرکھوں سے یہاں پر سیاست کر رہے ہیں۔ آج تک علاقے میں ہماری اتنی مخالفت نہیں ہوئی جتنی اب ہو رہی ہے؟ لوگ جگہ جگہ بیٹھ کر ہمارے ہی خلاف باتیں کر رہے ہیں"۔

"چوہدری صاحب! ایسا تبھی ہوتا ہے جب کسی بھی سیاست دان کی اپنے حلقے میں سیاسی گرفت کمزور ہو جائے۔ مفاد پرست تو کچھ بھی نہ ہونے سے بہت کچھ بنا لیتے ہیں۔ دیکھنا یہی ہو گا کہ سیاسی گرفت کمزور کیوں ہو گئی؟" وکیل نے بڑے تحمل سے کہا۔

"کیوں ہو گئی، آپ سب کا خیال کیا ہے؟" اس نے بھی کافی حد تک تحمل سے پوچھا۔

"یہ لوگ آپ کو کیا بتائیں، انہوں نے تو وہی کیا ہے جو آپ نے کہا۔ ان کے پاس ووٹ تو ہیں لیکن وہ صلاحیت نہیں جس سے بدلتے ہوئے حالات کا رخ دیکھ سکیں۔ کیا آپ نے علاقے کے ان بااثر لوگوں سے رابطہ رکھا جو اپنے طور پر چھوٹی چھوٹی قوتیں ہیں؟" وکیل نے پوچھا۔

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں وکیل صاحب! نور پور کے چھوٹے موٹے کاموں سے لے کر اسمبلی تک چھوٹے بڑے اداروں میں ان کے کام نکلوائے ہیں، سفارشیں کی ہیں، نوکریاں دلوائیں ہیں، جائز اور ناجائز سارے کام ہوتے ہیں...... اور رابطہ کیسے ہوتا ہے؟" چوہدری جلال نے الجھتے ہوئے کہا تو وکیل بولا۔

"چوہدری صاحب! میں بار بار عرض کرتا رہا ہوں کہ اب سیاست اور حالات کا رُخ بدل گیا ہے، اب عوام کو شعور ہے۔ کامیاب وہی ہو گا جو عوامی خدمت کرے گا، اسی کے ہاتھ میں سیاسی گرفت ہو گی"۔

"وکیل صاحب! میں آپ کی اسی بات سے اختلاف کرتا آیا ہوں۔ میں چاہوں تو ایک ہی دن میں پانسہ پلٹ کر رکھ دوں بس چند بندوں کو قابو کرنے کی بات ہے۔ یہ نہ عوامی شعور سے ہو گا اور نہ عوامی خدمت سے۔ میرے خیال میں اصل معاملہ یہ ہے کہ مفاد پرست لوگ سیاسی بلیک میلنگ پر اتر آئے ہیں۔ کیا خیال ہے؟"

یہ سن کر وکیل کا چہرہ اتر گیا۔ اس نے تحمل سے کہا۔

"آپ درست کہہ رہے ہیں لیکن غلط میں بھی نہیں کہہ رہا۔ علاقے کی چھوٹی چھوٹی قوتوں کو ساتھ لے کر ہی چلنا ہو گا"۔

"آپ کا کیا خیال ہے ملک نعیم یہ جو اپنے ہونے کا ناکام ثبوت دے رہا ہے، میں اس سے گھبرا جاؤں؟ آپ اپنا گروپ مضبوط کریں، میں علاقے کی سیاست کو خود دیکھتا ہوں"۔ چوہدری جلال نے کہا تو وکیل بولا۔

"جیسے آپ کی مرضی، میں آپ کو نور پور کی صورت حال بارے بتا دیتا ہوں، پھر جیسا آپ کہیں ویسا ہی ہو گا"۔

وہ دونوں باتیں کرنے لگے۔

وکیل چلا گیا تو چوہدری جلال نے بہت دیر تک سوچتا رہا۔ اسے اپنی تمام تر مشکلات کی وجہ صرف اور صرف فہد ہی لگا۔ اس کے یہاں آنے ہی سے حالات اس کے قابو میں نہیں رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ سب کچھ اس کے ہاتھ سے نکل جائے، اس نے فہد ہی کو راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا۔ اسی رات چوہدری جلال اپنے ڈیرے پر جا پہنچا۔ جیسے ہی اس کی گاڑی رکی اس کے پیچھے ہی ایک اور کار آن رکی۔ اس میں سے ایک نوجوان نکلا، جس نے جین اور لیدر جیکٹ پہنی ہوئی تھی۔

اس کا چہرہ کافی حد تک ڈھکا ہوا تھا۔ چوہدری جلال نے اس کی طرف غیر جذباتی انداز میں دیکھا تو کاشی نے مسکراتے ہوئے اس سے ہاتھ ملایا۔ چوہدری جلال نے غیر جذباتی انداز میں کہا۔

"بہت عرصے بعد ملاقات ہوئی ہے کاشی!"

"آپ نے یاد ہی اتنے عرصے بعد کیا ہے۔ اس دوران آپ کو کام نہیں پڑا، آج کام پڑا تو آپ نے بلوا لیا"۔ کاشی نے بہت سنجیدگی سے جواب دیا۔

"ہاں تمہاری یاد، خیر معاملہ ہی کچھ ایسا آ پڑا ہے، میں تو سیدھے سیدھے اس کا حل کر لیتا لیکن یہ سیاست درمیان میں آ گئی۔ دونوں کی ٹکر میں معاملہ ہاتھ سے نکلتا جا رہا ہے۔" چوہدری جلال نے اپنی الجھن بتائی تو کاشی سکون سے بولا۔

"ہم کس لئے ہیں چوہدری صاحب! ہم حاضر ہیں۔ بولیں، آپ کے مقابلے میں کوئی اور سیاست دان آ گیا ہے کیا؟"

"ایک چھوٹا سا سیاست دان تو پہلے ہی تھا لیکن اس کے علاوہ ایک غیر اہم سا بندہ ہے جسے شروع میں میں نے اہمیت ہی نہیں دی تھی۔ اب وہ درد سر بن گیا ہے۔" چوہدری نے کہا تو کاشی لاپرواہی سے بولا۔ "اب میں آ گیا ہوں نا، سکون ہو جائے گا۔ کہیں تو آج رات ہی اس کا کام کر دیتا ہوں"۔

"نہیں! اتنی بھی جلدی نہیں ہے۔ تم آؤ نا، سکون سے بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ معاملہ یہاں کا ہی نہیں نور پور کا بھی ہے۔ میں تمہیں تفصیل سے سمجھا دیتا ہوں۔ آؤ"۔ چوہدری جلال نے کہا اور کاشی کو لے کر اندر کی جانب بڑھ گیا

☆......☆......☆

جعفر اپنے آفس میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ جب سے مائرہ یہاں سے ہو کر گئی ہے، اس کی اپنی ذات میں بہت تبدیلی آ گئی تھی۔ اسے یہ تو کنفرم ہو گیا تھا کہ مائرہ اس کے بلاوے سے زیادہ فہد کی کشش میں وہاں تک کھنچی چلی آئی ہے۔ وہ یہ سب جانتے ہوئے بھی مایوس نہیں تھا، اسے ہلکا سا دکھ ہو رہا تھا کہ جا کر اس نے فون بھی نہیں کیا تھا۔ تب اس نے سوچا اگر اس نے فون نہیں کیا تو وہ خود کر لے۔ یہ سوچ کر وہ مسکرا دیا۔ اس نے اپنا فون اٹھایا اور مائرہ کے نمبر ڈائل کر دیئے۔ لمحوں میں اس سے رابطہ ہو گیا۔ حال احوال کے بعد اس نے پوچھا۔

"کیسا لگا تمہیں فہد کا گاؤں؟" نا چاہتے ہوئے بھی اس کے لبوں سے نکل گیا تو مائرہ نے کچھ بھی محسوس نہ کرتے ہوئے پُر جوش انداز میں کہا۔

"میں سوچ رہی ہوں جعفر کہ وہاں کچھ دن رہ کر زبردست سی رپورٹ بناؤں۔ ہم ترقی کی بات کرتے ہیں، لیکن کہاں ہے ترقی؟ میں اس علاقے کو مثال کے طور پر پیش کروں گی۔ وہاں انسان بستے ہیں، کیا جدید دنیا کی سہولتوں پر ان کا کوئی حق نہیں؟"

"تمہیں یاد ہے مائرہ۔ مجھے تم نے یہ بات پہلے بھی کہی تھی لیکن اس وقت تمہارے لہجے میں یہ شدت نہیں تھی۔ ہمارا میڈیا بھی ابھی تک عوام کے ان مسائل تک نہیں پہنچ سکا جس پر شعور دینا چاہئے۔ خیر، تم نے تبصرہ نہیں کیا؟" جعفر نے خود پر قابو پاتے ہوئے پوچھا تو مائرہ نے سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

"جعفر! کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے انسان سامنے پڑی ہوئی شے کو نہیں سمجھ پاتا، یونہی خواہ مخواہ الجھن کا شکار رہتا ہے، اس کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر پاتا"۔

"تم کہنا کیا چاہ رہی ہو، کیا الجھن ہے، کسے سمجھ نہیں پاتی ہو؟" جعفر نے پوچھا۔

"بعض اوقات حالات ایسے بن جاتے ہیں۔ جس سے ہمارے اپنے ہی بدگمان ہو جاتے ہیں۔ مجھے یہ بتاؤ ہمیں اپنوں کی بدگمانی دور کر دینی چاہیے نا؟" جواب

دینے کی بجائے اس نے سوال کر دیا جس پر جعفر بولا۔

"بالکل، کیوں نہیں، اپنوں کے درمیان الجھن نہیں ہونی چاہیے۔ کوئی بھی تعلق ہو اس میں کوئی ابہام نہیں ہونا چاہئے، اسے صاف ہونا چاہئے"۔

"میرا اور تمہارا تعلق کیا ہے۔ تم میرے بہت اچھے دوست ہو۔ اس کے علاوہ ہمارے درمیان کوئی تعلق نہیں اور ....." مائرہ نے کہنا چاہا تو جعفر تیزی سے بات کاٹ کر شکوہ بھرے لہجے میں بولا۔

"نہیں مائرہ ہم فقط دوست ہی نہیں کچھ اور بھی ہیں۔ یہ بات تمہیں اب تک سمجھ آ جانی چاہئے تھی۔ ضروری تو نہیں ہوتا کہ اظہار ہی کیا جائے"۔

"کیوں، کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہمارے درمیان کچھ اور تعلق ہے، اظہار مطلب؟" مائرہ نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں مائرہ! میں تمہیں چاہتا ہوں اور میں تمہارے سامنے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں"۔ جعفر نے ہمت کر کے اظہار کر دیا تو مائرہ نے چونک کر حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"جعفر! تم یہ سوچ بھی کیسے سکتے ہو کیا! تمہیں نہیں معلوم کہ میں فہد سے محبت کرتی ہوں، اسے چاہتی ہوں؟"

"مگر میں جانتا ہوں کہ وہ تمہیں کبھی نہیں اپنائے گا۔ وہ اب لوٹ کر کبھی واپس نہیں آئے گا۔ اس نے اپنی الگ سے دنیا بنا لی ہے۔ یہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ آئی ہو"۔ جعفر نے اسے بتایا تو وہ غصے میں بولی۔

"نہیں جعفر، تم فہد کی بات نہیں اپنی بات کہو، میں تو تمہیں ایک دوست سمجھتی تھی اور تم کیا سوچتے رہے، تم نے میرے اعتماد کو دھوکا دیا۔ تم وہ جعفر نہیں ہو، اب تم مجھ سے ملنے کی کوشش مت کرنا۔ میں نہیں چاہتی کہ میں......"

وہ کہہ نہیں پائی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

جعفر بے بسی سے اس کی طرف سے رونے کی آواز سنتا رہا۔ اچانک فون بند ہو گیا۔ اس نے فون کو بے بسی سے دیکھا پھر ایک طرف اچھال دیا۔ وہ بہت مایوس ہو گیا تھا۔

رات گہری ہوتی چلی جا رہی تھی۔ دھیمی روشنی میں مائرہ اپنے بیڈ روم میں سوچتی چلی جا رہی تھی۔ اسے جعفر کا جذباتی پن یاد آ رہا تھا۔

"ہاں مائرہ! میں تمہیں چاہتا ہوں۔ اور میں تمہارے سامنے جھوٹ نہیں بول سکتا...... مگر میں جانتا ہوں کہ وہ تمہیں کبھی نہیں اپنائے گا۔ وہ اب لوٹ کر کبھی واپس نہیں آئے گا۔ اس نے اپنی الگ سے دنیا بنا لی ہے...... میں جھوٹ نہیں بولتا اور پھر تم سے تو غلط بیانی کر ہی نہیں سکتا یہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ آئی ہو"۔

مائرہ نے اذیت سے اپنے بالوں میں انگلیاں پھیریں اور بڑبڑاتے ہوئے بولی۔

"یہ تم کیا سوچ رہے ہو جعفر! مجھے تو فہد کا انتظار کرنا ہے اور مجھے یقین ہے وہ لوٹ کر ضرور آئے گا"۔

"اگر نہ آیا تو؟"

جعفر کی بات ٹھیک ہوئی تو کیا میں جعفر جیسا دوست بھی گنوا بیٹھوں گی...... یا خدایا! میں کس دوراہے پر آن کھڑی ہوئی ہوں، مجھے کیا کرنا چاہئے، کیا مجھے اپنا آپ حالات کے دھارے پر چھوڑ دینا چاہئے؟ مجھے کوئی نہ کوئی تو فیصلہ کرنا ہو گا۔ میں فہد کو چاہتی ہوں اور جعفر مجھے...... میں کیا کروں؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا"۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی کنپٹیوں کو دبایا اور پھر بے بس سی ہو کر اپنے بیڈ پر ڈھیر ہو گئی۔

جعفر اپنی سرکاری رہائش گاہ میں اپنے بیڈ پر پڑا سوچتا چلا جا رہا تھا۔ اسے یہ تو پتہ تھا کہ مائرہ ناراض ہو گئی ہے لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کا اب ردعمل کیا ہو گا۔ وہ یہ سوچ کر ہی کرب سے گزر جاتا کہ وہ اس کا ساتھ چھوڑ جائے گی۔ وہ اس سے بات کرنا چاہتا تھا، اس نے کئی بار

نمبر بھی ملائے لیکن ہر بار رک گیا۔ تبھی اسے کچھ نہ سوجھا تو اس نے ملک نعیم کے نمبر ملا لئے۔ رابطہ ہو جانے پر جعفر نے پوچھا۔

"سنایئے کیا حال ہے، کیسے چل رہی ہے آپ کی سیاست اور کیا کہتا ہے آپ کا علاقہ؟"

"سب ٹھیک ہے اور بہت اچھا ہے۔ چوہدری کے خلاف جو نفرت ہے۔ لوگ اسی وجہ سے میرے قریب آنے کی کوشش کر رہے ہیں اور میں انہیں اپنے قریب کرنے کی کوشش کر رہا ہوں"۔ ملک نعیم نے خوش ہوتے ہوئے کہا تو جعفر بولا۔

"ہاں یہ جو جاگیرداری سسٹم میں لوگ ہیں نا، یہ فقط چند لوگوں کو نواز کر اپنا مطلب نکالتے ہیں۔ دراصل وہ حاکمیت چاہتے ہیں۔ ایسی حاکمیت جس میں کم از کم عوام کی بھلائی نہیں ہوتی۔ آپ کا علاقہ تو زیادہ تر دیہاتی ہے"۔

"ہاں، زیادہ دیہاتی ہے، میں کام کر رہا ہوں وہاں پر فہد کی وجہ سے میں جلدی کامیابی حاصل کر لوں گا"۔ ملک نعیم نے حوصلہ افزا انداز میں کہا تو جعفر بولا۔

"اس کی وجہ سے کیسے، وہ کیسے؟"

"اس نے بڑی تیزی سے اپنے گاؤں قسمت پور اور پھر اردگرد کے علاقے میں اپنا اثر و رسوخ بنایا ہے۔ گو چوہدری نے جو اپنا خوف برسوں سے لوگوں پر مسلط کیا ہے۔ اسے ختم کرنے میں کچھ تو وقت لگے گا۔ وہ جو یہاں میرے حامی اور سپورٹر تھے۔ اس کے لئے بھی وہ بہت اہم ثابت ہو رہا ہے"۔ ملک نعیم نے بتایا۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے میں نے کہا تھا نا کہ وہ آپ کے لئے بہت اہم ہوگا"۔ جعفر نے کہا تو ملک نعیم بولا۔

"اصل میں یہ ایک نئی لہر کی وجہ سے بھی ہے لوگ سابقہ چہروں کو ان کے کاموں کو دیکھ کر اکتا چکے ہیں، وہ نئی سوچ چاہتے ہیں، نئی قیادت چاہتے ہیں"۔

"وہ اس لئے ملک صاحب کہ نسل نئی آگئی ہے، انہیں وقت کی تبدیلی کا شعور ہے، وہ اپنے اردگرد بھی تبدیلی چاہتے ہیں"۔ جعفر نے تبصرہ کیا تو ملک نعیم بولا۔ "اصل میں یہ وقت ہی تو ہے جو سب کچھ بدل دیتا ہے لوگ کب تک ان کرپٹ سیاست دانوں کو مقدس گائے بنا کر رکھیں جب وہ عوام کے لئے کچھ نہیں کریں گے تو عوام بھی انہیں ووٹ نہیں دیں گے"۔

"یہ تبدیلی تو ایک فطری عمل ہے"۔ وہ بولا۔

"بس اب تو الیکشن کا انتظار ہے مجھے یقین ہے کہ اس سے پہلے سب ٹھیک کر لوں گا"۔ ملک نعیم نے کہا۔

"میرے لائق جو بھی ہو تو مجھے بتایئے گا۔ اچھا اب اجازت۔ اللہ حافظ!" جعفر نے اچانک کہا۔

"ضرور بتاؤں گا۔ اللہ حافظ" ملک نے کہا تو جعفر نے فون بند کر دیا۔ اس نے تو سوچا تھا کہ کچھ دل بہل جائے گا مگر وہاں باتیں ہی دوسری شروع ہو گئی تھیں۔

وہ اپنے کمرے میں صوفے پر بیٹھا سوچ رہا تھا۔ اسے بہت سارے خیال آ رہے تھے۔ اسے فہد کی بات یاد آ رہی تھی کہ مائرہ کا بہت خیال رکھنا، میرے جانے کے بعد سب کچھ اطمینان سے بتا دینا کہ میرا گاؤں جانا کتنا ضروری ہے۔ بس وعدہ کرو، جو تمہیں کہا ہے وہی کرو گے۔ پھر اسے مائرہ کی بات یاد آئی جو اسے بہت دکھ دے رہی تھی کہ تم یہ سوچ بھی کیسے سکتے ہو، کیا تمہیں نہیں معلوم کہ میں فہد سے محبت کرتی ہوں، اسے چاہتی ہوں۔ وہ اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا۔

"مائرہ سے اپنے من کی بات کہہ کر، اپنے جذبات کا اظہار کر کے، میں نے کہیں غلطی تو نہیں کی؟ وہ کیا سوچے گی۔ یہی کہ میں نے اس کی دوستی کا غلط مطلب لیا۔ میں جو اس کے خواب دیکھتا رہا ہوں۔ اس کی چاہت کو اپنے دل میں لئے پھرتا ہوں، کیا میں غلط ہوں یا فہد کی

چ. ت میں ڈوبی مائرہ کا انتظار کرتے ہوئے وقت ضائع کر رہا ہوں۔ مجھے کیا کرنا چاہئے کوئی فیصلہ کر لینا چاہئے یا پھر خود کو حالات پر چھوڑ دینا چاہئے"۔

اس نے تنگی سے آنکھیں موند کر صوفے سے ٹیک لگا لی۔ وہ بہت دل برداشتہ ہو چکا تھا۔

جعفر صوفے پر نیم دراز نہ جانے کب سو گیا تھا۔ اس کے منہ پر کتاب تھی۔ رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا کہ اس کے فون کی بیل بجی۔ اس نے بےزاری سے فون اٹھا کر اسکرین دیکھا تو یوں چونکا کہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ کال رسیو کر کے جلدی سے بولا

"یس مائرہ، تم، اس وقت؟"

"ہاں، میں اور کیا اس وقت میں تمہیں فون نہیں کر سکتی؟" مائرہ نے عام سے لہجے میں کہا۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں۔ بس وہ تم بھی جانتی ہو"۔ اس نے الجھتے ہوئے جواب دیا تو وہ سنجیدگی سے بولی۔

"دیکھو! ہم بہت اچھے دوست ہیں اور دوستوں میں غلط فہمیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اچھے دوست تو وہی ہوتے ہیں نا، اپنی غلط فہمیاں دور کر لیں۔ اس میں کوئی شرمندگی والی بات نہیں ہے"۔

"کیا چاہتی ہو تم؟" جعفر نے اسی الجھن میں پوچھا تو مائرہ نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"کچھ نہیں۔ بس اتنا چاہتی ہوں کہ ہم دونوں نے جو اپنے دل میں چھپا چھپا کر باتیں رکھی ہوئی ہیں، وہ ہمیں ایک دوسرے سے کہہ دینی چاہئیں۔ ہمارے درمیان کوئی نیا تعلق بنتا ہے یا نہیں۔ اہمیت اس کی نہیں بلکہ ہمارے لئے اہم یہ ہونا چاہئے کہ ہماری دوستی پہ کوئی حرف نہ آئے"۔

"اگر تم ایسا سوچتی ہو تو پھر میرے ضمیر پر جو اتنا بوجھ ہے وہ اتر جائے گا۔ اس میں شک نہیں کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور ہمیں یہ طے کرنا ہو گا کہ آخر ہمارے درمیان تعلق کی نوعیت کیا ہے"۔ جعفر نے سنجیدگی سے کہا۔

"جعفر! میں تم سے آج طے نہیں کروں گی۔ بلکہ کبھی بھی نہیں طے نہیں کروں گی۔ ہم اسے وقت پر چھوڑ دیتے ہیں پلیز......" اس نے منت بھرے انداز میں کہا تو جعفر سکون سے بولا۔

"او کے، اب یہ طے ہے کہ ہم نے کبھی آپس میں ایسی کوئی بات ہی نہیں کی تھی۔ اور سناؤ کیسی ہو؟"

"اب میں پُر سکون ہوں اور سکون سے سو پاؤں گی۔ باقی باتیں صبح کریں گے"۔ مائرہ نے کہا اور فون بند کر دیا۔ جعفر نے فون ایک طرف رکھا اور بیڈ پر جا لیٹا۔ بات کر کے وہ اچھا محسوس کر رہا تھا۔

☆......☆......☆

صبح کی نماز کے بعد ماسٹر دین محمد گلی میں چلتا آ رہا تھا۔ ایسے میں سامنے سے ایک عورت آ گئی۔ وہ قریب آ کر رکی جیسے وہ اس سے بات کرنا چاہ رہی ہو۔ ماسٹر دین محمد رک گیا تو وہ عورت بولی۔

"ماسٹر جی۔ کیا حال ہے آپ کا؟"

"میں ٹھیک ہوں بہن! تو سنا گھر میں سب ٹھیک ہیں نا؟" ماسٹر دین محمد نے سکون سے پوچھا تو وہ عورت بولی۔

"سب ٹھیک ہیں۔ ویسے ماسٹر جی۔ میں کئی دنوں سے سوچ رہی تھی کہ آپ کی طرف آؤں۔ میں نے آپ سے ایک بات کرنا تھی"۔

"خیر تو ہے نا بہن۔ ایسی کیا بات کرنا تھی"۔ اس نے پوچھا تو وہ عورت شکوہ بھرے لہجے میں بولی۔

"دیکھیں نا۔ میں تو وہی کہوں گی۔ جو آپ کے فائدے کی بات ہو۔ گاؤں میں لوگ بڑی باتیں بنا رہے ہیں۔ ایسا کچھ کہتے ہیں کہ بس توبہ ہی بھلی"۔

"ایسا کیا کہتے ہیں؟" ماسٹر دین محمد نے حیرت

سے پوچھا تو اس عورت نے انتہائی طنزیہ لہجے میں کہا۔

''یہی کہ ایک جوان جہان لڑکا آپ کے گھر میں رہتا ہے۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ اور اگر اسے رکھنا آپ کی مجبوری ہے کہ وہ آپ باپ بیٹی کو کھلاتا پلاتا ہے، روپیہ پیسہ دیتا ہے تو پھر آپ کیوں نہیں فہد کی شادی سلمٰی سے کر دیتے؟''

یہ سن کر ماسٹر دین محمد چونک گیا۔ اس نے خود پر قابو رکھا اور بڑے تحمل سے پوچھا۔

''ایسا کون کہتا ہے؟''

''سارے گاؤں والے۔ کسی کی زبان تو نہیں روکی جا سکتی۔ ویسے آپ کو پریشان ہونا بھی نہیں چاہیے، یہ صلاح ہے بھی ٹھیک۔ نہ ہینگ لگے نہ پھٹکری، رنگ بھی چوکھا آئے۔ کوئی خرچہ نہیں اور بیٹی بیاہ دو۔ فہد گھر جوائی بھی رہے گا۔'' اس عورت کے لہجے میں طنز کے ساتھ حقارت بھی تھی۔ تبھی ماسٹر دین محمد نے تحمل سے جواب دیا۔

''یہ جو کچھ بھی کہہ رہے ہیں بالکل غلط کہہ رہے ہیں''۔

''دیکھیں نا ماسٹر جی آپ سیانے بندے ہیں، بھلا بتائیں جوان جہان لڑکی گھر میں ہے تو پھر جب ایک جوان جہان لڑکا گھر میں جب چاہے آئے، جب چاہے جائے کوئی روک ٹوک نہیں تو پھر اس پر اگر لوگ باتیں بنائیں، وہ کیسے غلط ہو گئیں بھلا؟''

''فہد میرے بیٹوں کی طرح ہے''۔ ماسٹر دین محمد نے خود پر قابو رکھتے ہوئے کہا حالانکہ اسے شدید غصہ آ رہا تھا تبھی وہ عورت تنک کر بولی۔

''ہوگا، پر سگا تو نہیں ہے۔ اب دیکھیں نا، اس کا کون سا اپنا گھر نہیں ہے پھر کیوں دن رات آپ کے گھر میں پڑا رہتا ہے؟ اب یہ مت کہیے گا کہ وہ سلمٰی پر اپنی دولت نہیں وار رہا''۔

''بہت برا کہہ رہے ہیں لوگ''۔ ماسٹر دین محمد نے کہا۔

''بالکل جی، جب وہ اکٹھے گاؤں میں اکیلے ادھر ادھر گھومیں پھریں گے ساتھ ساتھ دکھائی دیں گے تو یہی سوچیں گے نا کہ ان میں کوئی خاص ہی تعلق ہے۔'' اس عورت نے ماسٹر کے بدلتے چہرے کو دیکھا اور پھر جلدی سے بولی، ''خیر! اس وقت تو مجھے جلدی ہے میں پھر آؤں گی پھر تب تفصیل سے بات کروں گی۔ اللہ حافظ''۔

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔ ماسٹر چند لمحے وہیں ساکت کھڑا رہا پھر قدم بڑھاتا ہوا چل دیا۔ اس کی چال میں قطعاً اعتماد نہیں رہا تھا۔

ماسٹر دین محمد صحن میں آ کر چارپائی پر ڈھے جانے والے انداز میں بیٹھا۔ سلمٰی کچن میں تھی، وہ پانی کا گلاس لے کر آئی اور وہ اسے تھماتے ہوئے پوچھا۔

''ابا جی! ناشتہ لاؤں، آپ کے لئے؟''

''نہیں پتر! تو بس میرے لئے ایک چائے کی پیالی لے آ''۔ ماسٹر دین محمد نے کہا تو سلمٰی نے گہری نگاہوں سے دیکھا اور پھر دھیرے سے اپنے باپ کے پاس بیٹھ کر پوچھا۔

''ابا جی! کیا بات ہے، آپ نے ٹھیک طرح سے بات نہیں کی، آپ کا لہجہ آپ کا ساتھ نہیں دے رہا، کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں پتر۔ بعض اوقات انسان ایسے موڑ پر آن کھڑا ہوتا ہے جہاں پر لفظ گنگ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ کہنے والی بات بھی کہی نہیں جا سکتی''۔ ماسٹر دین محمد نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا تو سلمٰی بولی۔

''ابا جی! ایسی کون سی بات ہے جو آپ مجھ سے بھی کہہ نہیں پا رہے ہیں؟ مجھے نہیں یاد پہلے کبھی ایسا وقت ہم پر آیا ہو کہ ہم بات ہی نہ کر سکیں''۔

''یہ بات ہی ایسی ہے پتر! بتانا بھی چاہتا ہوں

لیکن کہہ نہیں پارہا ہوں"۔ وہ بے چارگی سے بولا۔

"آپ کہہ دیں اور آپ کو یہ بات کہنا ہوگی۔ کیا میں آپ کے کرب کا اندازہ نہیں کرسکتی؟" سلمٰی نے دکھی لہجے میں کہا تو ماسٹر دین محمد بہت مشکل سے بولا۔

"تو پھر سنو!" یہ کہہ کر اس نے عورت والی بات سلمٰی سے کہہ دی۔ سلمٰی نے بڑے تحمل سے بات سن کر کہا۔

"ابا جی! جب سے فہد آیا ہے مجھے اسی بات کا ڈر تھا۔ آپ فہد سے کچھ نہیں کہیں گے، میں خود اس سے بات کرلوں گی"۔

"کیا کہو گی اس سے؟ مجھے اس کی ناراضگی کا ڈر نہیں لیکن ان حالات میں اس کا دل نہیں ٹوٹنا چاہیے۔ ہمارے سوا اس کا ہے کون، یہاں پر؟ وہ دشمنوں سے نبرد آزما ہے اس وقت"۔ ماسٹر دین محمد نے سسکتے ہوئے کہا تو سلمٰی نے اسے حوصلہ دینے والے انداز میں کہا۔

"میں سمجھتی ہوں ابا جی! مجھے کیا کرنا۔ میں آپ کے لئے ناشتہ لاتی ہوں"۔ سلمٰی یہ کہتے ہوئے اٹھ گئی اور ماسٹر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ یہ ان کے لئے ایک نیا امتحان تھا۔

☆......☆......☆

سہ پہر کا وقت تھا۔ ملک نعیم کے ہاں سے واپسی پر فہد ماسٹر دین محمد کو خوشخبری دینا چاہتا تھا۔ وہ گھر میں آیا تو سنسان گھر دیکھ کر ایک لمحے کو ٹھٹکا۔ وہ انگلی میں کار کی چابی گھمارہا تھا، اسے روک کر اس نے سنسان دالان کو دیکھا۔ تبھی اجنبی چہرہ لئے سلمٰی اندر سے دالان میں آئی۔ فہد طویل سانس لے کر دالان میں چلا گیا پھر کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا

"یہ آج معمول سے ہٹ کر اتنی خاموشی کیوں ہے۔ استاد جی کدھر ہیں؟"

"آگئے آپ؟" سلمٰی نے اجنبی لہجے میں پوچھا۔

"تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا اور یہ تم کس اجنبی لہجے میں مجھ سے بات کررہی ہو؟" فہد نے چونک کر پوچھا تو سلمٰی نے اسی کھردرے لہجے میں جواب دیا۔

"فہد! میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ میں سب کچھ برداشت کرسکتی ہوں لیکن جب بات میری عزت تک آئے گی تو وہ میں برداشت نہیں کرپاؤں گی"۔

"تم کیا کہنا چاہتی ہو؟ صاف لفظوں میں کہو"۔ فہد نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا تو سلمٰی بولی۔

"یہی کہ آپ اب اس گھر میں مت آیا کریں"۔ اس نے بڑی مشکل سے کہا جس پر فہد نے اسے غور سے دیکھا اور بڑے تحمل سے کہا۔

"سلمٰی! میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ کیوں؟ گھر تمہارا ہے تم کہہ رہی ہو لیکن بس مجھے اتنا بتا دو کیا استاد جی بھی ایسا ہی چاہتے ہیں؟"

"ہاں، وہ بھی چاہتے ہیں"۔ اس نے بہ مشکل کہا تو فہد چند لمحے خاموشی کے بعد پوچھا۔

"سلمٰی! میں سمجھ لوں کہ وہ جنگ جو ہم لڑ رہے تھے، کیا اب مجھے وہ تنہا لڑنا ہوگی؟"

"نہیں، میں آپ کے ساتھ برابر کھڑی ہوں۔ اس وقت تک جب تک ہمیں کامیابی نہیں مل جاتی یا پھر میرا وجود ختم ہوجائے گا"۔

"میرے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ میں جانتا ہوں تعلق کے لئے ملنا ضروری تو نہیں ہوتا"۔ فہد نے مسکراتے ہوئے کہا اور اٹھ گیا۔ اس نے لمحہ بھر کو اس کی طرف بھرپور نگاہوں سے دیکھا اور مڑ کر چلا گیا۔ سلمٰی نے ایک بار ہاتھ بڑھا کر اسے روکنا چاہا لیکن پھر خود پر قابو پا کر رک گئی۔ فہد بڑھتا ہوا دروازہ پار کر گیا تو سلمٰی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جبکہ فہد سلگتے ہوئے دماغ کے ساتھ کار میں آبیٹھا۔

فہد اپنے گھر میں بستر پر لیٹا بہت افسردگی سے

سوچتا چلا جا رہا تھا کہ یہ سلمیٰ کو کیا ہوا؟ اس کا لہجہ اس قدر اجنبی کیوں ہو گیا تھا۔ کسی نے سازش کی ہے یا کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے؟ کیا ہوا اس کو۔ کم از کم مجھے بتانا تو چاہئے تھا کہ آخر ہوا کیا ہے؟ کسی نے کچھ کہا۔ کوئی بات ہوئی؟ معلوم تو ہونا چاہئے۔ اس کے خیالات کا تانا بانا چھاکے کے آ جانے سے ٹوٹ گیا۔ وہ کمرے میں داخل ہوا اور آتے ہی بولا۔

"او فہد! یار دیکھو اپنا فون چلا کر، وہ موبائل فون چالو ہو گیا ہے ہمارے علاقے میں"۔

"اچھا کب؟" فہد نے کہا اور قریب پڑا فون اٹھا کر اسے آن کر دیا۔ سگنل آ رہے تھے۔ اس دوران چھاکا بتاتا چلا گیا۔

"ابھی میں آ رہا تھا تو لوگ باتیں کر رہے تھے۔ ٹاور والے اسے چلا گئے ہیں۔ یار! مجھے بھی چلانا سکھا دے"۔

"ہاں یار! آ گئے ہیں سگنل۔ چل تو جائے بنا پھر میں تجھے بتاتا ہوں، یہ کیسے چلتا ہے"۔ فہد نے کہا تو چھاکا کمرے سے چلا گیا۔ فہد نے ایک لمحے کے لئے سوچا اور پھر مسکراتے ہوئے نمبر پش کرنے لگا۔

اس وقت مائرہ اپنے بیڈ پر لیٹی ہوئی سوچوں میں گم تھی۔ اس کا فون بجا تو اس نے دیکھا پھر چونک کر فون ریسیو کر لیا۔

"ہیلو، فہد! تم کہاں سے بات کر رہے ہو؟"

"اپنے گاؤں قسمت نگر سے مائرہ! میرے گاؤں سے نکل کر ہوا میں سرسرانے والی پہلی آواز تمہارے نام ہے"۔ فہد نے خوشگوار موڈ میں کہا تو مائرہ ہنستے ہوئے بولی۔

"اوہ! فون سروس شروع ہو گئی، وہاں۔ اچھا لگا، مجھے بہت اچھا لگا، تم نے مجھے کال کی"۔

"کچھ ایسی ہی خوشی میں بھی محسوس کر رہا ہوں۔ اعتراف کرتا ہوں۔ میں نے تمہارے یہاں آ کر چلے جانے کو بہت مس کیا"۔ فہد نے کہا تو مائرہ ایک دم سے کھلتے ہوئے بولی۔

"واؤ سچی فہد! ویسے مجھے بھی بڑی تشنگی محسوس ہوئی۔ میں اسے بیان نہیں کر سکتی۔ تمہارے پاس آئی بھی اور تم سے اتنی ڈھیر ساری باتیں بھی نہ کر سکی۔ اینی ہاؤ کیسے ہو تم؟"

"مائرہ! کیا تم کسی ایسے انسان کے احساسات کا تعین کر سکتی ہو جسے صرف اپنی ذات کو منوانا ہو بلکہ اسے اپنوں کے وقار کو بھی تسلیم کرانا ہو۔ شاید تم اسے دماغی خلل قرار دو۔ مگر سچ یہی ہے۔ من کی دنیا کے تقاضے عجیب ہوتے ہیں ہے نا، میں بس ایسا ہی ہوں"۔ فہد نے جذباتی ہوتے ہوئے کہا تو مائرہ بولی۔

"پہلے تو نہیں لیکن اب سمجھ رہی ہوں۔ تم نے خود اپنے آپ کو مشکل میں ڈال رکھا ہے۔ تو اس کی ایک معقول وجہ ہے تمہارے پاس۔ میں سمجھتی ہوں"۔

"تم سمجھ گئی ہو مائرہ! میرے لئے اتنا ہی بہت ہے۔ میں ایسے حالات میں گھرا ہوا ہوں، یہ تو طے ہے کہ میں جنگ ہار کر یہاں سے بھاگنے والا نہیں ہوں۔ بلکہ خود کو فنا کر دینے تک سینہ سپر رہنے کا فیصلہ کر چکا ہوں"۔ فہد کے لہجے میں وہی عزم تھا، جسے وہ پہلے بھی محسوس کر چکی تھی۔ اس لئے سکون سے پوچھا۔

"کیا میں تمہارے لئے کچھ کر سکتی ہوں؟"

"ہاں، بہت کچھ اتنا کہ جتنا کوئی بھی نہ کر سکے۔ بس تم اپنی دعاؤں میں یاد رکھنا۔ یہی میرے لئے بہت ہے"۔ فہد نے خلوص سے کہا تو وہ اس کی بات نظر انداز کر کے بولی۔

"فہد میں نے ایک پلان بنایا ہے۔ وہ میں نے جعفر سے بھی ڈسکس کیا ہے۔ اس بارے میں چند دن بعد میں تمہیں بتاؤں گی"۔ اس نے جذباتی انداز میں

یوں کہا جیسے رو دے گی۔ پھر خود پر قابو پا کر بولی: "اچھا میں اب فون بند کرتی ہوں میں بعد میں کروں گی"۔ اس نے ایک دم سے فون بند کر دیا تھا۔ فہد نے حیرت سے سیل فون کو دیکھا پھر دھیرے سے مسکرا کر فون ایک جانب رکھ دیا۔

☆......☆......☆

بشریٰ بیگم حویلی میں ایک کھڑکی کے پاس کھڑی، دیکھ تو باہر رہی تھی لیکن گہری سوچ میں کھوئی ہوئی تھی۔ اسے رانی کے آنے کا بھی احساس نہیں ہوا۔ جبکہ رانی اسے یوں ساکت دیکھ کر چونک گئی۔ وہ کچھ اور ہی تھی، اس لئے تیزی سے بولی۔

"چوہدرانی جی، چوہدرانی جی چوہدرانی جی"۔

اس کے یوں خوف زدہ لہجے پر بشریٰ بیگم نے چونکتے ہوئے رانی کو دیکھا اور پھر آہستہ سے بولی۔

"آں ہاں.....کیا بات ہے؟"

"چوہدرانی جی! خیر تو ہے ناں؟ میں نے پہلے کبھی آپ کو اتنا پریشان نہیں دیکھا۔ کہیں نکے چوہدری کی وجہ سے تو.....پر یہ کون سا نئی بات ہے۔ وڈھے چوہدری سب سنبھال لیں گے"۔ رانی نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

"نہیں، بات وہ نہیں جو تم سمجھتی ہو۔ میں تو اس کی اس ضد کے بارے میں سوچ رہی ہوں، جو اس نے ماسٹر دین محمد کی بیٹی کے لئے کی ہے۔ وہ نہیں جانتا۔ یہ ضد اس کے لئے خطرناک بھی ثابت ہو سکتی ہے"۔ بشریٰ بیگم نے سوچتے ہوئے لہجے میں کہا تو رانی بولی۔

"میں نے تو سنا ہے چوہدرانی جی۔ نکا چوہدری اس سے بڑی محبت کرتا ہے۔ یہ آج کی بات نہیں، بڑی پرانی بات ہے"۔

"محبت ہی تو نہیں کرتا وہ اس سے۔ اگر محبت کرتا ہوتا نا تو حالات ایسے نہ بنتے۔ وہ اس سے نفرت کرتا ہے۔ اس کی وجہ کچھ بھی ہو"۔ بشریٰ بیگم نے دکھ سے کہا۔

"پھر تو یہ ٹھیک نہیں ہوگا۔ اور ماسٹر دین محمد یا سلمیٰ وہ کہاں مانیں گے"۔ رانی نے گھبراتے ہوئے کہا۔

"وہ نہ بھی مانیں لیکن بات جب ضد کی آ جائے تو یہ چوہدری نفع نقصان نہیں دیکھتے"۔ بشریٰ بیگم نے ایسے لہجے میں کہا جیسے اسے بہت افسوس ہو رہا ہو۔

"ہاں ایہ تو ہے، پر اب کیا ہو سکتا ہے۔ نکا چوہدری تو اپنی ضد کا پکا ہے"۔ رانی نے کہا

"بہت کچھ ہو سکتا ہے رانی، بہت کچھ، جب تک فہد ہے۔ سلمیٰ پر کوئی آنچ نہیں آئے گی، یہ میں جانتی ہوں۔ ہاں اگر فہد نہ رہا تو شاید حالات بدل جائیں۔ اس لئے فہد کی سلامتی بہت ضروری ہے۔ بہت ضروری۔" بشریٰ بیگم نے حتمی لہجے میں کہا تو رانی بولی۔

"آپ کو پتہ ہے چوہدرانی جی، وہ فہد حویلی والوں کے کتنا خلاف ہو رہا ہے اور پھر بھی آپ؟"

"ہاں پھر بھی، اب ہمیں ہی کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔ تو میرا ایک کام کر"۔ بشریٰ بیگم نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا تو رانی بولی۔

"جی چوہدرانی جی! بولیں"۔

"کسی ذریعے سے کسی طرح میری ملاقات فہد سے کروا دے، میں اس سے بات کرنا چاہتی ہوں"۔ بشریٰ بیگم نے کہا تو رانی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور دھیرے سے بولی۔

"چوہدرانی جی! آپ کہتی ہیں تو میں کچھ کرتی ہوں"۔

بشریٰ بیگم نے گہرا سانس لیا اور پھر باہر دیکھنے لگی۔ حیرت زدہ سی رانی اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ وہ نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔

رانی اسی دوپہر سراج کے ڈیرے پر جا پہنچی۔ سراج اور رانی دونوں کھیت کی منڈھیر پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

(جاری ہے)